٦

قائداعظم لائبریری کا شش ماہی ادبی مجلّہ

دورِ جدید

مخزن لاہور

مدیر: ڈاکٹر وحید قریشی

قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم، باغ جناح لاہور

مخزن

شمارہ مسلسل ۶

۲۰۰۳ء

جلد ۳ شمارہ ۲

مجلس ادارت

عنایت اللہ (صدر مجلس)

انتظار حسین

ڈاکٹر سہیل احمد خاں

ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر انور سدید

امجد اسلام امجد

ڈاکٹر وحید قریشی (مدیر اعزازی)

محمد ہارون عثمانی (معاون امور دفتری و ادبی)

جملہ حقوق محفوظ

ناشر: قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور

فون نمبر: ۹۲۰۱۰۰۷۔ فیکس: ۹۲۰۱۰۰۶

ای میل: qal@brain.net.pk

ویب سائٹ: www.qal.fws1.com

کمپوزنگ: محمد اکرام الحق

طابع: گوہر سنز، رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ لاہور

صفحات: ۱۵۲

قیمت: -/۱۰۰ روپے

ضروری نوٹ

(۱) مخزن میں شائع ہونے والی نگارشات کے مندرجات سے قائداعظم لائبریری اور مجلس ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

(۲) تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو دو نسخے روانہ کیے جائیں۔

(۳) ادبی معاملات میں جملہ خط و کتابت مدیر مخزن، معرفت قائداعظم لائبریری، شاہراہ قائداعظم باغ جناح لاہور کی جائے۔

(۴) مالی امور میں چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری سے رجوع کیا جائے۔

ترتیب

اداریہ ۵

شخصیات و سوانح

۱۔ خرد بدوش دیوانہ (ڈاکٹر محمود حسین) — پروفیسر محسن احسان ۷

۲۔ استاد ــــ احسان دانش — محیط اسماعیل ۱۱

۳۔ شمس العلما مولانا سید ممتاز علی — افضل حق قرشی ۱۵

ادبیات

۱۔ انگریزی ناول ۱۹۱۴ء اور اس کے بعد — ادیب سہیل ۲۴

۲۔ غم و آلام کے متعلق غالب کا سفاکانہ رویہ — مشکور حسین یاد ۲۷

۳۔ سر عبدالقادر اور پنجاب آبزرور — محمد حنیف شاہد ۳۰

۴۔ جامعات میں تدریس نظم۔ چند تجاویز — ڈاکٹر روبینہ ترین ۵۴

۵۔ حیدر دہلوی کی غزل گوئی — ڈاکٹر اختر شمار ۵۸

لسانیات

۱۔ فرہنگ تلفظ۔ ایک تنقیدی جائزہ — ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی ۷۱

۲۔ فرہنگ تلفظ۔ مرتب کا موقف — شان الحق حقی ۸۷

مفصل تبصرے

۱۔ یادگار انیس (ڈاکٹر سید تقی عابدی) — مبصر: ڈاکٹر سلیم اختر ۹۰

۲۔ مثنوی گلشن عشق (عنایت اللہ روشن بدایونی) — مبصر: ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی ۹۳

۳۔ پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا (ڈاکٹر انور صابر) — مبصر: محمد سعید ۹۹

مختصر تبصرے

۱۔ اقبال مشرق و مغرب کی نظر میں (مرتبہ خالد تنجرانی) — مبصر: محمد نعیم ۱۰۹

۲۔ اٹھکیلیاں (ذوالفقار علی احسن) — مبصر: محمد ایوب ۱۱۰

۳۔صوفی تبسم۔احوال وآثار — مبصر: صابر آفاقی — ۱۱۲
(ڈاکٹر نثار احمد قریشی)
۴۔اپنا گریباں چاک — مبصر: ڈاکٹر انور محمود خالد — ۱۱۲
(جسٹس (ر) جاوید اقبال)
۵۔آبدوز: غزلیں — مبصر: عرفان احمد خان — ۱۱۵
(افتخار نسیم)
۶۔خاندان لوہارو — مبصر: ڈاکٹر وحید قریشی — ۱۱۶
(نور بانو حجاب)
۷۔'مشعل' لاہور کی دو کتابیں — مبصر: محمد ہارون عثمانی — ۱۱۷
i۔اسلام اور جدیدیت
ii۔قرآن کے بنیادی موضوعات

گاہے گاہے باز خواں

۱۔سودیشی ریل — شوکت تھانوی — ۱۲۰
۲۔طوسی کا طوطا — کرنل محمد خاں — ۱۲۶

کتب خانے

پنجاب پبلک لائبریری۔شرقی وغربی علوم کا مخزن — عباس چغتائی — ۱۳۱

قائداعظم لائبریری

۱۔لائبریری کی علمی وادبی سرگرمیاں — محمد ہارون عثمانی — ۱۴۸
۲۔لائبریری میں آنے والی نئی اردو کتب — ضیاء الدین فاروقی — ۱۵۰

اداریہ

یہ پرچہ ۲۰۰۳ء کا آخری شمارہ ہے۔ پچھلا برس اقبال کے لیے مخصوص رہا۔ اب ضروری محسوس ہوتا ہے کہ سال اقبال کی کچھ سٹاک ٹیکنگ کر لی جائے۔ پاکستان کے حوالے سے علامہ کی اہمیت ایک شاعر کے علاوہ ایک مفکر کی بھی رہی ہے اس لیے یہاں پر زیادہ تر اقبال کی ادبی شناخت کی بجائے اس کی فکری شناخت کو اہمیت دی گئی ہے۔ پچھلے ایک دو برس میں اس حوالے سے اقبال کی روحانی جمہوریت کے تصور کو موضوع تحقیق بنایا گیا ہے۔ اس پر کئی ادبا نے رسائل واخبارات میں وقتاً فوقتاً لکھا۔ مظفر حسین مرحوم نے جو کام کیا وہ ان کی زندگی کے آخری دنوں میں ''روحانی جمہوریت'' کے نام سے کتابی صورت میں آ گیا۔

دوسرا اہم رجحان جو پچھلے دو چار برس سے آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا اور اس سال پورے شباب پر آ گیا وہ اقبال شکنی کی روش ہے جس کا آغاز پاکستان سے ہوا۔ اس روش میں اقبال کے بنیادی تصورات کو رد کیا گیا اور کوشش یہ کی گئی کہ اقبال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے اور دونوں حصوں کو ایک دوسرے کی ضد قرار دے کر فکر اقبال میں تضادات کی تلاش کی جائے۔ نیز ان مغربی مفکرین کو بنیاد بنا کر اقبال پر اعتراض کیے جائیں جنہیں اقبال نے رد کر دیا تھا۔ یہ دونوں طریق کار غیر سائنٹفک تھے۔ حال ہی میں اقبال شناسی کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں بھی اس طرح اقبال کو خانوں میں بانٹ کر اور ان مفکرین کو بنیاد بنا کر اقبال کا تجزیہ کیا گیا ہے جن کی فکری اساس کو اقبال نے کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ اس رجحان کے اولین خالق کے خلاف ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اس سال رسالہ کتاب میں ایک مضمون لکھ کر کڑی گرفت کی ہے۔ اسی حوالے سے مظفر حسین مرحوم کے دو پمفلٹ بھی شائع ہوئے۔ اقبال شناسی کے جائزے میں مخزن کے پچھلے شمارے میں ڈاکٹر وحید عشرت نے لکھا جس میں ڈاکٹر منظور احمد کے بعض فکری رویوں پر کڑی گرفت کی لیکن دو چار بڑے ہاتھ خود اقبال پر بھی مار دیے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس سارے معاملے میں اقبال شکنی کے رویے کا اظہار اقبال اکیڈمی کے محققوں کے حصے میں آیا۔ ان رجحانات کے بارے میں ہمارا بنیادی خیال یہ ہے کہ یہ ساری غلط فہمیاں سیکولرازم کی اس رو کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں جس کا آغاز ۱۹۷۰ء سے پاکستان میں ہوا۔ اب تک خود فرزند اقبال اس خلجان میں مبتلا ہیں کہ اقبال کو سیکولرازم کے حوالے سے رد کر دیا جائے یا اس کے کلام کی کوئی ایسی ممکنہ تعبیر کی جائے جس سے اقبال

کو سیکولر قرار دیا جا سکے۔

یہ صورت حال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ پچھلے پچاس برس میں ہر سیاسی جماعت نے اقبال کے کلام کا وہ حصہ لے لیا جو ان کے حسب حال تھا اس طرح سے کلام اقبال کثرت تعبیر کا شکار ہو گیا۔ فکر اقبال کی یہ سیاسی تقسیم جب ادب میں آئی تو اس سے علمی حلقوں میں بھی فکرِ اقبال کے بارے میں بعض غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اقبال کو خانوں میں بانٹ کر تقسیم کرنے سے وہ وحدت فکر سامنے نہیں آتی جسے اقبال نے پیش کیا تھا۔ ہمارے خیال میں اقبال کی نثری تحریروں اور شاعری کو باہم ملا کر اس فکری وحدت کی تلاش ضروری ہے جہاں سے اقبال فہمی کا آغاز کیا جا سکے۔ یہ کام نہ پاکستان میں ہوا ہے نہ بھارت میں، اسی لیے فکر اقبال کے بعض پہلوؤں پر بات کرتے ہوئے سیکڑوں کتابوں کے ذخیرے میں سے شاید ایک دو کتابیں ہی نکلیں جن میں سنجیدگی سے تفہیم اقبال کی بات کی گئی ہو۔ ابھی اقبال فہمی کا مرحلہ سر نہیں ہوا کہ ہم اقبال کو دولخت کر کے سیاسی حالات کے جبر کے تحت اپنے اپنے لشکر لے کر اقبال پر چڑھ دوڑے ہیں۔ اقبال کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے فکر اقبال کی اصل بنیاد کو بغور دیکھنا ہوگا۔ تفہم کے بعد ہی اختلاف رائے کی منزل آئے گی۔ ورنہ اکثر لکھنے والے اقبال کے نقطہ نظر کو پیش نظر رکھنے کی بجائے اپنے اپنے نقطہ نظر کی تلاش میں لگ گئے ہیں اور اسی حوالے سے اقبال کو رد کرنے لگے ہیں۔ رینے گینوں اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے نکتہ ہائے نظر کی ترجمانی کر کے اقبال کو نئے شوالے تعمیر کرنے کا طعنہ دینے سے تو مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ پروفیسر منظور احمد اس سیکولر فلسفے کے حوالے سے علامہ اقبال کو ناقابل عمل قرار دیتے ہیں، جس سوچ کے دھارے کو اقبال نے تمام عمر غلط قرار دیا تھا۔ اصل میں قصور ناقدین اقبال کا نہیں نہ ہمیں ان کی نیتوں پر شک کرنے کا حق پہنچتا ہے لیکن اتنی بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ پہلے اقبال کو سمجھنا ضروری ہے۔ تفہیم اقبال کے بعد ہی اختلاف یا اعتراض کی نوبت آئے گی۔ اگر فکر اقبال اپنے ماحول کے جبر کے تحت تھی تو ہم آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں ہمارے زمانے کا جبر اور ہمارے گرد و پیش کی آوازیں بھی شامل ہیں۔ ہم جو پیمانہ اقبال کے لیے وضع کر رہے ہیں اس کا اطلاق خود ہماری تحریروں پر بھی تو ہو سکتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تفہیم اقبال ہی کی منزل نہیں آئی چہ جائیکہ ہم فکر اقبال کی صحت یا عدم صحت پر کوئی حکم لگا سکیں۔

مدیر

خرد بدوش دیوانہ (ڈاکٹر محمود حسین)

پروفیسر محسن احسان

مصلحتوں سے بالاتر، کذب و ریا سے بیگانہ، نمائش و آسائش سے لاتعلق، خودستائی اور خود پرستی کے جذبوں سے عاری، حق کو حق اور سچ کو سچ سمجھنے والی صفات کا انسان وقتی طور پر گردِ زمانہ کی لپیٹ میں آ جائے تو آ جائے مگر ایک نہ ایک دن صداقتوں کا پرچم، در تکریم پر لہرا کر ان کی عظمتوں کی گواہی دیتا ہے۔ کہ یہی قرن ہا قرن سے انسانی تجربے کا نچوڑ اور اس کے علم کی شہادت ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین ہمارے تعلیمی افق پر ایک ایسی محترم معتبر اور مکرم ہستی تھے جنہوں نے ساری زندگی درس و تدریس سے وابستگی رکھی۔ حرف و لقا سے رشتہ جوڑا اور کتاب کو اپنی زندگی کا پہلا اور آخری رفیق گردانا۔ مجھے کبھی ان سے ذاتی ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا۔ البتہ ایک مرتبہ انہیں امام بارگاہ ایرانیان میں دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں زیدی بخاری مرحوم میر انیس کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ ان کی وجیہ شخصیت کے ہلکے سے نقوش ابھی تک ذہن میں محفوظ ہیں۔ وہ اپنے سات بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ سات کا لفظ بھی دنیا بھر کے مذاہب اور فلسفہ کا اہم اور متبرک جزو رہا ہے۔ ''سات طبق، سات ولایت، سات سمندر، سات ستارے، ہفتے کے سات دن، تخلیق کی سات صورتیں، سورہ یوسف میں بادشاہ وقت کے خواب میں سات فربہ اور سات لاغر گائیں، اسماعیلیوں کے سات ایام، سات ناطق، ابن العربی کے سات ابدال، سورہ فاتحہ کی سات آیات''، گویا ان ساتوں بھائیوں میں سے پانچ کی ولادت بھی علم، ادب، تعلیم، سیاست، فلسفہ، منطق، تاریخ اور عمرانیات کے لیے نیک فال ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے جو اس خانوادے کے پانچویں فرزند ہیں، ادبیات اور عمرانیات میں بڑا نام کمایا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ممتاز دانشور، تعلیمی مفکر اور سیاسی رہنما تھے، بھارت کے صدر بھی منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر محمود حسین نے تاریخ، عمرانیات اور تعلیمی مسائل کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں عمر گزار دی۔

ڈاکٹر محمود حسین ایک ایسے مشفق اور ہمدرد استاد تھے جو اپنے مزاج، اپنی علمیت، اپنی فرض شناسی اور اپنے اعلیٰ اخلاق و کردار کی وجہ سے اپنے شاگردوں اور رفقائے کار کے دلوں میں بآسانی گھر بنا لیتے تھے۔ ان کے بے شمار معاصرین نے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت، علمیت اور ان کی ذات کے مختلف گوشوں سے پردہ کشائی کی ہے۔ ان کے ایسے ہی لاتعداد شاگردوں نے اپنی عقیدت محبت کا اظہار اپنے دلکش اسلوب میں کیا ہے۔ ان کے ہم عصروں نے انہیں سایہ دار درخت، شرافت کا جوہر، سچا موتی، اسلام اور پاکستان کا عاشق، شریف آدمی، زندہ آدمی اور نفیس و بلیغ مسکراہٹ کا مالک گردانا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں استادانہ شفقت، عالمانہ انکساری و مروت، برادرانہ اخلاص و محبت اور دوستانہ لطف و عنایت مجسم ہو گئے تھے۔ وہ اعلیٰ صفات کے انسان اور ہمدردانہ رویوں کے مالک تھے اور شرافت و محبت ان کے خمیر میں تھی۔ یہ ان کی شرافت کی دلیل ہے کہ زندگی میں کسی کو ان سے شکایت کا موقع نہیں ملا۔ جو بھی ان سے ایک مرتبہ ملا وہ ان کے خلوص اور حسن سلوک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اسے بھی ان کے کردار کی ایک اعلیٰ خوبی اور ان کی صفات کی ایک عمدہ مثال کہنا چاہیے کہ وہ ہر کسی کو اپنے سے برتر سمجھتے

اور ہر ایک کا ذکر نہایت احترام اور ادب سے کرتے ہیں۔ ان کی ہر دلعزیزی میں مجملہ اور باتوں کے ان کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی کی خصوصیت بھی نمایاں تھی۔ میرے نزدیک ڈاکٹر محمود حسین ایک ''خرد بدوش دیوانہ'' تھے جنہوں نے علم و آگہی کے چراغوں کو روشن رکھنے کے لیے اپنے خون کی فراہمی کو ہر حال میں ممکن بنایا۔ وہ کتاب اور کتب خانے میں بے انتہا دلچسپی رکھتے تھے اور ان کی اہمیت، افادیت، مقصد اور ضرورت کو ہمیشہ شدت سے محسوس کرتے تھے۔ وہ سائنس دان نہ تھے لیکن سائنٹیفک سوسائٹی کے سرگرم کارکن مشیر اور سرپرست رہے۔ انہوں نے اپنی دیگر تصنیفات اور تراجم کے علاوہ ایک کتاب **Libraries and Librarians of Pakistan** کے نام سے لکھی اور کتب خانوں کے فروغ اور علم سے وابستہ حضرات کی حالت بہتر بنانے اور معاشرے میں ان کو جائز مقام دلانے کے حق میں دلائل دیے۔ وہ شیخ الجامعہ ہونے کے باوجود ہمیشہ تنقید کو کشادہ دل سے برداشت کرتے تھے۔ اور اختلاف رائے رکھنے والوں سے بھی وسیع القلبی اور کشادہ ظرفی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ کتب خانہ جامعہ تعلیم ملی کے قیام کے سلسلے میں انہیں جو دقتیں پیش آئیں اور جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان سب کو انہوں نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا اور بالآخر اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اسے اب ہم اہل پاکستان کی بدنصیبی گردانیے کہ ہمارے تعلیمی نظام کا تار و پود بکھر چکا ہے۔ ہماری یونیورسٹیاں سیاست کے اکھاڑے بن گئی ہیں۔ ہماری لیبارٹریاں اور لائبریریاں دن کے ایک بجے کے بعد شہر خموشاں کا منظر پیش کرتی ہیں۔ استاد شاگرد سے اور شاگرد استاد سے کنی کتراتے ہیں۔ اس رشتے میں جو باہمی محبت اور احترام تھا وہ مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ نظیری کا یہ کہنا کہ:

درس ادب اگر بود زمزمہ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

اپنا مفہوم کھو چکا ہے۔ ہمیں اس نازک صورت حال پر غور کرنا ہے اور سنجیدگی سے اس مسئلے پر توجہ دینا ہے۔ خدا کرے ہمارے صاحبان اقتدار، اقتدار کی چھینا جھپٹی سے کچھ فرصت حاصل کر کے قومی مسائل پر بھرپور توجہ دیں اور خاص طور پر تعلیمی مسائل کو ترجیحی بنیادوں پر حل کرنے کی سعی کریں کہ اس نظام کی دیواروں میں دراڑیں تو پڑ چکی ہیں کہیں یہ دھڑام سے زمین پر ہی نہ آ گرے۔

ڈاکٹر محمود حسین ایک دانشور، ایک ماہر تعلیم، ایک تاریخ دان اور ایک ہمدرد انسان کے ایسے عالی قدر رہے ہیں ہر کوئی ان کے اوصاف حمیدہ ان کے مشرب اور ان کی فراخ دلی کا مدح خواں رہا ہے۔ مجھے ان کی شخصیت اور ان کی ذات میں کوئی برائی کا پہلو نظر نہیں آیا۔ مجھے تو صرف ان میں ایک ہی برائی نظر آ رہی ہے کہ وہ کسی سے کوئی برائی نہ کر سکے اور نہ ہی کسی کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ حتیٰ کہ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کی بھی خیر خواہی کے لیے کوشاں رہے۔ ممکن ہے یہ ان کی بزدلی ہو یا پھر اس گھرانے کی تربیت جہاں پہلا قرینہ ہی دل کی صفائی ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے قومی مسائل، ملکی مفادات اور ملی مشکلات پر جو تحریریں چھوڑی ہیں وہ ان کی قوم سے محبت، اپنی سرزمین سے دلی لگاؤ اور اسلامی اقدار کی سربلندی اور سرفرازی کی بھرپور نشان دہی کرتی ہیں۔ آپ کی خدمت میں چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جن سے ڈاکٹر صاحب کے ذہنی رویوں کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ قومی زبان اردو کے مسئلے پر ان کا انداز فکر ملاحظہ فرمایئے:

''پہلا اور بہت اہم اعتراض یہ ہے کہ اردو کو اگر قومی زبان بنایا گیا تو مقامی زبانوں کی حق تلفی ہو گی اور رفتہ رفتہ اردو ان کی جگہ لے بیٹھے گی۔ اردو کو سرکاری یا قومی زبان کا مرتبہ دینا مقامی زبانوں پر پھانسی پر لٹکانے کے مترادف ہے۔

یہ اعتراض یا تو محض لاعلمی یا غلط فہمی کی وجہ سے ہے یا یہ کہ پاکستان میں اب بھی ایسے عناصر موجود ہیں جو پاکستان کی وحدت کو دھکا لگانا چاہتے ہیں اور وہ ہماری یک جہتی کو کبھی صوبہ واریت کے دیوتا پر بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں تو کبھی زبان کا شوشہ چھوڑ کر قوم میں بے چینی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ اردو کے سرکاری زبان ہونے سے صوبائی زبانوں کی حیثیت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ صوبائی زبانیں اسی طرح قائم رہیں گی۔ وہ پاکستانی زبانیں ہیں اور ہم کو اسی طرح عزیز ہیں جس طرح ہر پاکستانی چیز۔ ان کا تحفظ ان کی بقا ان کی ترقی ہمارا فرض ہے ہم نے پہلے بھی ان بوٹوں کی آبیاری کی ہے اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے''۔

تعلیمی مسائل کے بارے میں ڈاکٹر محمود حسین یوں رقم طراز ہیں:

''بعض دوسرے لوگوں کے ذہن میں شاید یہ سوال اٹھتا ہو کہ اسلامی تہذیب کی اقدار عالیہ موجودہ دور کے تقاضوں سے کیسے ہم آہنگ ہو سکیں گی۔ تعلیم کو ان قدروں کا ترجمان بنانے کے بعد جو تعلیمی ماحول پیدا ہو گا۔ وہ ٹیلی ویژن، ہوائی جہاز، جوہری توانائی اور اقوام متحدہ کی اس بیسویں صدی کے ماحول سے کیسے مطابقت حاصل کر سکے گا؟ لیکن میرا جواب صرف یہ ہو گا کہ انسانی مسائل سے ہم بیسویں صدی میں نبرد آزما ہیں ان کی تاریخ اس صدی سے کہیں پرانی ہے۔ ان مسائل کی شدت کو بیسویں صدی نے تیز ضرور کر دیا ہے لیکن ان مسائل کو اس صدی نے پیدا نہیں کیا۔ تعلیم کی نظریاتی بنیادوں میں بیسویں صدی کی تیز رفتاری نے کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں کیا ہے اور بنیادی طور پر فلسفہ تعلیم کے مسائل اب بھی وہی ہیں جو اس صدی سے پہلے تھے''۔

نئی نسل سے محبت اور اس کے روشن مستقبل سے توقعات رکھتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں:

''قدیم مر چکا ہے مستقبل ان کا ہے جو جدید دنیا کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے ہیں''۔

ایک اور مقام پر ڈاکٹر محمود حسین نوجوانوں کو مشرقی روایات اور اسلاف کے کارناموں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''ہمارے نوجوانوں کی آنکھیں مغرب کی چکاچوند سے خیرہ ہو گئی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ہمارے اسلاف نے ہمارے لیے کیسے کیسے نادر ذخیرے ورثے میں چھوڑے ہیں۔ ان سے استفادہ کرنا ہمارا فرض ہے۔ اسلام دنیا میں بسنا اور اس سے متمتع ہونا سکھاتا ہے۔ وہ سنیاسی اور راہب بن کر دنیا کو تیاگنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ اسلام جہد و عمل کا مذہب ہے۔ دنیائی لذتوں اور آسائشوں سے جائز تمتع اسلام کا مسلک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رنگ و بو کی اس حسین دنیا کو مسلمانوں نے نہ صرف حسین تر بنایا بلکہ اس کو دنیاوی جنت میں تبدیل کر دیا۔ مسلمانوں کی کشادہ دل رواداری، حسن مذاق، اعلیٰ ثقافت ان کے فنون لطیفہ میں بھی موجود ہے اور اس کو دوسروں سے ممیز و ممتاز بناتی ہے''۔

یہ چند اقتباسات ڈاکٹر محمود حسین کے نظریات، ان کی وطن سے محبت، اردو زبان کی قومی اور ملی حیثیت، نوجوانوں سے دلی لگاؤ، اسلام سے سچی عقیدت، تعلیم کے مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر اور مذہب کو عملی جد و جہد کا نمونہ بنانے کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔

بحیثیت طالب علم، بحیثیت استاد، بحیثیت دوست، بحیثیت رفیق کار، بحیثیت محسن، بحیثیت وائس چانسلر، بحیثیت مرکزی وزیر غرض ہر حیثیت میں وہ بے مثال نظر آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بحیثیت انسان نہایت بلند تھے اور غالب نے جس بات کو ''بسکہ دشوار'' قرار دیا تھا انہوں نے اپنی زندگی اور اپنی سیرت و کردار سے عملاً بتایا کہ اتنی دشوار نہیں:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مجھے کامل یقین ہے کہ ڈاکٹر محمود حسین نے اپنی اڑسٹھ سالہ زندگی پر کبھی غور کیا ہوگا تو یقیناً انہیں اطمینان قلب میسر آیا ہوگا اور وہ فارسی کے اس شعر میں اپنی تصویر خود دیکھتے ہوں گے۔

ما نقد عمر صرف رہ یار کردہ ایم
کارے کہ کردہ ایم ہمیں کار کردہ ایم

اقتباس

واشنگٹن ارون نے کہا تھا چاندنی رات میں الحمرا کا حسن مسحور کر لیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے سحر میں اسیر ہوئے بغیر قصر کی تعریف کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ الحمرا میں داخل ہوتے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے انسان پریوں کی دنیا میں آ گیا ہو۔ سورج کی شعاعیں اس مرقع کو رنگوں میں رنگ دیتی ہیں۔ پچی کاری سے آراستہ ہال کمرے، منقش چھتیں، سنگ مرمر کے ستون جن پر طغراوی گلکاری ہو رہی ہے، قوسین نازک ستونوں سے ابھرتی ہیں، اتنے نازک کہ تعجب ہوتا ہے کہ وہ اتنا بوجھ کیسے اٹھائے ہوئے ہیں، چھتوں اور دیواروں پر نایاب چوبی ٹکڑیاں یوں جڑی ہیں کہ دیکھنے والا پیچ و خم میں کھو جاتا ہے۔ رنگوں کی بوقلمونی اور ٹکڑیوں کے ردوبدل سے بیک وقت توازن اور تنوع کا تاثر ملتا ہے۔ آرائشی مرقعوں کے اردگرد اور وسط میں آیات و ابیات فنِ خطاطی کا شاہکار ہیں۔ یہ پھول پتیوں کے ساتھ یوں مدغم ہوتے ہیں کہ ذہن متوجہ نہ ہو تو محض نقش و نگار دکھائی دیتے ہیں، کثرت زیبائش کے باوجود نفاست کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا لا غالب'' الا اللہ لا غالب'' الا اللہ کی تکرار ہر جگہ ملتی ہے۔ کوفی حروف میں یہ عبارت یوں لکھی ہے کہ بائیں سے دائیں اور دائیں سے بائیں پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسے ملک میں جہاں لوگ سورج کی تمازت سے جھلس جاتے ہیں زیریں حصے کے لیے ہلکے ثانوی رنگ مخصوص تھے جن سے آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ استرکاری کے لیے مور نیلگوں، سنہرا اور شنگرفی رنگ استعمال کرتے تھے تاکہ بالائی حصے کی آب و تاب نمایاں ہو۔ محراب دار چھتیں زیبائش کی بہترین مثال ہیں۔ شش پہلو آرائش میں ہزاروں خانوں کو جلا دی گئی ہے۔ مکھیال کی طرح ایک خانہ دوسرے سے الگ تھلگ لیکن وحدت کا تاثر دینے کے لیے سب ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں۔

(**در دل کشا** از منظور الٰہی)

استاد — احسان دانش

محیط اسمٰعیل

۱۹۸۰ء میں (شاید ستمبر تھا) کراچی سے لاہور سیدھا احسان دانش صاحب کے ادب کدہ انارکلی پہنچا اور گویا ہوا:

''میرے گھر والے ادب مخالف یعنی شاعری سے ''الرجی'' ہیں بہت منع کیا، میں باز نہ آیا۔ مشاعرے سے لوٹنے اور در نہ کھلنے پر کسی قریبی باغیچے میں باقی رات بھی شعر کہتے گزارتا۔ ایک روز میری بیاض نذر آتش کر دی ... یہ تو انتہا تھی، باغی ہو کر گھر چھوڑ آیا ہوں، کراچی کی ایک شعری نشست میں معلوم ہوا تھا کہ لاہور مشاعروں کا گڑھ ہے۔ یہاں میرا کوئی واقف اور ٹھکانا نہیں'' استاد قیافہ شناس تھے، میری بات سن کر سر ہلایا اور بولے ''کوئی بات نہیں، میرے ہاں رہ لو!'' اس پناہ کے ساتھ ہی اس شخصیت بے پناہ نے مجھ پر شفقت کا آغاز کر دیا۔

احسان دانش میرے لیے اسم با مسمّٰی ثابت ہوئے۔ پہلے روز میں نے انھیں ''احسان صاحب'' کہا۔ پھر دیکھا دیکھی ''استاد'' کہنا شروع کر دیا۔ دو روز تک میں نے اپنا کلام نہ سنایا تو انھیں تجسس یا تشویش سی ہوگئی اور فرمایا: ''اپنے شعر سناؤ!'' میں نے تازہ مطلع اور ایک شعر ہی سنایا ہوگا کہ استاد ترنگ میں آئے اور مجھے اپنی جانب سے شعر لکھواتے چلے گئے۔ پانچ چھ شعر کے بعد فرمایا: ''یہ اب تمھارے ہیں''۔ احترام اور رعب کی امتزاجی کیفیت تھی کہ میں استاد سے بہت کم بولتا۔ استاد کی شفقت تو سمجھ میں آتی تھی لیکن شعر کے معاملے میں یہ فراخ دلی فہم سے بالا تھی۔ اپنے تازہ شعر کی جگہ استاد کے ''نئے شعر'' پا کر میں سرتاپا ''کنفیوز'' ہو گیا اور ایک عجیب سی ندامت محسوس کرنے لگا۔ استاد نے آپ حکم دیا تھا کہ شعر سناؤں، ورنہ میں کسی بزم سخن سے ہٹ کر کلام سنانے والوں میں نہیں ہوں۔ استاد اپنی ذات میں تمام بزم سخن ہیں، اس کا شعور مجھے تھا۔ یہ میری جہالت ازلی ہے کہ میں اپنے کلام پر اصلاح کی ضرورت بہت کم محسوس کرتا ہوں۔ یہاں میرا خیال تھا پوری غزل میں ایک آدھ لفظ ردوبدل کریں گے اور بس۔ اس کے برعکس استادِ محترم نے میری غزل میں میرا ایک آدھ لفظ بھی نہیں رہنے دیا تھا۔ شش یا پنج مفت شعر پانے کے بعد میں شش و پنج میں پڑا رہا۔ عرصہ بعد حسرت صاحب سے معلوم ہوا کہ استاد کسی سے شعر سنانے کی فرمائش نہیں کرتے بلکہ اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی، لوگ خود ہی منہ کھولتے اور دامن بھر لے جاتے ہیں، گویا یہ میرے لیے اعزاز تھا۔ اس اعزاز نے میرے الفاظ کے ساتھ میرے ہاتھوں کے توتے بھی اڑا دیے۔

دن بھر شاعر و متشاعر حضرات کا سلسلۂ آمد و رفت بندھا رہتا تھا۔ تیسرے روز صاحب ذوق حضرات سے میرا سرسری تعارف کرانے کے بعد مجھ سے کہا کہ ''کل والی غزل سناؤ میاں!'' حوصلہ افزائی کی رو سے استاد نے ایک مصرع بھی سنا دیا تاکہ زمین (قافیہ ردیف) یاد آ جائے۔ (استاد کے ملنے والوں کو معلوم ہے کہ ان کا حافظہ بلا کا تھا) بہر کیف میں نے غزل سنائی اور اپنی سنائی۔ استاد نے ٹوکا نہ روکا۔ ایک بات تھی کہ استاد نے اس نشست کے بعد بھی نہ پوچھا کہ یہ میں نے کیا حرکت کی! تازہ کی جگہ نئی غزل کہاں گئی!! طرفہ یہ کہ اس عمل کا بڑے طمطراق سے اعادہ ہوا۔ دوسرے روز مجھ سے پوچھا: ''آج شعر کہے!'' (استاد کو معلوم تھا

کہ روزانہ دو تین غزلیں میرے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔) جواب میں تازہ غزل سنانا شروع کی تو استاد نے وہی سلوک کیا۔ مطلع سنتے ہی کہا کہ ''لکھو!'' استاد واقعی استاد تھے بلکہ اشعار کی مشین یا کارخانہ کہہ لیجیے! کسی کارخانے میں مصنوعات اتنی تیزی سے نہیں بنتی ہوں گی جس سبک رفتاری سے شعر پر شعر کہتے اور لکھواتے چلے جاتے تھے۔ کسی سے مطلع سننے کا تکلف بھی محض اس لیے کرتے کہ زمین دیکھیں اور بس۔ استاد شاعری کی نفسیات سے ہی نہیں شاعروں کی نفسیات سے بھی آگاہ تھے اور ہر شاعر کی پسند اور مزاج کے مطابق شعروں کی مالائیں اس کے گلے میں ڈالتے چلے جاتے۔ یہ الگ بات کہ وہ مالائیں ان کے گلے کا پھندا ثابت ہوئیں۔ مشاعرہ بازوں بالخصوص مترنم شعرا کو انھیں کی زمین میں ایک نئی فصل مل جاتی تو ان کی مراد لہلہا اٹھتی۔ فصل مواد سے تیار ہوئی ہے یا کھاد سے، ضرورت مندوں کا یہ مسئلہ نہیں تھا۔ استاد اپنے لیے شعر کہہ رہے ہوتے تو اپنے آپ خون شامل ہو رہا ہوتا۔ جب شعر دوسروں کے لیے ہو رہے ہوتے تو روح افزا کی بوتلیں خالی کیے جاتے۔ استاد سے کلام لینے والے باغ باغ ہو جاتے۔ ان بے چاروں کے لیے استاد کا ادب کدہ تھا بھی ایک سبز باغ۔

استاد نے میرے کلام پر اصلاح دینا موقوف کر دیا اور سمجھ لیا کہ یہ نادان ''خود ساختہ'' روگ میں مبتلا ہے۔ کوئی شخص طویل مدت ملتے رہنے کے سبب استاد کی شخصیت کو مکمل سمجھ لینے کا دعویٰ کرے، وہ باطل ہے۔ ایک شام ہمت کر کے میں نے پوچھ ہی لیا ''استاد! یہ آپ کیا کرتے ہیں کہ اصلاح دینے کی بجائے پوری غزل نئی کہہ کر تھما دیتے ہیں!!'' جواب میں استاد نے وہ بات بتائی کہ میں دنگ رہ گیا۔ بولے ''بھین چو..... کو میں مارتا ہوں'' مطلب یہ کہ احسان صاحب کا پاکستانی معاشرے پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ سیکڑوں شاعروں کا کام تمام کر دیا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اس اعتبار سے استاد نے پاکستان کے لیے ایک پاک معاشرہ تشکیل دینے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا ہے۔

استاد کے کچھ ایسے شاگرد بھی تھے جو انھیں شہر و مضافات کی ادبی خبریں پہنچاتے۔ ادھر ادھر سے جائز و ناجائز فائدے بھی استاد کے نام سے اٹھا لیتے۔ ان میں آغا برنی بھی تھے۔ برنی ایک دن راستے میں کہنے لگے کہ مصرع پر فی البدیہہ شعر کہے جائیں! (ممکن ہے پہلے سے ان کی غزل کا مصرع ہو) بہرکیف کچھ شعر ایک جگہ پہنچنے تک سنا دیے۔ دوسرے روز استاد کے سامنے خبر دینے کے انداز میں میری طرف اشارہ کر کے بولے: ''استاد! جراثیم ہیں ان میں''۔ استاد نے (جو پہلے سے جانتے تھے) اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ''ایسے ویسے؟ خطرناک!!''۔

استاد کے سیکڑوں شاگرد تھے مگر وہ کسی کو بھی اپنا شاگرد نہ کہتے بلکہ بدظن تھے۔ میرا خیال ہے شاعروں کو **"Kill"** کرنے کا یہ رویہ شروع سے ان کے ہاں موجود نہیں تھا۔ بہت بعد میں یہ ردعمل مرتب ہوا۔ ابتدائی تلامذہ میں ایک شورش کاشمیری نے کبھی اپنے استاد کو دھوکا یا دکھ نہیں دیا۔ کلیم عثمانی ایسے باغی شاگردوں نے استاد کو صدمہ پہنچایا۔ ایک انٹرویو میں کلیم عثمانی صاحب نے استاد کا احسان ماننے ہی سے انکار کر دیا۔

کلیم عثمانی فلمی دنیا میں گئے تو گویا بڑوں کے ادب آداب سے بھی گئے۔ بہرحال طویل مدت بعد موصوف، استاد سے ملنے آئے۔ میرا ان سے پہلے تعارف نہیں تھا۔ استاد کو عثمانی صاحب پر طنز کرنے کا موقع ہاتھ آیا (عثمانی صاحب کو اپنے فی البدیہہ ہونے پر بڑا ناز رہا ہے) استاد نے مجھے ان سے ملواتے ہوئے کہا: ''یہ بہت بڑے شاعر ہیں اور فلمی گیت نگار بھی'' اور ان سے کہا ''یہ محیط اسمٰعیل ہیں، فی البدیہہ کہتے ہیں، یقین نہ آئے تو میں مصرع دیتا ہوں آپ دونوں ابھی شعر کہیں'' عثمانی صاحب کے لیے ایک غیر متوقع دعوت تھی، نہ وہ اس مقصد سے آئے تھے، نہ ایک نوجوان سے مقابلہ چاہتے تھے، استاد کے طنز کو تو اچھی طرح سمجھ گئے (یا دل میں کہا ہوگا:

''سمجھ لوں گا!'') معذرت کرتے ہوئے اٹھے کہ مجھے جلد کہیں پہنچنا ہے (یہ بھی نہ کہا کہ یہ نشست پھر سہی دن رکھیے گا) رخصت ہو گئے۔

استاد کے ایک بڑے سعادت مند شاگرد تھے ڈاکٹر مناظر حسین نظر۔ محکمہ اوقاف کے افسر بالا۔ کالی ٹوپی، اجلی معصومیت، دراز قد، صحت مند بلکہ جسامت ایسی کہ آنکھوں پر پیٹ بھرے دکھائی دیتے۔ جب کسی کو دیکھ رہے ہوتے صاف معلوم ہوتا کہ ان کی ایک آنکھ مخاطب کی آنکھ میں جھانک رہی ہے تو دوسری آنکھ مخاطب کے ایک کان پر ہے کہ وہ سن بھی رہا ہے کہ نہیں۔ باریش تھے۔ جب غزل کہتے قوافی کی بارش ہی تو کر دیتے۔ ان کے کلام پر اصلاح استاد ہی کا حوصلہ تھا۔ ایک غزل کئی صد اشعار یا بیسیوں سہ غزلات پر مشتمل ہوتی۔ استاد نے (ان کے پیچھے) ہمیں بتایا تھا ''ستر ستر مطلع کہتا ہے'' نظر صاحب محکمہ اوقاف کی بجائے محکمہ مردم شماری میں ہوتے تو ان کے کل کلام کے اشعار کی تعداد آج ہمارے سامنے ہوتی۔ ہر مرتبہ غزل کے ہمراہ پانچ چھ بڑے ڈبے مٹھائی کے لے آتے۔ جتنے دنوں میں مٹھائی ختم ہوتی وہ ایک اور صد غزلہ سے لدے ہوئے تشریف لاتے۔ دوسرے لوگ بھی دن بھر کچھ نہ کچھ حسب توفیق، حسب حیثیت یا حسب ''غزلہ جات'' استاد کی خدمت میں لے آتے۔ انھیں تکلفات کے باعث استاد دوپہر کی روٹی نہ کھاتے۔

استاد کو اردو زبان پر قابل رشک عبور تھا جس کا جیتا جاگتا ثبوت ''جہان دانش'' ہے۔ (اس کے مقابلے میں آپ بیتی کا دوسرا حصہ جہان دیگر ایک جعلی کتاب معلوم ہوتی ہے)۔

حاضرین جب رخصت ہو جاتے اور صرف میں رہ جاتا تو استاد اکثر شاعرادیبوں کی زبان پر تبصرہ و نقد بڑے دکھ کے ساتھ بیان کرتے۔ مثلاً یہاں ـــــ یہیں، وہاں ـــــ وہیں، کہاں ـــــ کہیں، اور جگہ کے ساتھ ''پر'' کا استعمال انھیں بہت کھٹکتا۔ کہتے کہ ''یہاں پر بیٹھو'' غلط زبان ہے۔ ''یہاں بیٹھو'' کہا جانا چاہیے۔ اسی طرح: ''اس جگہ پر کون ہے'' کی بجائے ''اس جگہ کون ہے'' کہہ دینا کافی ہوگا۔

زبان کے موضوع پر مجھے اس لیے بھی بتاتے رہتے کہ میں نے شروع دن ہی درخواست کر دی تھی کہ استاد میرے بزرگ بنگلور کے ہیں اور گھر میں دکنی لب و لہجہ مروج ہے۔ بیشتر الفاظ کا تلفظ دلی/لکھنؤ سے مختلف پاتا ہوں۔ کچھ الفاظ میرے ہاں صحت چاہتے ہیں، ازراہ کرم آپ ٹوک دیا کریں تو میری اصلاح ہو جایا کرے گی۔

تقاضائے ادب بھی تھا کہ میں زیادہ تر استاد کے روبرو خاموش ہی بیٹھا رہتا۔ ان کے ذخیرہ کتب سے کبھی کوئی تصنیف اٹھا کر دیکھنے لگتا تو ٹوکتے اور فرماتے: ''میاں! کتاب میں کیا ہے؟ مجھ سے پوچھو جو معلومات چاہتے ہو!''۔ میری بدنصیبی کہ استاد کی معیت میں رہ کر جس قدر علمی ادبی معلومات کے موتی حاصل کر سکتا تھا، نہیں کر سکا۔

فن عروض بھی ہمارے درمیان گفتگو کا ایک مشترکہ دلچسپ موضوع تھا۔ استاد مجھے نام لے لے کر بتاتے کہ فلاں فلاں کے ہاں بے وزن شاعری ہوتی ہے۔ فلاں میں حس عروض ہے فن سے دلچسپی نہیں۔ فلاں عروضی محض یعنی نرا عروضی ہے شعر کے حسن سے علاقہ نہیں رکھتا۔ فلاں صرف ترنم کی کسوٹی پر اپنے شعر کے وزن کو پرکھتا ہے اور فلاں بڑے بڑے شاعر اپنے اشعار کی تقطیع نہیں کر سکتے وغیرہ وغیرہ۔

جب سے استاد کے پاس رہنے لگا تھا کوئی نہ کوئی صاحب سہرا لکھوانے آ جاتے تو استاد انھیں میرے سر منڈھ دیتے اور پیسے بھی دلواتے۔ مگر مجھے یہ کام اچھا نہ معلوم ہوتا اور میں اکثر و بیشتر طبیعت ناساز ہونے کا حیلہ تراش لیتا۔

آمد کے حوالے سے شاعر دو قسم کے واقع ہوئے ہیں۔ بعض کے ہاں پوچھے شعر اترتے ہیں، دوسری قسم میں رات کے

شعر کہے جاتے ہیں۔ استاد قسم اول میں تھے اور میں غزل مکمل کر کے سویا کرتا تھا خواہ کوئی پہر ہو رات کا۔ ایک سے زیادہ مرتبہ استاد کے ہاں آمد کے وقت میری شامت آئی، ایک دفعہ کی سنیں:

فجر کی اذان میں بہت دیر تھی کہ استاد نے گہرے کنویں سے آواز دی ''مجیبی بی طا!''۔ ''جی استاد!'' کہہ کر آنکھیں ملنے کا عمل موقوف کیا اور انھیں تکنے لگا۔ استاد تو گہری نیند سے بھی زیادہ غرق اپنے تخت پوش پر بیٹھے کھڑکی سے باہر ایک ہی سمت مسلسل گھورے جا رہے تھے اور چڑیاں دھیما دھیما شور مچا رہی تھیں، گویا استاد کے ٹکٹکی باندھنے پر احتجاج کر رہی ہوں۔ اس وقت میرا یہی خیال تھا کہ استاد کو شدید پیاس لگی ہوگی اور مجھ سے پانی طلب کریں گے۔ دوسری مرتبہ پوچھا ''جی استاد!'' جواب ندارد۔ تیسری دفعہ پہلے سے توانا آواز میں دریافت کیا: جی استاد!! اس عالم میں کوئی دس لمحے بیتے ہوں گے کہ چوتھی آواز پر استاد نے جواب میں ''ہوں ں ں'' کیا۔ میں نے پورے وثوق سے کہا: ''استاد آپ نے مجھے آواز دی تھی، حکم کریں!'' مجھے دیکھے بغیر سن کر بولے ''ہوں ں! ہاں!! شعر کہو!'' میں سمجھ نہیں پایا کہ گہری نیند سے محض شعر کہنے کے لیے مجھے آواز دی ہوگی! اتنا ضرور اندازہ ہو گیا کہ اس سے سماں بندھا ہوا ہے استاد کے ہاں شعر کہنے کا۔ مجھے مصرع دیا کہ اس پر شعر کہو۔ میں اتنی دیر میں نیند کی کیفیت سے باہر آ چکا تھا۔ مصرع (یاد نہیں) لے کر دو تین شعر کہے اور سنا دیے۔ استاد نے سر بھی ہلایا تو میری طرف نگاہ نہ کی۔ مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ استاد اب پہلے سے بھی دور کسی انجان منزل کی جانب روانہ ہو گئے ہیں۔ میں نے اپنی طرف سے سمجھ لیا کہ میرا فرض پورا ہو گیا ہے۔۔ اور نیند پوری کرنے کے لیے صوفے پر چپکے سے لیٹ گیا۔

استاد بلاشبہ بہت بڑے شاعر تھے لیکن اپنی اولاد کو شاعر دیکھنا پسند نہ کیا۔ فیضان دانش میں شاعری کے جراثیم تھے۔ استاد کی تنبیہ جراثیم کُش ثابت ہوئی۔ گویا فیضان کے اندر والے شاعر کو تنبیہ سے ختم کیا اور دوسرے شاعروں کو اپنی فی البدیہ سے۔ اب فیضان شاعری کی پگڈنڈی چھوڑ کر مذہب کے شارع پر چل پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے باریش اور پنجگانہ ہو گئے۔ نماز کے لیے جب بھی استاد کے سامنے سے گزرتے، سلام کے بعد قطعی کلام نہ کرتے گویا قطع کلام کر رکھا ہو۔

فیضان کے بارے میں استاد کا سہ لفظی تعارف آج بھی لطف دیتا ہے۔ جب فیضان نماز کے لیے زینے اتر گئے تھے تو استاد نے ایک مختصر طویل سانس لی اور آنکھیں پھیلا کر رازدارانہ انداز میں مجھے بتایا: ''بڑا ہولناک مسلمان ہے''۔

عمر کے بالکل آخری حصے میں استاد شمعی کو بہت یاد کرنے لگے جو ان کی حیات (جہان دانش) کا اہم کردار ہے۔ اکثر راتوں کو جب ان کے پاس میرے سوا کوئی نہ ہوتا، شمعی کی وہ باتیں بتاتے جو شاید ان کے قلم سے رہ گئی تھیں۔ ان یادوں میں ٹھنڈی آہیں اور کسی خواہش کی تپش کا امتزاج ہوتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حسرت کی لو سر اٹھانے لگتی۔ اس وقت استاد مجھے ایک معصوم بالک دکھائی دیتے۔

انھیں اکثر موت کا تصور کرتے ہوئے بھی ایک عجب کیفیت میں دیکھا ہے۔ دیر تک اس موضوع پر سوچتے۔۔۔ اور سہمے ہوئے مجھ سے استفسار کرتے کہ مجیبا مرنے کے بعد کیا ہوگا!! (میں کیا بتاتا کہ میرا کوئی تجربہ نہیں تھا) خاموش انھیں دیکھتا رہتا۔ اللہ کی طرف سے پرسش کا کوئی خوف انھیں بے کل کیے رکھتا، اور ہر آنے والے کل کے رخ سے نظریں چرا رہے ہوتے۔ اس کیفیت میں دیر تک وہ ایک دلکش نمی میں بھیگے رہتے۔

میں سمجھتا ہوں موت کو اس انداز میں اور اتنے قریب سے یاد اور محسوس کرنا، ایک سچے مسلمان ہونے کی دلیل ہے۔ استاد بہت عظیم آدمی تھے، اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

شمس العلما مولانا سید ممتاز علی

افضل حق قرشی

آپ حضرت امام رضا کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کے اجداد بخارا کے رہنے والے تھے، یہ خاندان عہد عالمگیری میں ہندوستان آیا اور جگادھری (ضلع انبالہ) کے قریب آباد ہو گیا۔ دو تین نسلیں وہیں مقیم رہیں۔ آخر ایک بزرگ میر ہاشم علی دیوبند میں جا کر آباد ہو گئے، ان کے بھانجے میر ستار علی نواب بہادر گڑھ کے مدار المہام مقرر ہوئے۔ انہی میر ستار علی کے صاحبزادے سید ذوالفقار علی تھے جو سید ممتاز علی کے والد تھے۔ سید ذوالفقار علی ادب فارسی میں امام بخش صہبائی کے شاگرد تھے۔ عربی سینٹ سٹیفنز کالج دلی سے پڑھی۔ شملہ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس، گجرات میں سررشتہ دار اور راولپنڈی میں تحصیلدار رہنے کے بعد ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے اور پنجاب کے متعدد اضلاع میں مقیم رہے۔

سید ممتاز علی ۲۷ ستمبر ۱۸۶۰ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ اتفاق سے یہ دن میلاد النبی ﷺ کا تھا۔ عمر بھر تحریک میلاد کی اشاعت کرتے رہے اور عید میلاد ہی کے اگلے دن انتقال ہوا۔ آپ کی باقاعدہ تعلیم کا آغاز پانچ برس کی عمر میں ہوا۔ دیوبند میں سید عبداللہ شاہ عرف منے شاہ کے مکتب میں پارہ عم، خالق باری اور کریما کا درس مکمل کیا۔ بعد ازاں والد نے راولپنڈی بلا لیا۔ یہاں آپ نے عربی صرف و نحو، فقہ و منطق اور فارسی ادب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۳ء میں آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد دیوبند جا کر دار العلوم میں داخل ہو گئے۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا سید احمد دہلوی، ملا محمود دیوبندی اور مولانا محمد صدیق انبٹھوی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس وقت مولانا محمد قاسم نانوتوی بقید حیات تھے۔ آپ نے ان کی صحبت سے بھی بہت کچھ استفادہ کیا۔ اسی زمانہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن بھی دار العلوم میں زیر تعلیم تھے۔ سید ممتاز علی ان کے ہم سبق و ہم جماعت رہے اور دونوں بزرگوں میں آخر دم تک محبت و مودت کا رشتہ نہایت استوار رہا۔ اسی اثنا میں آپ کے والد فیروز پور میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہو گئے اور انہوں نے آپ کو فیروز پور بلا لیا۔ ۱۸۷۴ء میں اتالیق کی مدد سے آپ نے انگریزی پڑھنا شروع کی۔ دو سال کی قلیل مدت میں آپ نے مڈل سکول کا امتحان پاس کر لیا۔ ۱۸۷۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول لاہور میں داخلہ لیا اور وہیں سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ یہیں شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد سے ملاقات ہوئی۔ آپ کے والد اور آزاد کے والد مولوی محمد باقر کا گہرا دوستانہ تھا۔ اب دونوں کے صاحبزادوں میں پرخلوص تعلقات قائم ہو گئے جو آزاد کے انتقال تک قائم رہے۔ ۱۸۸۴ء میں بی اے کا امتحان دیا لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۸۸۷ء میں بی اے کا ارادہ ترک کر کے انڈین سول سروس کا امتحان دیا مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اسی سال چیف کورٹ لاہور میں بحیثیت مترجم ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸۸۸ء میں آپ کی شادی بھی ہو گئی لیکن ۱۸۹۱ء میں علالت کی بنا پر ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ آپ کی بیماری کی مندرجہ ذیل خبر ہفتہ وار سرمور گزٹ ناہن میں ''مولوی سید ممتاز علی کی بیماری'' کے عنوان سے شائع ہوئی

ہم نہایت افسوس اور دلی رنج سے اس بات کو لکھتے ہیں کہ مولوی سید ممتاز علی صاحب مترجم چیف کو...

پنجاب نہایت سخت بیمار ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ زندگی سے مایوسی ہو گئی تھی۔ مگر شکر کا مقام ہے کہ اب ان کی حالت روبصحت ہے اور یقین ہے کہ خداوند تعالیٰ آپ کو صحت عاجل اور شفائے کامل بخشے گا۔ صاحب موصوف تو اب تک نہایت مایوسی کی باتیں کرتے ہیں مگر خداوند کریم کی بخشش سے امید ہے کہ ہماری قوم کو کوئی ایسا صدمہ نہ پہنچاوے گا جس کے واسطے وہ اپنے آپ کو تیار ظاہر کرتے ہیں۔ یہ عالم اور نوجوان سید ہماری ہزاروں قومی آرزوؤں کا مرکز ہیں اور خدا ان کا حافظ و ناصر ہو گا۔۲

۱۸۹۲ء میں ایک سرکاری ملازمت کے حصول میں انہیں کامیابی ہوئی۔ غالباً یہ ملازمت بھی حسب منشا نہ تھی اس لیے سال بھر سے زیادہ نہ چلی۔ اب ملازمت کا ارادہ ہی ترک کر دیا اور خانہ نشین ہو گئے۔ ۱۸۹۶ء کے اوائل میں اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ ۱۸۹۷ء میں سید احمد شفیع ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کی صاحبزادی محمدی بیگم سے عقد ثانی ہوا۔ اس خاتون نے آپ کے اس ارادے کو بہت تقویت دی کہ عورتوں کی تعلیم و تہذیب کے لیے ایک زنانہ اخبار جاری کیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء میں رفاہ عام کے نام سے ایک مطبع، دارالاشاعت پنجاب کے نام سے ایک مکتبہ اور تہذیب نسواں کے نام سے زنانہ اخبار جاری کیا۔ ۱۹۰۲ء میں پندرہ روزہ رسالہ ''تالیف و اشاعت'' کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالے نے اقبال کے اہل زبان کے ساتھ معرکے میں اقبال کا بھرپور دفاع کیا۔ ۱۹۰۴ء میں ''مشیر مادر'' جاری کیا۔ ۳ نومبر ۱۹۰۸ء کو محمدی بیگم بھی فوت ہو گئیں۔ ۱۹۰۹ء میں آپ نے بچوں کے لیے ''پھول'' جاری کیا۔ علمی و تعلیمی خدمات کے باعث ۱۹۳۴ء میں حکومت کی طرف سے آپ کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ اس کے ایک سال بعد ۱۵ جون ۱۹۳۵ء کو گیارہ بجے شب حرکت قلب بند ہو جانے سے آپ کا انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ دیوبند کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ مولانا غلام رسول مہر نے آپ کی وفات پر اداریہ میں تحریر کیا۔

سرسید احمد خان، محسن الملک، وقار الملک، شبلی، حالی، آزاد، نذیر احمد، ذکاء اللہ، شرر ہندوستان میں علم و عمل، ادب و شعر اور ترقی و تمدن کے جلیل القدر علم بردار تھے۔ افسوس کہ ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے۔ اس بزم شبانہ کی یادگار مولانا سید ممتاز علی باقی تھے۔ آخر ۱۵ جون کو وہ بھی واصل رفیق اعلیٰ ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اب محفل بالکل سونی ہے اور زندہ دل پیران کہن میں سے کوئی باقی نہیں۔

ما کان قیس ھلکہ ھلک واحد

ولکنہ بنیان قوم تھدما

آج ہندوستان کے مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے جتنا شغف اور تعلیم انگریزی کا جتنا بھی شوق ہے وہ سب کا سب سرسید کی مفید و مبارک تحریک کا نتیجہ ہے اور پشاور سے لے کر راس کماری تک جتنے مسلمان خاندانوں کی عورتیں اور لڑکیاں معمولی شد بد رکھتی ہیں یا اعلیٰ تعلیم پا چکی ہیں یا پا رہی ہیں وہ سب بلا مبالغہ شمس العلما مولانا سید ممتاز علی کے شرمندہ احسان ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر تعلیم و تہذیب نسواں کی نذر کر دی۔ مولانا کا علم و فضل، آپ کی اصابت رائے، دیانت فکر اور پابندی وضع کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ اگر وہ اپنے محدود دائرہ عمل سے نکل کر قوم کی سیاسی و مذہبی رہنمائی کرتے تو ملک کے بہترین رہبروں کی صف اول میں ہوتے، لیکن قوم کے ''نصف بہتر'' کی تعلیم و تہذیب مدت دراز تک معرض التوا میں پڑ جاتی کیونکہ اس دائرے میں بھی مولانا کا نعم البدل دستیاب ہونا بے حد دشوار تھا۔۳

آپ ۱۸۷۷ء میں دسویں جماعت کے طالب علم تھے کہ اسلام کے بارے میں تشکیک کا شکار ہو گئے۔ اپنے انگریزی کے بنگالی استاد بابو چندر ناتھ متر کے کہنے پر سرسید کو ایک مفصل خط لکھا۔ سرسید سے خط و کتابت کے نتیجے میں آپ کے تمام شکوک رفع ہو گئے اور سرسید آپ کے ذوق علمی اور قرآن فہمی کے اس قدر قائل ہو گئے کہ اپنی تفسیر میں جہاں کوئی دقت، اشکال پیدا ہوتی وہاں آپ سے مشورہ کیے بغیر آگے نہ بڑھتے۔ سرسید آپ کے مداح تھے اور آپ کے بارے میں نیک خواہشات رکھتے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

میں آپ کی عنایت و محبت کا ہمیشہ شکرگزار ہوں اور آپ سے ایک خاص محبت اس خیال پر رکھتا ہوں کہ مجھ کو آپ سے قومی فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔ خدا آپ کو زندہ رکھے اور بوڑھا کرے اور میرا جو خیال آپ کی نسبت ہے اس کو پورا کرے۔۴

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

شکر خدا کہ ہماری قوم میں تم سا نوجوان لائق پیدا ہوا۔ خدا تم کو زندہ سلامت رکھے ...... جو بات خدا نے ہم کو ڈاڑھی سفید ہونے کے بعد دی، وہ خدا نے تم کو اس عمر میں دی کہ شاید ابھی پوری ڈاڑھی بھی نہ نکلی ہوگی ...... خدا تم کو زندہ رکھے اور جیسی ہم کو امید تمہاری ذات سے قوم کی بھلائی کی ہے، خدا اس کو پورا کرے۔۵

سرسید اس بات کے خواہش مند تھے کہ ان کا تہذیب الاخلاق، سید ممتاز علی اپنے اہتمام سے لاہور سے جاری کریں۔ سرسید خطوط میں آپ کو ''محبی و مکرمی'' اور ''محبی و مشفقی'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ آپ کے نام سرسید کے خطوط کی تعداد ایک سو سے زائد ہے۔

شبلی سے بھی آپ کے مخلصانہ تعلقات تھے اور وہ بھی آپ کی علمیت و قابلیت کے مداح تھے۔ شبلی خطوط میں آپ کو ''اخ المعظم'' اور ''جناب من'' کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ان کی خواہش رہی کہ اپنے تصنیفی کاموں میں آپ کو اپنے ساتھ شریک تصنیف بنائیں۔

ایک خط میں لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ میں اور آپ مل کر کوئی تصنیف کریں تو بہت کام کی ہو۔۶

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

میں ایک سلسلہ تصنیف مشترک چھیڑنا چاہتا ہوں جس میں آپ کو ایک مقصد یہ پارٹ لینا تھا۔

آپ کی کتابوں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ محاکمہ ولادت مسیح

۲۔ خیر المقال فی ترجمہ المنقذ من الضلال (اردو ترجمہ و حواشی) لاہور اسلامیہ پریس ۱۸۹۰ء۔ ۱۵۷ص

۳۔ رد الملاحدہ (اردو ترجمہ و حواشی) لاہور مطبع رفاہ عام (س۔ن) ۵۶ص

۴۔ دربار اکبری۔ مصنفہ محمد حسین آزاد۔ ترتیب و تدوین۔ لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۸۹۸ء

۵۔ حقوق نسواں۔ لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۸۹۸۔ ۱۹۰ص

۶۔ شیخ حسن۔ لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۲۰۔ ۸۴ص

۷۔ خانہ داری۔ لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۲۲۔ ۲۲۰ص

۸۔ تذکرۃ الانبیا۔ لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۱۹۔ ۲۰۰ص

۹۔ پھوہڑ نامہ۔ لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۲۴۔ ۱۶ص

۱۰۔ تفصیل البیان فی مقاصد القرآن۔ ۷ جلد۔ لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۱۔ ۱۹۳۵

۱۱۔ سبیل الرشاد۔ لاہور: دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۳۵۔ ۴، ۱۵۰ص

۱۲۔ ثبوت واجب الوجود

۱۳۔ خزینۃ الاسرار

۱۴۔ ترجمہ زادالمعاد

آپ کا سب سے بڑا علمی کارنامہ تفصیل البیان ہے جس کو آپ نے پچیس برس کی محنت سے ترتیب دیا تھا۔ یہ آیات قرآنی کا ایک مبسوط اشاریہ ہے جو معانی و مطالب کے اعتبار سے مرتب کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ایک موضوع ایک ہی مقام پر بیان نہیں ہوا بلکہ ایک عنوان پر روشنی ڈالنے والی متعدد آیات مختلف مقامات پر ملتی ہیں۔ لہٰذا ایک فرد جو کسی خاص موضوع کے ذیل میں آنے والی تمام آیات سے بیک وقت باخبر ہونا چاہتا ہو اس کے لیے یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ تمام قرآن شروع سے آخر تک نہ پڑھے۔ یہ ایک وقت طلب مسئلہ ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ قرآن میں زیر بحث آنے والے موضوعات سے متعلق آیات ایک ہی مقام پر جمع کر دی جائیں تاکہ ان سے کماحقہ استفادہ کیا جا سکے۔

اس ضرورت کے پیش نظر آپ نے نہایت جانفشانی اور عرق ریزی سے پانچ ہزار سے زائد عنوانات کا تعین کیا جو قرآن مجید کی جملہ آیات سے قائم ہو سکتے ہیں اور پھر ان کے ذیل میں آنے والی تمام آیات ایک مقام پر جمع کر دیں اور ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ بھی درج کر دیا۔ ترجمہ کا کام آپ کے دوست مولانا نجم الدین سیوہاروی نے شروع کیا مگر وہ آدھا ترجمہ بھی نہ کر پائے تھے کہ انتقال فرما گئے۔ بقیہ کی تکمیل آپ نے خود کی۔

تفصیل البیان سات حصوں پر مشتمل ہے۔

کتاب العقائد

کتاب الاحکام

کتاب الرسالت

کتاب المعاد

کتاب الاخلاق

کتاب بدء الخلق

کتاب القصص

اس کام کے دوران آپ مختلف عوارض کا شکار بھی رہے، لیکن ہمت نہ ہاری۔ آپ لکھتے ہیں:

میری دائمی دماغی علالت کی وجہ سے بارہا کام رکا اور بارہا شروع کیا گیا۔ ۱۹۲۸ء میں ایک اور مرض صعب میں مبتلا ہو گیا اور مجھے شفا خانے میں داخل ہونا پڑا اور عمل جراحی کی نوبت پہنچی۔ تب تو میں زیست سے ناامید ہو گیا۔ اس وقت مجھے اپنی زندگی کے بہت سے کاموں کے ادھورے رہ جانے پر افسوس اور رنج تھا۔ سب سے زیادہ اس قرآنی خدمت کے غیر مکمل رہنے کا صدمہ تھا اور یہ کام صرف غیر مکمل ہی نہ تھا بلکہ ایسی حالت میں تھا کہ میرے مسودے کی ترتیب مجوزہ کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا اور میں یہ سوچ کر بے حد کڑھتا تھا کہ یہ سب کیا کرایا کام میرے بعد برباد ہو جائے گا اور میری برسوں کی محنت اکارت جائے گی۔ مجھے اس حالت میں جو مجھے اپنی زندگی کا کنارہ معلوم ہوتا تھا، یہ خیالات بہت اذیت دیتے تھے اور میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ ایک رات جبکہ میری آنکھوں سے نیند بالکل اڑ گئی تھی' بڑے اضطرار کی حالت میں میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور عہد کیا کہ اگر میں مرض صعب سے جانبر ہو جاؤں اور مجھ میں لکھنے کی طاقت و ہمت آ جائے تو میں اپنا تمام وقت اس خدمت قرآنی میں صرف کروں گا اور جب تک اسے ختم نہ کر لوں گا اور کسی کام کی طرف توجہ نہ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے یہ دعا قبول فرمائی اور میں شفایابی کے وقت سے برابر اس کام میں لگا رہا۔[8]

اس اشاریے میں موضوعات کی تلاش کے لیے جو طریق کار مقرر کیا گیا ہے اس کی تفصیل انھی کی زبانی پڑھیے:

سب سے اول ہر موضوع بطور عنوان اوپر لکھا گیا ہے۔ پھر اس کے تحت میں متعدد ضمنی سرخیاں یا عنوان حاشیہ میں قائم کیے گئے ہیں۔ پھر ضمنی عنوان کے بعد حوالہ اس طرح دیا گیا ہے کہ ایک خط ارضی ڈال کر اس کے نیچے سورۃ کا نمبر دیا ہے اور اوپر آیت کا مثلاً (۷/۲۰) اس سے یہ مطلب ہے کہ ساتویں سورۃ کی بیسویں آیت۔

میں نے اس کتاب میں صرف حوالہ کے بیان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حوالہ دے کر سب آیات محولہ بھی ہر حوالہ کے ساتھ تحریر کر دی ہیں۔ سورۃ و آیت کے نمبر کا حوالہ دینے سے وہ آیت براہ راست فوراً مل جاتی ہے۔ شاید قرآن مجید کے مختلف چھاپوں کے نسخوں میں شمار آیات میں کہیں کچھ اختلاف ہو مگر اس اختلاف کی وجہ سے شمار آیات میں ایک یا دو سے زیادہ کا فرق کبھی نہیں پڑتا۔ جو صاحب اس کتاب کے حوالہ کے بموجب کوئی آیت تلاش کریں اور اتفاقاً وہ نہ ملے تو حوالہ مندرجہ سے پہلے اور پیچھے کی دو دو تین تین آیتیں پڑھیں تو یقیناً آیت مطلوبہ مل جائے گی۔[9]

برعظیم پاک و ہند کے تمام جلیل القدر علما اور بلند پایہ اخبارات و رسائل نے تفصیل البیان کی بے حد تعریف کی ہے اور سب کو تسلیم ہے کہ جو کام علما کی ایک پوری جماعت سالہا سال میں انجام نہ دے سکتی تھی وہ آپ نے تن تنہا انجام دے دیا۔ ذیل میں چند اکابر کی آرا کے اقتباس درج کیے جاتے ہیں۔

مولانا محمد انور شاہ کشمیری

خاکسار جملہ اہل اسلام خواص و عوام کی عالی خدمت میں باادب عرض گزار ہے کہ میرے علم میں اب تک کسی نے اتنے موضوعات اور عنوانات ترتیب نہیں دیے جتنے سید صاحب کو سانح ہوئے ہیں۔ شاید بعد کے لوگ اسی سے مستفید ہوں یا کوئی جزئی اضافہ کریں۔ خواجہ امیر خسرو کا جو مصرع مشہور ہے "من نیز حاضر می شوم تصویر جاناں در بغل" حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی تفسیر قرآن

در بغل سے بدلتے تھے۔ سید صاحب کا حق ہے کہ وہ یوں پڑھیں۔ من نیز حاضر می شوم تبویب قرآن در بغل۔ امید ہے کہ سید صاحب کے صحیفۂ اعمال میں یہ تبویب ضرور درج ہوگی اور ایسا صحیفہ ضرور یمین میں ہوگا۔

مولانا مفتی محمد کفایت اللہ

کتاب کا مطالعہ کرنے سے بے حد مسرت ہوئی۔ مطالب قرآنیہ کی تبویب و تفصیل بڑا کٹھن کام ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اسے انجام دینے کی توفیق عطا فرمائی اور آپ کی اعانت کی۔ آپ نے جس طرز سے یہ کتاب مرتب فرمائی ہے، وہ علما، طلبہ، واعظین، لیکچرار، عوام مسلمین، غرض ہر طبقہ کے لیے مفید اور نفع بخش ہے۔ اب تک جو کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں یہ کتاب ان سے بہتر اور سہل الماخذ ثابت ہوگی۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ہر طبقہ کے مسلمان اس کی قدر کریں گے اور خدا نے چاہا تو اس کو قبولیت عامہ حاصل ہو جائے گی۔ حق تعالیٰ آپ کو اس محنت شاقہ اور عرق ریزی کا صلہ جمیلہ جزیلہ عطا فرمائے اور اس کو آپ کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

مولانا محمد قطب الدین عبدالوالی

حقیقتاً جناب نے جو محنت و سعی ہم معنی آیات قرآنی جمع کرنے میں کی ہے، اس کی جزا تو صاحب کلام ہی عطا فرمانے والا ہے۔ مگر آئندہ نسلیں اہل اسلام کی آپ کے اس عظیم الشان کارنامہ کی دواما متشکر رہیں گی۔ اس دور الحاد و بے دینی میں یہ بڑی خدمت جناب نے کی ہے۔

مولانا محمد طیب ناظم دارالعلوم دیوبند

علوم قرآن کی یہ تشکیل اور تسلسل کے ساتھ آیات قرآنی کی مضمون وار ترتیب، پھر ان مضامین پر حاوی جامع عنوانات، پھر کلی عنوانات کے نیچے جزئی سرخیاں، پھر اس کے ماتحت نہایت ہی وسیع تتبع و تلاش کے ساتھ جگہ جگہ سے آیتوں کو چننا اور پھر اس طویل الذیل ذخیرہ کا ابتدائی فہرست سے واضح پتہ دینا ایک ایسی زبردست خدمت ہے جو تام ہونے کے ساتھ عام بھی ہے اور جامع ہونے کے ساتھ کلیتہً نافع بھی ہے۔

پھر ان عنوانات سے فقط آیتوں اور مضامین ہی کا پتہ نہیں چل جاتا بلکہ ان آیات میں چھپے ہوئے مضامین کی حقیقت پر بھی اس لیے کافی روشنی پڑ جاتی ہے کہ جامع عنوان ہی مضمون کی روح اور اس کی اساس یا پورے مضمون کا خلاصہ ہوتا ہے۔ نیز جس طرح محدثین کا فقہ ان کے تراجم حدیث میں نمایا ہوتا ہے اسی طرح یہ تراجم قرآن قرآنی حقائق و انکشاف کرنے کے ساتھ ساتھ مصنف کی دماغی و فکری کاوش اور اس کے فقہ نفس کو کھلے طور پر نمایاں کر رہے ہیں۔ فجزاہ اللہ عنا و عن جمیع المسلمین احسن الجزاء۔

چاہیے اور چاہیے ہی نہیں بلکہ حق واجب ہے کہ مسلمان جن کا طرۂ امتیاز علوم قرآن سے شغف رکھنا اور اپنے اس مرکز و محور علوم کے ارد گرد پروانہ وار جمع ہونا ہے اس گنجینہ علوم قرآن کا نہایت شوق کے ساتھ پرتپاک خیر مقدم کریں اور مصنف کے اس احسان و ایثار کی جس کا تنہا مقصد جلب منفعت مالی نہیں بلکہ مسلمانوں کو ان کے اصلی اور حقیقی علوم سے باخبر کرنا ہے قدر کریں۔

وهذا آخر كلامي و اول مرامي والحمد لله اولا و آخرا

مولانا ابوالکلام آزاد

قرآن کی آیات و مطالب کی تقسیم و تبویب پر جتنی کتابیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں، یہ ان سب سے زیادہ بہتر اور زیادہ مفصل ہے۔ میں ان تمام لوگوں سے جو قرآن حکیم کے مطالعہ و تدبر کا ذوق رکھتے ہیں سفارش کروں گا کہ اس کتاب کا ایک نسخہ ضرور اپنے پاس رکھیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن شروانی

کتاب کی عظمت اور اس کے مفید ہونے کا اثر تو اسی وقت قلب پر ہوا تھا جب آپ نے براہ کرم اس کا مسودہ لاہور میں دکھایا تھا۔ اس وقت چاروں جلدوں کی فہرست مطالب پڑھی ہے۔ متن پر ایک نظر متفرق مقامات پر ڈالی ہے۔ اس سے مزید قوت خیال سابق کو ہوئی۔ بڑی دینی اور انسانی خدمت مسلمانوں کو کلام مجید سے قریب کر دینا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی کتاب اس میں بہت مدد بخشے گی۔ اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ آپ نے بڑی محنت اور جاں فشانی اس کتاب کی تالیف میں کی ہے، جس کا شکر گزار ہر مسلمان کو بلکہ ہر انسان کو ہونا چاہیے۔

مولانا سید سلیمان ندوی

تفصیل البیان فی مقاصد القرآن کی چار جلدوں کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ کہہ نہیں سکتا کتنی خوشی حاصل ہوئی۔ اگر یہ جلدیں آج سے دو چار سال پہلے چھپی ہوتیں تو میری بڑی محنت بچ جاتی۔ سیرۃ کی چوتھی اور پانچویں جلد کے لیے آیتوں کی تلاش میں بڑی زحمتیں اٹھائیں۔ موجودہ فہرستیں زیادہ کارآمد نہ ہو سکیں، آپ نے بڑا کام کیا اور اس عمر میں وہ محنت کی جو نوجوانوں کے لیے بھی قابل رشک ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی اس خدمت کو بہ چشم رضا دیکھے گا اور قبول فرمائے گا۔ آپ اپنے اس مقبول و اہم کام پر میری دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔

مولانا اسلم جیراجپوری

مؤلف نے اس کتاب میں قرآن کریم کی آیات کو بہ ترتیب موضوع و عنوان فراہم کیا ہے۔ اس طرح پر کہ قرآن کو اول سے پڑھنا شروع کیا۔ ہر ہر آیت جس جس موضوع کے تحت میں آسکتی ہے یا جس جس موضوع کے تحت میں آنی مناسب ہے اس اس کے تحت میں لکھی گئی۔ جو ان موضوعوں کے تحت میں نہیں آسکی، اس کے لیے ایک نیا موضوع یا عنوان قائم کیا اور اس کے ذیل میں لکھی گئی۔ مولوی عبیداللہ صاحب کی اقتباس الانوار اور مولانا وحیدالزماں کی تبویب القرآن بھی ہماری نظر سے گزر چکی ہیں لیکن ان کے مقابلے میں یہ کتاب بہت زیادہ مفید اور کارآمد اور اپنے مقصد کو پورا کرنے والی ہے۔

درحقیقت ایک عرصے سے طالبان قرآن اس ضرورت کو نہایت شدت کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں کہ آیات قرآن بترتیب مضامین مرتب کی جائیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں خواہ وہ عربی میں ہوں یا فارسی یا اردو میں حقائق قرآنی سمجھانے سے قاطبۃً قاصر ہیں۔ کیونکہ وہ ایک ایک آیت کی تشریح کرتی ہوئی چلی جاتی ہیں اور بہت کم ان حقائق سے بحث کرتی ہیں جن کا وہ آیت ایک حصہ ہوتی ہے۔ صورت یہ ہے کہ قرآن میں ایک حقیقت کی تعلیم ایک آیت میں شروع ہوتی ہے، دوسری جگہ کسی سورۃ میں اس پر کچھ اضافہ ہوتا ہے، پھر تیسرے مقام پر کوئی استثنا یا قید یا شرط بڑھائی جاتی ہے، پھر کہیں تکمیل یا تتمہ ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مسئلہ قرآن کے مختلف مقامات میں پھیلا ہوتا ہے۔ اس کی پوری حقیقت سمجھنے کے لیے ان جملہ آیات کو ایک جگہ

فراہم کرنا ضروری ہے تا کہ مکمل حقیقت ذہن میں آ سکے۔ اس لیے علوم قرآن تفاسیر میں نہیں، بلکہ خود قرآن میں ہیں اور آیات کو آیات کے ساتھ ملانے سے وہ سمجھ میں آتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اس ضرورت سے قرآنی آیات کی تبویب شروع کی۔ جن میں سے اب تک سب سے بڑی اور بکار آمد کوشش یہ کتاب ہے..... اس کتاب کی خوبی اور مولف کی محنت کو میں نہایت قابل قدر سمجھتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اس خدمت قرآن کے صلہ میں اللہ ان کو دین اور دنیا دونوں میں کامیاب کرے گا۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی

میں اس کتاب کو موجودہ زمانہ میں قرآن مجید کی ہر خدمت سے زیادہ اور بڑی خدمت سمجھتا ہوں۔ میرا بیان اور میری تحریر اس کتاب کی خوبیوں کے لیے کافی نہیں ہے جب تک کہ خود اس کتاب کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیا جائے۔ اور جو دیکھے گا وہ عاشق ہو جائے گا۔ جو لوگ قرآن مجید کی تبلیغ کو اسلامی تبلیغ کے لیے سب سے اعلیٰ مقصد سمجھتے ہیں، میرے عقیدے میں وہ سب سے زیادہ عقل مند ہیں اور دور اندیش ہیں اور میں ان سب سے عرض کرتا ہوں کہ مولانا سید ممتاز علی کی کتاب مقاصد القرآن ایسی کتاب ہے کہ جو تبلیغ القرآن کا سب سے اچھا ذریعہ ہے۔

مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی

سید ممتاز علی صاحب ملک کے ان چیدہ افراد میں سے ہیں جو مفید مسلمین جدت طرازی میں مشہور ہیں۔ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ علم کی خدمت میں گزرا ہے۔ بہت سے مفید کام انجام دیے۔ اس آخری عمر میں ایک نہایت ضروری کام انجام دینا چاہا ہے خدا اس میں آپ کو کامیاب کرے۔ آپ نے مضامین قرآن شریف کے متعلق ایک مفصل فہرست تفصیل البیان چھپوانی شروع کی ہے۔ کتاب اپنی نوعیت میں نہایت مفید اور ضروری ہے۔ عام علما کو حافظ قرآن نہ ہونے کے سبب ایک مضمون کی آیات بروقت تلاش کرنے اور بیان کرنے میں دقت ہوتی ہے اور قرآن فہمی میں بھی دشواری ہوتی ہے۔ آپ نے اس کتاب میں اس ضرورت کو پورا اور مشکل کو آسان کر دیا ہے۔ دیگر فہرستیں بھی بنی ہیں لیکن اس میں نفس مضمون کا خلاصہ مطلب مرقوم ہونے کے علاوہ ایک خاص جدت یہ بھی ہے کہ زمانہ حال میں جس قدر تمدنی یا سیاسی یا قومی و اجتماعی ضرورتیں لاحق ہو رہی ہیں، سید صاحب ممدوح نے ان کے متعلق بھی قرآن شریف سے آیات منتخب کر کے ان کے مناسب عنوانات مقرر کیے ہیں۔ مثلاً حب وطن، اتحاد و محبت قومی اور سرمایہ داری وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال یہ کتاب علما، واعظین، مدرسین اور مناظرین کے لیے از بس مفید ہے۔[10]

عبدالمجید سالک لکھتے ہیں کہ مدت تک یہ کتاب مسودہ کی صورت میں رہی اور اکثر اکابر علم جو باہر سے لاہور آتے تھے اس مسودے سے استفادہ کرتے تھے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

> ایک دفعہ حضرت سید امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین اور علوبہ پاشا لاہور آئے۔ مولوی سید ممتاز علی نے ان کو چائے کی دعوت دی اور تفصیل البیان دکھائی۔ مفتی اعظم نے اس کتاب کی بے حد تعریف کی اور کہا کہ ایسی کتاب عرب دنیا میں بھی موجود نہیں۔ نجوم الفرقان، فتح الرحمٰن وغیرہ موجود ہیں جن کا فائدہ صرف اس قدر ہے کہ ایک لفظ بھی یاد ہو تو آیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن مسائل کی فہرست اور پھر ہر مسئلے کے متعلق تمام آیات کی یکجائی یہ خوبی عربی زبان کی کسی کتاب میں موجود نہیں۔ اس کتاب کو عربی میں بھی چھپنا چاہیے۔[11]

آپ کو قرآن مجید سے ایسا عشق تھا کہ وفات سے ایک دن پہلے بھی تفصیل البیان کی آخری جلد کے متعلق کام کر رہے تھے۔ حالانکہ طبیعت بے حد کمزور ہو رہی تھی اور ڈاکٹروں نے کام کرنے سے بالکل منع کر رکھا تھا۔

حواشی

۱۔ عبدالمجید سالک۔ یاران کہن۔ لاہور: مطبوعات چٹان، ۱۹۵۵ء۔ ص۔ ۵۸
۲۔ سرمور گرنٹ۔ یکم جون ۱۸۹۱
۳۔ انقلاب۔ ۱۹ جون ۱۹۳۵
۴۔ سرسید بنام ممتاز علی۔ مکتوبہ ۱۲ جولائی ۱۸۷۹
۵۔ ایضاً۔ مکتوبہ ۱۲ اگست ۱۸۷۹
۶۔ شبلی بنام ممتاز علی۔ مکتوبہ ۱۱ مئی ۱۸۹۲
۷۔ ایضاً۔ مکتوبہ ۱۲۱ اکتوبر ۱۸۹۲
۸۔ تفصیل البیان۔ ص۔ ۵۔ ۲
۹۔ ایضاً۔ ص۔ ۶۔ ۷
۱۰۔ تعارفی کتابچہ تفصیل البیان فی مقاصد القرآن۔ ص۔ ۸۔ ۱۲
۱۱۔ سالک۔ یاران کہن۔ ص ۶۲

اقتباس

ہند اور پاکستان کے درمیان خوف کی ایک دیوار کھڑی ہے۔ کیوں؟ پتہ نہیں کیوں؟

پاکستان کو اچھی طرح علم ہے کہ ہند ایک بہت بڑی طاقت ہے جو اگرچہ بڑی طاقتوں میں شمار نہیں ہوتی پھر بھی بڑی طاقت ہے اور دنیا کی تیسری بڑی طاقت بننے کے لیے بے چین ہے۔

اگر پاکستان ہند سے خوف زدہ رہے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ مسلمان حقیقت پسند قوم نہیں ہیں۔ ناامیدی کے گھپ اندھیرے میں بھی مسلمان امید کا ایک چھوٹا سا دیا جلائے رکھنے کا شوقین ہے۔ اسی وجہ سے وہ خطرے کی بو سونگھنے کا عادی نہیں۔ خطرے کی بو آئے بھی تو وہ ناک سکوڑ لیتا ہے۔

مسلمان ازلی طور پر بے پرواہ ہے بے نیاز ہے So What ہے۔ وہ دیکھتا ہے پھر بھی نہیں سمجھتا۔ جانتا ہے پھر بھی نہیں مانتا۔ مسلمان کی سرشت میں Wanting to Believe کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔

اگر مسلمان ایسا نہ ہوتا جیسا کہ وہ ہے تو تقسیم کے المیہ کو کبھی نہ بھولتا۔ انتقام کی چنگاری کو سینے سے لگائے رکھتا اور یہودی کی طرح موقعے کا منتظر رہتا۔ لیکن وہ تقسیم کے واقعہ کو بھول چکا ہے۔ صرف بھولا ہی نہیں بخش چکا ہے۔ ہتاؤ چھوڑو۔ دفع کرو۔

(ہند یاترا از ممتاز مفتی)

انگریزی ناول ۱۹۱۴ء اور اس کے بعد

ادیب سہیل

گزری ہوئی صدی اور آنے والی صدی کے درمیان خط تنسیخ فوراً کھینچ نہیں دی جاتی۔ ایسا ممکن بھی نہیں۔ گزری ہوئی صدی کے آثار، نشانیاں، ثقافتی و ادبی سرگرمیوں کے اثرات آنے والی صدی میں اپنی افادیت سے بہرہ ور کرتے رہتے ہیں تا آنکہ نئی صدی کسی نئی صورت حال سے دوچار ہوتی ہے، منظر بدلنے لگتے ہیں اور گزری صدی زینہ بہ زینہ مکمل طور پر نئی صورت میں منقلب ہو جاتی ہے۔

اس کلیے کے پیش نظر جب بیسویں صدی کے انگریزی ناول کی وساطت سے بحث کا آغاز ہوتا ہے تو ہمارے سامنے ایک انگریزی ناقد والٹر ایلن کی تصنیف ''دی انگلش ناول'' (The English Novel) کے اوراق کھل جاتے ہیں اور "Pilgrims Progress" سے شروع ہو کر جیمس جوائس اور ڈی۔ ایچ لارنس کے ناولوں تک پہنچتے ہیں۔

والٹر ایلن نے اپنی کتاب ''دی انگلش ناول'' کو سات ابواب میں منقسم کیا ہے۔

۱۔ شروعات
۲۔ اٹھارویں صدی
۳۔ ابتدائی انیسویں صدی: پہلی جنریشن
۴۔ ابتدائی وکٹورین
۵۔ آخری وکٹورین
۶۔ ناول ۱۸۸۱ء سے ۱۹۱۴ء تک
۷۔ ۱۹۱۴ء اور اس کے بعد

ان تمام ادوار کے احاطہ کے لیے والٹر ایلن کی مذکورہ تنقیدی کتاب سے کم ضخامت درکار نہ ہوگی۔ سردست ہمارے موضوع کا تقاضا یہ نہیں ہے۔ ہماری گفتگو کا دائرہ ساتویں باب تک محدود رہے گا جو بیسویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی حوالے سے آگے بات کرنے کی سعی کی جائے گی۔

والٹر ایلن نے ساتویں باب کا عنوان "1914 and after" رکھا ہے۔ یہ زمانہ کئی اعتبار سے مغرب کے لیے اہم ہے۔ پہلی جنگ عظیم کی ابتدا ۱۹۱۴ء میں ہوئی اور ۱۹۱۸ء میں اس کا اختتام ہوا۔ مابعد جنگ عظیم کے اثرات نے سماجی، معاشی، ادبی و سیاسی سطوح کو تادیر اپنی گرفت میں رکھا۔ پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں، ذہنوں میں کئی طرح کے ردعمل ظاہر ہوئے جو بالآخر ادبی رجحانات کی صورت میں منتج ہوئے۔ یہی وہ اوقات ہیں جب ۱۹۲۰ء میں جدیدیت و مابعد جدیدیت نے اپنے پر پرزے نکالے اور ملارمے، بودلیر، راں بو اور ویلری کو فرانس میں جدیدیت کے ابتدائی خدوخال کو پیش کرنے پر راغب کیا جو فرانسیسی ادب میں ایک غالب ادبی تحریک Symbolism بن کر رونما ہوئی۔ ٹی ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ (۱۹۲۲ء) پھر آسوالڈ اسپنگلر کی "The Decline of the West" جرمنی سے شائع ہوئی اور وہ مابعد جنگ عظیم اثرات تھے کہ ادب و فنون لطیفہ میں ایک ساتھ کئی طرح کے رجحانات نے جنم لیا۔ دادازم، سرریلزم (۱۹۲۴ء آندرے بریسٹن) روسی انقلاب (۱۹۲۰ء) فارملزم اسی زمانے کی تحریکیں ہیں۔ روسی انقلاب نے عالمگیر سطح پر ادب و ذہن کو متاثر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ مغرب نے روسی انقلاب سے متاثر ادبی تحریک کے اثرات کو کم کرنے کے لیے جدیدیت کا ڈول ڈالا (اردو ادب میں بھی یہی دو تحریکیں: ترقی پسندی ۱۹۳۶ء میں اور جدیدیت ۱۹۳۹ء میں سامنے آتی ہیں)۔

جیمس جوائس کا ناول یولیسس (Ulysses) ۱۹۲۲ء یا اس کے آس پاس منظر عام پر آیا۔ جوائس نے اپنے ناول میں شعور کی رو کا تجربہ کیا تھا۔ ادبی حلقے میں اس کی حد درجہ پذیرائی ہوئی۔ فکشن میں بلاشبہ شعور کی رو Stream of consciousness ایک نیا اسلوب نگارش تھا۔ دیکھتے دیکھتے جیمس جوائس کے ناول Ulysses کی پذیرائی چار دانگ عالم میں جنگ کی آگ کی طرح پھیلتی چلی گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں جیمس جوائس اس نام و نمود کا سو فی صد مستحق تھا۔ لیکن اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ تجربہ معلق نہیں ہوتا۔ اس کے آگے پیچھے بھی کچھ ہوتا ہے۔ چراغ سے چراغ جلنے کا محاورہ ایسے موقعے پر ہی یاد آتا ہے۔ جوائس سے پہلے شعور کی رو کے تجربے کے باب میں ورجینا وولف کے نام کو بھی ذہن نشین رکھنا ہے۔ کیونکہ شعور کی رو کے حوالے سے کوئی بات، کوئی تنقیدی محاکمہ ورجینا وولف کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہاں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ شعور کی رو کا آغاز ورجینیا کے پہلے ڈروتھی رچارڈسن (۱۹۱۵ء اور اس کے آس پاس) کے ہاں ہو چکا تھا۔

جیمس جوائس کے بعد ''شعور کی رو'' کی یہ روایت انگریزی ادب میں سموئیل بیکٹ سے آگے بڑھتی رہی۔ بیکٹ ایک عرصے تک جوائس کا حاضر باش اور رفیق رہا، بلکہ وہ جوائس کی سہولت کے لیے اس کے مسودات صاف کر دیا کرتا تھا۔ بیکٹ کے متعلق انگریزی ناقدین کا کہنا ہے وہ جیمس جوائس کا ہم وطن اور اس کا حقیقی وارث تھا۔ "A Samuel Beckett Reader" کے مولف و مرتب جان کالڈر (Jhon Calder) نے اس کی شناخت اس طرح کی ہے کہ وہ انگریزی ادب کا آخری دیوقامت ادیب تھا۔ اسے ۱۹۶۹ء میں نوبل انعام کا مستحق ٹھہرایا گیا۔

بیکٹ کی پیدائش اپریل ۱۹۰۶ء میں ڈبلن (آئرلینڈ) میں ہوئی۔ ادب میں اول اول اس کی شہرت اس کے ڈرامے "Waiting for Godo" سے ہوئی۔ وہ نہ صرف کثیر الجہت ادیب تھا بلکہ اچھا شاعر و موسیقار کی حیثیت سے بھی متعارف و مشہور تھا۔

مختصراً اس بحث کی صورت یہ بنتی ہے کہ شعور کی رو (Stream of Consciousness) کے تجربے کا آغاز ڈروتھی رچارڈسن سے ہوا، ورجینا وولف نے اسے پروان چڑھایا اور اسے کلاسکس حاصل ہوا۔ جیمس جوائس کے ناول Ulysses (یولیسس) کے ذریعے والٹر ایلن نے جوائس اور ڈی ایچ لارنس (D.H. Lawrance) کی شناخت دو متوازی و متحائف شخصیات کی صورت میں کی ہے۔

۱۹۵۴ء میں والٹر ایلن کہہ رہا ہے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ جوائس، لارنس، ورجینا وولف اور ڈروتھی کی ادبی فتوحات کے بارے میں کوئی حتمی پیش بینی یا آخری رائے دی جائے، لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ان چاروں میں سے آخر الذکر دو ناول نگار (ورجینا وولف اور ڈروتھی) نسبتاً کم تر ظاہر ہوئی ہیں، گویا اس ضمن میں جو والٹر ایلف نے مختصر فہرست مرتب کی ہے اس میں جوائس اول لارنس دوم، ورجینیا وولف سوم اور ڈروتھی کو درجہ چہارم پر رکھا ہے۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ شعور کی رو کو انگریزی ناول میں برتنے والی پہلی

شخص ڈروتھی ہے۔ ڈروتھی نے شعور کی رو کا تجربہ اول اول اپنے ناول Pointed Roofs ۱۹۱۵ء میں کیا پھر انہوں نے درجن بھر ناول لکھ کر Pilgrimage کے نام سے شائع کیا۔ ورجینیا وولف کی شہرت کے ستونوں میں "To the Light House" اور "The Waves" کا شمار ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ فکشن میں شعور کی رو کے تجربے کو جوائس نے بام عروج پر پہنچایا۔ یہ بھی درست ہے کہ ڈی۔ ایچ لارنس اس قبیلے سے باہر ہے لیکن انگریزی ادب میں بہر حال ایک قد آور ناول نگار متصور ہوتا ہے۔

ڈی ایچ لارنس کے متعلق والٹر ایلن لکھتا ہے۔

> A common view of Lawrance is that he was a great Novel Manque, who after "Sons and Lovers" fell deeper and deeper into the hysteria and the preaching of a bastared mysticism. Sons and lovers" is a great Novel but not in my opinion greatest"
>
> (The English Novel-1954, p357)

والٹر ایلن کے مطابق جوائس اور لارنس کا مقام انگریزی ناول کے حوالے سے پہلو بہ پہلو ٹھہرتا ہے۔ انگریزی ناقدین اس بات سے بھی آگاہ ہیں کہ لارنس جوائس کے کام کو خاطر میں نہیں لاتا اور اسے پسند نہیں کرتا۔ کم وبیش یہی حال جوائس کا ہے کہ وہ لارنس کے لیے اچھی رائے نہیں رکھتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے اور مخالف سمتوں میں چلتے ہوئے بھی انگریزی ناول نگاری اور ناول کو وہ ارفع مقام عطا کر گئے جس پر انگریزی زبان کو بجا طور پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ "The English Novel" کے مصنف والٹر ایلن نے جوائس اور لارنس کے نو عمر معاصرین میں ایک ادیب Windrom Lewis کا نام لیا ہے، جو اس کے خیال میں ان دونوں سے یکسر مختلف انداز و اسلوب نگارش رکھتا ہے۔ اور اس مقام تک پہنچا چاہتا ہے جو انگریزی ناول میں جوائس اور لارنس کا ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آتا ہے۔ یہ تو وقت بتائے گا۔ بہر حال جوائس اور لارنس ہنوز انگریزی ناول میں ہراول کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

کتابیات

۱۔ The English Novel, Author Walter Elen

۲۔ جدیدیت و مابعد جدیدیت از ضمیر علی بدایونی

۳۔ A Samuel Beckett Reader, Jhon Calder

غم و آلام سے متعلق غالب کا سفاکانہ رویہ

مشکور حسین یاد

غالب نے اپنے مندرجہ ذیل شعر میں انسانی غم کی ایک صورت حال کو ذراہٹ کر بیان کیا ہے۔

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

شارحین نے اس شعر کا عام مطلب یہ لیا ہے کہ غم کی فراوانی کے باعث سر اپنے تمام حواس کھو بیٹھا ہے، بے حس ہو گیا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو پھر ایسی صورت میں اگر یہ سر کٹ بھی جائے تو ہمیں غم نہیں ہونا چاہیے کہ اپنی بے حسی کی وجہ سے وہ ہمارے کام کا تو اب نہیں رہا تاہم اگر یہ سر نہ بھی کٹے تو ہمارے زانو پر دھرا ہوتا اور یہ سر کے کٹنے کی صورت سے کوئی مختلف صورت نہ ہوتی۔ شدت غم ہی سے سہی سر کو زانو پر دھر کر بیٹھ جانا کوئی صحت مند صورت حال نہیں ہے۔ تمام شارحین نے بات یہیں پر ختم کر دی ہے۔ غلام رسول مہر نے زیادہ سے زیادہ یہ نکتہ نکالا ہے کہ ''جب کوئی چیز بے حس اور سن ہو جائے تو اس کا کٹنے کا بھی کوئی احساس نہیں ہوتا'' مطلب یہ ہے کہ غلام رسول مہر نے بھی مفہوم شعر میں کوئی اہم اضافہ نہیں کیا۔ کسی شارح نے اتنا بھی نہیں کہا کہ غالب انسانی غم کی اس صورت حال کو پسند نہیں کرتا یا شدت غم سے ذہن کا بے حس ہو جانا کوئی اچھی بات نہیں۔ جب یہ صورت حال ہو جائے تو انسان کو چاہیے کہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دے۔ اگرچہ ''تو غم کیا سر کے کٹنے کا'' یہ ٹکڑا صاف بتا رہا ہے اس طرح غم زدہ ہونے سے بہتر ہے کہ آدمی اپنا خاتمہ کر لے، یعنی غم کی یہ صورت حال کسی طرح بھی قابل قبول نہیں۔

ذرا غور کریں تو ہمیں جلد ہی پتا چل جاتا ہے کہ غالب کے لیے فراوانی غم کے باعث انسان کے سر کا بے حس ہونا کسی طرح بھی عمدہ عمل قرار نہیں پاتا۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے انسان اپنے غم کی طرف سے لاپروا اور لاتعلق ہو جائے۔ یہاں غالب انسانی نفسیات کے کیسے باریک نکتے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرا رہا ہے۔ شدت غم سے انسانی ذہن کا ماؤف ہو جانا یا بے حس ہو جانا ایک خاص حد تک تو مانا جا سکتا ہے لیکن اس بے حسی کی حالت کو لحاظ ہونا چاہیے اس سے زیادہ نہیں۔ اگر یہ صورت حال طول کھینچتی ہے تو سمجھ لیجیے انسان اپنے غموں سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی کمزوری دکھا کر ان سے بھاگ رہا ہے اور غموں سے اس طرح فرار اختیار کرنا، گویا اپنی موت کو دعوت دینا ہے اور یہ موت بھی کیا ایک طرح کی خودکشی کہی جا سکتی ہے۔ دنیا میں کوئی غم ایسا نہیں جس کو انسان برداشت نہ کر سکتا ہو۔ اس لیے کہ کسی بھی غم کو لے لیجیے وہ انسان کا خود ساختہ غم ہوتا ہے اور یہ جو مثل مشہور ہے خود کردہ را علاج نیست ... تو اس کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ اپنے کیے کا کوئی علاج نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو سنبھال کر کیوں نہیں رکھتے۔ اپنے آپ کو سنبھالنا قطعی طور پر آپ کے اپنے بس میں ہے۔ اس میں اگر کوئی دوسرا کچھ مدد بھی کر سکتا ہے تو دوسرے کی مدد کے کارآمد ہونے کا انحصار بھی آپ کی اپنی ہی ذات پر ہے۔

غالب اپنے اس شعر زیر بحث میں بہ حیثیت انسان اپنے خلاف بہت سینہ سپر ہو کر سامنے آیا ہے۔ ایک طرح بڑی بے

دردی اور سفاکی کے ساتھ کہہ رہا ہے یہ کون سی بہادری اور شجاعت ہوئی کہ غموں کی زیادتی کو برداشت کرنے کی بجائے آپ غموں کی طرف سے بے حس ہو جائیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے آپ نے اپنا سر اپنے تن سے جدا کر ڈالا اور پھر آپ اپنے قتل یا خودکشی کے الزام سے بھی بچنا چاہ رہے ہیں۔ اس شعر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ غالب اس میں خود رحمی کا شکار نہیں ہوا اسی بات کو میں نے غالب کی بہادری اور شجاعت بھی کہا ہے اور سفاکی اور بے دردی بھی۔ آدمی جب اپنے خلاف کھڑا ہوتا ہے تو اس وقت وہ شجاع بھی ہوتا ہے اور سفاک بھی اور یہ انسان کے اخلاق کے ضمن میں کوئی معمولی بات نہیں کہ وہ اپنی شجاعت اور سفاکی کے رخ کو عدل گستری کی طرف سے ادھر ادھر نہ ہونے دے۔ غالب نے اپنے زیر بحث شعر میں یہی کمال دکھایا ہے۔ ہم اس کی شجاعت کی داد بھی دینے پر مجبور ہیں اور اس کی سفاکی کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ میں غالب کا یہ زیر بحث شعر پھر لکھ رہا ہوں۔

ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا
نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اس شعر کا جمالیاتی پہلو یہ ہے کہ غالب نے یہاں جمالیات کو حرکیات کے سپرد کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔ غم کی فراوانی سے کسی کے سر کا اس کے زانو پر ہونا غالب کو قطعی پسند نہیں۔ زانو پر سر کا ہونا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی نے کٹے ہوئے سر کو کسی کے زانو پر رکھ دیا ہو۔ اس سے کسی طرح بھی جمالیات کی کوئی عمدہ تصویر نہیں بنتی۔ غالب تو غموں کی صورت میں سر کو زانو پر دیکھنے کی بجائے اسے اپنی اصل جگہ پر دیکھنے کا متمنی ہے۔ کسی کا سر اس کی اپنی جگہ قائم ہے تو یوں سمجھیے وہ شخص بھی اپنی جگہ قائم ہے اور پوری طرح حرکت میں بھی ہے۔ سر کے فعال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سر میں اچھے اچھے خیالات نے ایک چراغاں سا کر ڈالا ہے اور اس چراغاں کی روشنی میں زندگی پوری طرح حرکت میں آئی ہوئی ہے۔ اس انداز میں حرکت میں آئی ہوئی ہے کہ روشنی کی رفتار کو بھی اس پر رشک آئے۔ اسی حرکت کے لیے غالب نے ذہن کی جگہ سر کا استعمال کیا ہے اور پھر اس کے بعد سر کے تمام لوازمات کا بھی خیال رکھا ہے۔ یعنی سر کا کٹنا اس کا زانو پر دھرا ہونا وغیرہ وغیرہ اور یوں غم زدہ آدمی کی ایک امیج بنتی ہے جس پر غور کرنا ضروری ہے۔

شعر زیر بحث میں غالب نے سب سے بڑی بات یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسانی نفسیات میں کوئی مقام ٹھہر جانے کا نہیں۔ انسانی نفسیات کے اکثر مسائل کو انسان بذات خود حل کر سکتا ہے۔ مثلاً اسی شعر میں کثرت آلام سے انسان کا ذہن بے حس تو ہو سکتا ہے لیکن یہ بے حسی وقتی ہوتی ہے جس کو انسان اپنے ارادے سے دور کر سکتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسا نہیں کر سکتا تو اس میں اس کے ذہن کا کوئی قصور نہیں اصل قصور اس کے عزم و ارادہ کا ہے جس کا براہ راست تعلق اس کے نفس سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان کا نفس جس کو اقبال نے خودی کہا ہے مضبوط اور توانا ہے تو کوئی وجہ نہیں انسان اپنے ذہن کی الجھنوں کو خود ہی دور نہ کر سکتا ہو۔ نفس کا خود اپنی ہی بہت سی باتوں پر حاوی ہونا ایک بہت بڑی حقیقت ہے جس سے انکار کرنا آسان نہیں۔ جو شخص اس طرح انکار کرتا ہے تو سمجھ لینا چاہیے ان حضرات میں خود کوئی کمزوری موجود ہے۔

غالب اس بات کا بالکل قائل نہیں کہ کوئی شخص اپنے غموں سے ہار مان جائے۔ اسے تو وہ شخص بھی ایک طرح مردہ نظر آتا ہے جو غمگین ہونے کے باعث اپنا سر جھکائے بیٹھا ہو۔ ذہن کی جگہ غالب نے جو شعر زیر بحث میں سر کا استعمال کیا ہے، اس سے یہ نکتہ بھی نکلتا ہے کہ غالب انسانی ذہن کو انسانی جسم سے کوئی علیحدہ چیز نہیں سمجھتا۔ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں یا انہیں ایک ہی تصویر کے دو رخ کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے شعر زیر بحث کا انسانی کیفیات کے حوالے سے لطیف ترین پہلو یہ ہے کہ شدت غم کے باعث جو دل میں ایک بے حسی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اسے غم کی طرف سے لاپروائی یا لاتعلقی میں تبدیل نہیں ہونے دینا چاہیے اور بے حسی کی صورت میں اس کا خدشہ ہر وقت لاحق رہتا ہے۔ ذہن کا صحت مندانہ رویہ یہ ہے کہ وہ غموں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے اور اس کے لیے انسان کو باہر سے کوئی چیز مانگنی نہیں پڑتی بس اپنے اندر ہی سے حوصلہ اور ہمت کی توانائی حاصل کرنا پڑتی ہے۔ اپنے اندر کی طرف نہ دیکھنا انسان کی سب سے بڑی لاپروائی شمار ہوتی ہے۔

قریب قریب ہر غم انسان کو اپنے اندر جھانکنے کی دعوت دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر غم انسان کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس وقت بھی ایک فرد بشر اپنے کسی غم کا تجزیہ کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت وہ اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لے رہا ہوتا ہے۔ عموماً یہ عمل لاشعوری طور پر جاری رہتا ہے اور یوں آدمی اپنے باہر سے اپنے اندر کی طرف سفر کر رہا ہوتا ہے۔ یہ عمل اسی وقت رکتا ہے جب ایک غم کے ساتھ کوئی دوسرا غم بھی اس کے، یعنی آدمی کے سامنے آن موجود ہوتا ہے اور یہ دوسرا غم اس کی دانست میں پہلے غم سے زیادہ اہم یا زیادہ سخت ہوتا ہے۔ آفات ارضی و سماوی یا اچانک حادثات سے قطع نظر آدمی کے روزمرہ کے غم اول تو اس کے خود ساختہ ہوتے ہیں جن سے نمٹنے کی قوت و صلاحیت ہر آدمی میں موجود ہوتی ہے اور اگر خود ساختہ نہ بھی ہوں تب بھی کوئی غم ایسا نہیں ہوتا جس کا مقابلہ انسان نہ کر سکتا ہو۔ گونا گوں غم و آلام سے نمٹنے کی صلاحیت ہر آدمی میں موجود ہوتی ہے لیکن انسان کی فطرت کی ایک یہ بھی قابل غور ادا ہے کہ عام غم و آلام کو بھی وہ خاص اہمیت دینے کا عموماً مرتکب رہتا ہے جس کے باعث اس میں فرار اور گریز کی عادت پیدا ہونے لگتی ہے اور پیدا ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے کسی انسانی معاشرہ کے سب غم برابر ہوتے ہیں کہ یہ سب غم قابل علاج ہوتے ہیں اور غموں کا لاعلاج نہ ہونا بھی ایک ایسی صورت حال پیدا کر دیتا ہے کہ آدمی ایک غم کے بعد دوسرے اور تیسرے کو ایک ایک کر کے سارے ہی غموں کو پس پشت ڈالنا شروع کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں وہ آلام کی گرفت میں آ جاتا ہے اور غالب نے اپنے زیر بحث شعر میں آلام میں اس طرح گرفتار ہونے ہی کو انسان کی بے حسی قرار دیا ہے۔ اور اس بے حسی کے لیے غالب اپنے دل میں کوئی جذبۂ ہمدردی نہیں رکھتا۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے غالب تو ایسی صورت حال میں انسان کو بڑی سے بڑی سزا دینے کو عین عدل سمجھتا ہے اور سزائے موت سے بڑھ کر بڑی سزا کیا ہو سکتی ہے۔ ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا۔ اس مصرع میں لفظ 'یوں' اس تمام تجزیہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جو مجھ سے بہت سے الفاظ کے ذریعے بھی میری دانست میں اب بھی پوری طرح بیان نہیں ہو سکا۔ غالب کی یہی بلاغت تو اس کے قاری کو ذہنی اعتبار سے ہمہ وقت ہوشیار رہنے کا حکم صادر کرتی رہتی ہے۔

لیکن اسی لفظ 'یوں' سے غم و آلام کے بارے میں غالب کے سفاکانہ رویے سے ایک جمالیاتی پہلو بھی تو نمایاں ہو رہا ہے جبکہ اسی لفظ 'یوں' نے ایک انسان کے سر کو نہ صرف تن سے جدا کر دیا ہے بلکہ اس کا، یعنی اس طرح کے مغموم انسان کا سر زانو پر رکھا ہوا بھی بے کار نظر آ رہا ہے۔ اور جب ہم اس زیر بحث شعر کو پڑھتے ہیں اور انسان کی درد و آلام کی طرف سے بے حسی کو دیکھتے ہیں تو یہی انسان جب اپنے غم و آلام کے چیلنج کو قبول کر کے ان کے مقابلے کے لیے سر بلند ہوتا ہے تو اپنی انسانیت کے تمام حسن و جمال کا پیکر نظر آتا ہے۔

سر عبدالقادر اور پنجاب آبزرور

محمد حنیف شاہد

زیرِ نظر مضمون میں ہم شیخ عبدالقادر کی ان خدمات کا جائزہ پیش کریں گے جو انہوں نے ''پنجاب آبزرور'' کے نائب مدیر اور مدیر کی حیثیت سے انجام دیں۔ ان کے کیا دور رس نتائج نکلے اور ان کا پنجاب بلکہ برصغیر پاک و ہند کی سیاست پر کیا اثر پڑا؟

﴿۱﴾

''پنجاب آبزرور'' کا پہلا شمارہ کب منصہ شہود پر آیا اس ضمن میں افسوس ہے کہ ہمیں کوئی خاطر خواہ معلومات دستیاب نہیں ہو سکیں۔ یہاں تک کہ شیخ عبدالقادر اور شیخ منظور قادر کے ذاتی کتب خانے ہماری مدد نہیں کر سکے۔ علامہ اقبال نے ''پنجاب آبزرور'' کا اپنے مکاتیب میں اشارتاً ذکر فرمایا ہے۔ صحافت کی تاریخ کی کتب بھی اس سلسلے میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کر سکیں۔ نیز بسیار تلاش و جستجو کے باوجود ''پنجاب آبزرور'' کا کوئی ابتدائی شمارہ نہیں مل سکا۔ حتیٰ کہ اس ضمن میں ڈاکٹر ایس ایم اکرام رقم طراز ہیں:

"Our efforts to trace a copy of 'The Observer' have failed"۱

''پنجاب آبزرور'' درحقیقت خواجہ احمد شاہ نے شروع کیا۲۔ وہ ایک نامور کشمیری مسلمان تھے۔ لدھیانہ کے رئیس سوداگر اور میونسپل کمشنر تھے اور پنجاب ٹریڈنگ کمپنی لدھیانہ کے مالک تھے۔ دراصل انہوں نے ''فلن تھراپسٹ''۔ "Philin Thropist" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار فروری ۱۸۸۶ء میں لدھیانہ سے جاری کیا۔ یہ اخبار اس قدر کامیاب رہا کہ انہوں نے اس کا نام تبدیل کر کے ''پنجاب آبزرور'' رکھ دیا اور یہ اخبار لاہور سے نکلنے لگا۔۳

''پنجاب آبزرور'' مسلمانوں کا سب سے پہلا اخبار نہیں تھا جو انگریزی زبان میں جاری ہوا، بلکہ اس سے تقریباً چالیس سال قبل سید محمد عظیم دہلوی نے جو خان بہادر سید محمد لطیف (مصنف ''تاریخ لاہور'' اور ''تاریخ پنجاب'') کے والد ماجد تھے۔ لاہور سے ''دی پنجابی'' (The Panjabi) کے نام سے ایک اخبار نکالا تھا لیکن یہ اخبار ایک انگریز کی زیر ادارت چھپتا تھا۔ ''انگریزوں کے لیے مخصوص تھا اور انگریزی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتا تھا''۔۴

ہمارے قیاس کے مطابق ''پنجاب آبزرور'' ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۲ء کے درمیان جاری ہوا۔ اس میں شیخ عبدالقادر کے ۱۸۹۳ء میں دو مضامین بعنوان ''اردو لٹریچر'' (Urdu Literature) اور ''تصانیف آزاد'' (Azad & His Works) شائع ہوئے۔ جبکہ وہ ابھی ''انڈر گریجوایٹ'' تھے۔ پہلا مضمون جو یونگ میز محمڈن ایسوسی ایشن کے اجلاس میں پڑھا گیا، اگست ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا اور بعد میں ان کی سب سے پہلی تصنیف بعنوان "The New School of Urdu Literature" میں جو پہلی مرتبہ ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی، شامل کیا گیا۵۔ دوسرا مضمون ۲۳ اکتوبر ۱۸۹۳ء کو یونگ میز محمڈن ایسوسی ایشن کے اجلاس پڑھا گیا وہ

﴿۲﴾

پنجاب آبزرور کے مضامین کے لیے ایک باقاعدہ کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جو مضامین کی چھان پھٹک کا کام سرانجام دیتی تھی، اس کے بارے میں تفاصیل تو نہیں مل سکیں البتہ اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ اس میں خواجہ احمد شاہ، چیف ایڈیٹر اخبار مذکور اور جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں کے علاوہ میاں محمد شفیع بھی شامل تھے اور جب شیخ عبدالقادر اخبار مذکور سے منسلک ہوئے تو وہ بھی اس میں شریک ہو گئے۔ شیخ عبدالقادر تحریر فرماتے ہیں:

''اسی اثنا میں مسلمانوں کا اخبار پنجاب آبزرور زبان انگریزی میں نکلنا شروع ہوا میں اس میں اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوا اور اس کے مضامین کی نگرانی ایک کمیٹی کے سپرد ہوئی جس کے ممبروں میں دونوں میاں صاحبان ـــــ جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں اور میاں محمد شفیع شامل تھے۔ اس زمانے میں مجھے ان سے روزانہ تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا تھا، جس سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں مسلمانوں سے دلی ہمدردی ہے''۔۸

﴿۳﴾

مراد یہ کہ شیخ عبدالقادر ابھی بیس سال کے ہی تھے کہ انہوں نے انگریزی اخبار ''پنجاب آبزرور'' میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے جلد ہی بعد انہوں نے اس اخبار کے سٹاف میں شرکت کر لی۔ ۱۸۹۵ء میں وہ باقاعدہ طور پر ''پنجاب آبزرور'' کے سٹاف ممبر تھے۔ یہاں پر انہوں نے بڑی محنت اور ذہانت کے ساتھ کام کیا اور اس قدر دلچسپی لی کہ انہیں اس اخبار کا چیف ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ ''پنجاب آبزرور'' کی صحافتی پالیسی بھی وہی تھی جو سر سید احمد خاں کی تحریک کی تھی۔ اس طرح چند ہی برسوں میں شیخ عبدالقادر کی نگرانی میں شائع ہونے والے اس پرچے نے صحیح طور پر سر سید احمد خاں کی تحاریک کا نمائندہ اور ترجمان بن کر دکھا

دیا تھا۔ اس پرچے کو بجا طور پر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور اس کے ارکان کا بھی بھرپور تعاون حاصل تھا''۔9

شیخ عبدالقادر ''پنجاب آبزرور'' سے تعلق کے بارے میں خود لکھتے ہیں:۔

''میری جوانی یہی محدود سرمایہ ساتھ لے کر زندگی کے عملی دور میں داخل ہوئی جو کام پہلے اختیار کیا وہ ایک انگریزی اخبار کی سب ایڈیٹری تھی، اس میں وقت بہت دینا پڑتا تھا اور تنخواہ قلیل تھی اس لیے

(کہ) یاراں فراموش کردند عشق

کا مضمون حسب حال تھا۔ یہ غنیمت تھا کہ اس کام میں دل لگتا تھا اور جسمانی اور دماغی کوفت کی تلافی اطمینان قلب سے ہوتی رہتی تھی۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں کچہری یا دفتر کے محرر کی طرح مزدورانہ طور پر قلم نہیں گھساتا تھا بلکہ قلم کے ہر رشحہ سے اپنے ملک یا قوم کی خدمت کر رہا ہوں۔ کسی کا خیال بدل رہا ہوں اور کسی کو گمراہی سے بچا رہا ہوں۔ یہ مشغلہ بجائے خود دلچسپ تھا اور جب میری سب ایڈیٹری ترقی کرتے کرتے ایڈیٹری سے بدل گئی تو اور بھی دلچسپ معلوم ہونے لگا مگر کبھی کبھی طبیعت میں بے چینی سی پیدا ہوتی تھی جو غالباً ہم راتو عمری کے سبب تھی، جو میرا سرمایہ جوانی تھا''۔10

ملاحظہ فرمایا آپ نے شیخ عبدالقادر میں خدمت ملک یا خدمت قوم کا اوائل جوانی میں کس قدر جذبہ تھا، کس قدر دلچسپی سے وہ اس فریضے کو سرانجام دیتے تھے، دل لگا کر کام کرتے تھے اگرچہ جسمانی اور دماغی کوفت تو کام کی زیادتی کی وجہ سے ہوتی تھی لیکن انہیں اطمینان قلب ملتا تھا، وہ آج کل کی طرح کچہری یا دفتر کے کلرک /محرر کی مانند جس کا منصب ڈیوٹی کے اوقات پورا کرنا ہوتا ہے، مزدورانہ قلم نہیں گھساتے تھے بلکہ قلم اور پھر قلم کی سیاہی کی حرمت ان کے پیش نظر تھی۔ وہ اپنے قلم کے ہر رشحہ سے ملک و قوم کی خدمت سرانجام دیتے تھے اور کسی کا خیال بدلتے تھے اور کسی کو گمراہی سے بچانے میں ممد و معاون ہوتے تھے۔ خدا ہمارے قلم کاروں کو بھی انہی سنہری اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

شیخ عبدالقادر پنجاب آبزرور سے تعلق خاطر اور خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور مقام پر لکھتے ہیں

''دس سال ہوئے میں کالج سے تازہ نکلا ہوا ایک طالب علم تھا جسے حوادث زمانہ نے جن میں باپ کا سر سے گزر جانا سب سے زیادہ سخت حادثہ تھا، کسی قدر مزا زندگی کی تکالیف کا چکھا دیا ہوا تھا اور آئندہ مراحل اور ان کی دشواریوں کے لیے ایک حد تک تیار کر دیا ہوا تھا۔ کچھ دنوں تلاش روزگار کی دقتوں سے سابقہ پڑا۔ یہاں کون ہے جو ان دقتوں سے آگاہ نہیں ہے یا مجھے آگاہ نہیں ہونا پڑے گا۔ اس کشمکش کے زمانہ میں کئی دفعہ امید کی جھلک نظر آئی اور میں نے اپنے آپ کو ایک والی نیو سوے فرمانروا کے مصاحبان خاص کی فہرست میں دیکھا اور کبھی یاس نے صورت دکھائی اور معلمی کی خدمت بھی ہاتھ میں آ کر نکل گئی۔ کبھی ابنائے زمانہ کی تقلید سے یہ ارادہ ہوا کہ سرکاری ملازمت کے لیے امتحان مقابلہ میں قسمت آزمائی کی جائے اور کبھی یہ خیال آیا کہ زمرۂ وکلاء میں نام لکھوا کر آزادی میں عمر بسر ہو۔ اس تذبذب میں ایک برس گزر گیا اور ملک کی بدقسمتی سے بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں ایک سے زیادہ برس اس طرح گزارنے پڑتے ہیں۔

اتنے میں مسلمانوں کو ایک انگریزی اخبار جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ ایک مرد خدا ایسا پیدا ہوا جس نے دریا دلی سے اس کے مصارف برداشت کرنے کا ذمہ لیا اور وہ کام کر دکھایا جس کے لیے عرصہ سے ایک قوم کی ہمت قاصر تھی۔ اس اخبار کے لیے ایک مسلمان خادم کی تلاش ہوئی جو اس کے ایڈیٹر کو جو ایک صاحب بہادر تھے، مدد دے اور بعد تجربہ ان کا کام ہاتھ میں لے سکے اور وہ خادم میں مقرر کیا گیا۔ میں اس کام کا اہل تھا یا نہیں اس سے اب بحث نہیں، قرعۂ فال میرے نام پڑا اور میں نے وہ خدمت اپنے ذمہ لے لی۔ ذاتی واقعات کی طرف اس اجمالی اشارہ سے مطلب صرف اتنا ہے کہ واضح ہو جائے کہ اپنی عمر کے گزشتہ نو سالوں میں جو اس قومی کارخانے میں گزرے ہیں، میرا قوم سے ایک رشتہ پیدا ہو گیا ہے، اس کے حالات سے ایک خاص واقفیت اور اس کے خیالات سے ایک خاص آگاہی ہو گئی ہے اور اس صیغہ میں ایسے مشاہدات کا موقعہ ملا ہے جو کسی اور زمانہ میں اس سے دگنے تگنے زمانے میں بھی نہ ملتا''۔11

﴿۴﴾

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ شیخ عبدالقادر سرسید احمد خاں کی تحریک کے ایک سرگرم رکن تھے اور پنجاب آبزرور اس تحریک کے نمائندہ اور ترجمان کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ سرسید احمد خاں سے یہ بات مخفی نہ تھی جب آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دسواں سالانہ اجلاس بمقام شاہ جہانپور (منعقدہ ۲۷ تا ۳۰ دسمبر ۱۸۹۵ء) میں ہوا تو اس اجلاس میں بنفس نفیس مسلمانوں کے ایک ایسے انگریزی پرچے کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی اور ''پنجاب آبزرور'' کی خدمات کے حوالے سے اس کی مساعی اور کارکردگی کو خراج تحسین پیش کیا۔ آپ نے حاضرین جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے خواجہ احد شاہ مالک اخبار پنجاب آبزرور کا شکریہ ادا کیے جانے کی قرارداد پیش کی:

''جناب صدر انجمن! سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ ہماری قوم کو ایک انگریزی اخبار کے جاری ہونے کی بڑی ضرورت ہے اور جو اخبار اس وقت تک جاری ہوئے ہیں، وہ ناکافی ہیں۔ لیکن بالفعل ایک اخبار پنجاب آبزرور ہے جو پنجاب سے جاری ہے اور جس کا اہتمام ہمارے عنایت فرما خواجہ احد شاہ صاحب نے اپنے ذمہ لیا ہے اور نہایت خوبی سے جاری ہوا ہے اور امید ہے کہ مسلمانوں کی قومی ضرورتوں کو پورا کرے گا۔ میں امید کرتا ہوں کہ ان کا شکریہ قوم کی طرف سے ادا کیا جاوے اور خدا سے دعا کی جائے کہ یہ اخبار مسلمانوں کے لیے مفید ہو اور اس کو روز افزوں ترقی ہو''۔

اس کے بعد سرسید احمد خان کے صاحبزادے آنریبل جسٹس سید محمود نے ''ووٹ آف تھینکس'' کے لیے قرارداد کی حمایت کرتے ہوئے فرمایا:

''میں اس تحریک کی نہایت صدق دل سے تائید کرتا ہوں۔ فی الحقیقت ''پنجاب آبزرور'' میں نہایت عمدہ مضامین اور صحیح اطلاعیں چھاپی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے قومی معاملات پر نہایت مدلل بحثیں شائع کی جاتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اخبار کم قیمت ہے اور اس کے مضامین بیش قیمت ہیں۔ اس لیے میں خواجہ احد شاہ صاحب کے لیے جو اس قومی اخبار کے مالک ہیں ''ووٹ آف تھینکس'' پاس کرنے کی تائید کرتا ہوں''۔

''ووٹ آف تھینکس'' باتفاق منظور ہوا اور خواجہ صاحب کا شکریہ ادا کیا گیا۔12

خوش قسمتی سے ہمیں پنجاب آبزرور کے متعلق شائع شدہ ایک اشتہار دستیاب ہوا ہے جو جناب غلام رسول بی اے مینجر اخبار مذکور کی جانب سے ماہنامہ مخزن میں چھپا تھا اور جس میں اخبار کے بارے میں بعض نہایت اہم اور بنیادی باتیں درج تھیں۔ اعلان مندرجہ ذیل تھا:

''آبزرور''۱۳ (لاہور): شمالی ہند میں مسلمانوں کی ملکی اور قومی اغراض کو حکام کی زبان میں حکام وقت تک پہنچانے کا یہی ایک ذریعہ ہے، ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ بہت سے اعلیٰ یورپین افسر اس کے خریداروں میں ہیں اور جو باتیں اس اخبار میں درج ہوں، یقیناً حکام کی نظر سے گزرتی ہیں۔ ترتیب مضامین یہ ہے:

صفحہ اول: تار کی خبریں، کوئی دلچسپ مختصر کہانی یا مضمون جو عموماً یورپین مضمون نگاروں کے قلم سے نکلا ہوا ہوتا ہے۔ اردو اخبارات کے ضروری مضامین کے ترجمے، معاصرین کی رائے کے خلاصے۔

صفحہ دوم: لیڈنگ آرٹیکل

صفحہ سوم: ایڈیٹوریل نوٹ

صفحہ چہارم: ضروری ملکی خبریں اور خطوط وغیرہ

صفحہ پنجم: اسلامی دنیا کی خبریں، پنجاب کی خبریں، ممالک مغربی اور شمالی کی خبریں

صفحہ ششم: منتخبات۱۴

﴿۵﴾

پنجاب آبزرور کے پہلے باضابطہ ایڈیٹر شیخ عبدالقادر ہی تھے۔ اس دور میں اس اخبار میں جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں، میاں محمد شفیع، میاں فضل حسین اور میاں میری شاہ (گوجرہ) باقاعدگی سے لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں اس اخبار نے الیکٹرک پریس لگوالیا تھا اس طرح اس کی سرکولیشن اور طباعتی معیار میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک عرصہ تک اس اخبار کی پالیسی آزاد رہی۱۵۔

مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی امریکہ کے پروفیسر نارمن جرالڈ بیرئیر نے ''پنجاب میں صحافت'' کے عنوان کے تحت ایک رپورٹ مرتب کی جس میں ۱۸۸۰ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک پنجاب میں صحافتی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کیا۔ بعد میں یہ رپورٹ "Press in the Punjab" کے عنوان کے تحت ایشین سٹڈی سنٹر مشی گن سٹیٹ یونیورسٹی نے کتابی صورت میں شائع کی۔ آبزرور کے بارے میں رپورٹ مذکور میں تحریر ہے:

''رپورٹ متعلق بہ سال ہائے ۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۵ء، سرکولیشن: ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں تعداد اشاعت بارہ سو، ۱۹۰۲ء میں ایک ہزار اور ۱۹۰۳ء میں بھی ایک ہزار، پبلشر اور پرنٹر خواجہ احمد شاہ رئیس و سوداگر اور مالک پنجاب ٹریڈنگ کمپنی لودھیانہ نیز میونسپل کمشنر، ۱۹۰۲ء تک مینجر غلام رسول بی اے اور ۱۹۰۳ء میں موالا بخش مینجر بنے۔ ایڈیٹر شیخ عبدالقادر جو قبل ازیں اخبار مذکور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، ۱۹۰۵ء سے شیخ عبدالعزیز ایڈیٹر مقرر ہوئے جنہوں نے سات سال تک اسلامیہ کالج لاہور میں تدریسی خدمات بھی سرانجام دیں۔ آبزرور کی صحافتی پالیسی کے متعلق رپورٹ مذکور میں درج ہے:

"This paper is popular among the Muhammadans, and is disliked by the Hindus. It is a well conducted paper, influence good on the whole, though it has published some objectionable articles, influence good."۱۶

شیخ عبدالقادر خبروں کی اشاعت کے سلسلے میں میں بہت محتاط تھے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اخبار بے شک قدرے تاخیر سے چھپے، لیکن خبر غیر مستند اور غیر محقق شائع نہ ہو۔ ندوۃ العلما لکھنو جس کے وہ سرگرم رکن تھے، کے ساتویں سالانہ اجلاس کے دوران انہوں نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

''آپ کو اعتبار آئے تو کیونکر کہ میں جو خبر آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ صحیح اور بالکل مستند ہے۔ گو بظاہر آپ کو باور نہ آ سکے لیکن اول تو یہ اخبار پنجاب آبزرور جس سے مجھے گزشتہ پانچ سال سے تعلق ہے، حتی الوسع خبروں کے بارے میں بہت محتاط ہے اور خبر کا دیر سے چھپنا بہتر سمجھتا ہے اس لیے کہ جلدی میں غیر محقق خبر چھپ جائے البتہ رپورٹر کے بارے میں معذور ہے۔ نقل کفر، کفر نباشد''۱۷۔

شیخ عبدالقادر چونکہ خود اہل قلم تھے وہ قلم کی حرمت اور طاقت کے بارے میں اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر ملک کی بنیاد دو چیزوں پر ہوتی ہے ''اہل سیف'' اور ''اہل قلم''۔ ان کا خیال ہے:

''ہر ملک کی بنیاد اصل میں دو قوتوں پر ہوتی ہے اہل سیف اور اہل قلم اور باقی قوتیں ان کے تابع ہوتی ہیں ..... اہل قلم کا بیشتر حصہ امن و آزادی کی برکتوں کے اعتراف میں عموماً نغمہ سرا رہتا ہے ..... گو انہیں شکایت ہے کہ ان کے فن کی وہ قدر دانی نہیں ہوئی جو ان کا حق ہے۔ لوگوں کے سر اور لوگوں کی جانیں تو اہل سیف کے ہاتھوں میں ہیں مگر یہ کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ کامیاب اہل قلم کے ہاتھوں میں لوگوں کے دل ہیں اور اگر حکومت ..... رعایا کے دلوں پر حکومت کرنا چاہے تو اسے اہل قلم کو اپنا بنانا چاہیے بلکہ یہ کہ ان سے وہ کام نہیں لیا جاتا جس کے لیے وہ اس قدر موزوں ہیں۔ جو کچھ بن پڑتا ہے بے غرضانہ طور پر کر بھی رہے ہیں مگر ان کی جماعت گوش بر آواز بیٹھی ہے کہ ملک یا سرکار ان سے کوئی خاص خدمت لے''۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں۱۸

﴿۶﴾

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا گیا ہے کہ آبزرور میں مستقل اور باقاعدہ لکھنے والوں میں جسٹس شاہ دین ہمایوں، میاں محمد شفیع، میاں فضل حسین، میاں میری شاہ کے علاوہ علامہ اقبال بھی شامل تھے۔ میاں فضل حسین نے تو ایک مرتبہ شیخ عبدالقادر کی عدم موجودگی میں ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ نیز وہ ماہنامہ مخزن میں بھی لکھا کرتے تھے:

"He was a frequent contributer to the observer and once, when the editor of the paper was away to India, he edited it. He also

contributed to the Makhzan, a literary Magazine in Urdu."۱۹

علامہ اقبال جب کبھی کوئی لیکچر انگریزی زبان میں دیتے تھے تو اس بات کا اہتمام کیا جاتا کہ لیکچر مذکور آبزرور میں چھپے اور اس سے زیادہ سے زیادہ انگریزی داں طبقہ بھی مستفید ہو۔ اس ضمن میں ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' میں تحریر ہے:

''علامہ اقبال کی نظمیں انجمن کے سالانہ جلسوں کا ایک خصوصی فیچر بن چکی تھیں۔ آپ انجمن کے انتظامی معاملات میں بھی گہری دلچسپی لیتے اور حتی الوسع مقدور بھر خدمات انجام دیتے۔ بعض اوقات تو آپ نظموں کے علاوہ لیکچر بھی دیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جس سال نظم نہ پڑھتے اس بار لیکچر دیتے۔ آپ کے بعض لیکچر جو انجمن کی روداد وں میں چھپ کر چھپ گئے تھے، دستیاب ہو گئے ہیں، لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو انہوں نے انگریزی زبان میں دیے، کسی دوسرے آدمی نے ان کا ترجمہ کر کے حاضرین کو سنا دیا اور بعد میں وہ لیکچر آبزرور میں چھپ کر محفوظ ہو گئے چونکہ آبزرور کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہو سکا اس لیے علامہ اقبال کے وہ گراں بہا لیکچر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ انجمن حمایت اسلام کا چوبیسواں سالانہ جلسہ ۹ تا ۱۱/اپریل ۱۹۰۹ء منعقد ہوا۔ ایک اجلاس کی صدارت شیخ عبدالحق نے فرمائی۔ علامہ اقبال نے انگریزی زبان میں ایک فاضلانہ لیکچر دیا جو انگریزی اخبار آبزرور میں چھپ چکا ہے، اس کا اردو ترجمہ اگر مکمل ہو کر مل گیا تو کسی آئندہ اشاعت میں شامل کیا جائے گا''۔۲۰

علامہ اقبال کے انگریزی لیکچروں کا ترجمہ کبھی تو شیخ عبدالقادر سامعین کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے اور کبھی میاں فضل حسین ۲۱۔

اس امر کی وضاحت علامہ اقبال کے بعض خطوط سے بھی ہوتی ہے جو انہوں نے مس عطیہ فیضی کے نام تحریر فرمائے۔ ۹/اپریل ۱۹۰۹ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''کچھ دن ہوئے میں نے ایک لیکچر دیا تھا جس کا عنوان یہ تھا: ''بہ حیثیت ایک ضروری جزو کے سوسائٹی کے ارتقا میں مذہب کی کیا حیثیت ہے؟'' میں نے صرف تھوڑے سے نوٹ لکھے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کہ آیا کسی نے وہ باتیں قلم بند کی ہیں یا نہیں جو میں نے کہی تھیں۔ انجمن کا لیکچر انگریزی میں ہوگا۔ اس کا عنوان ہے ''اسلام کا اخلاقی اور سیاسی مطمح نظر'' اگر یہ چھپا تو میں اس کا ایک نسخہ آپ کو بھیج دوں گا۔

میں آبزرور کے ایڈیٹر سے کہہ دوں گا کہ وہ آپ کو آبزرور کی وہ کاپی بھیج دیں جس میں وہ لیکچر چھپے''۲۲۔

اور جب علامہ اقبال کا مذکورہ بالا لیکچر آبزرور میں چھپ گیا تو انہوں نے مس عطیہ فیضی کو ۱۷/اپریل ۱۹۰۹ء کے مکتوب میں تحریر فرمایا:

''آبزرور کے دو شمارے اس خط کے ہمراہ بھیجے جا رہے ہیں۔ مجھے امید ہے آپ انہیں دلچسپی سے پڑھیں گی''۔۲۳

علامہ اقبال بعض اوقات ضروری مسائل پر اظہار خیال کرتے تو اس وقت کے اخبارات کو مکتوب تحریر کیا کرتے تھے۔ آبزرور میں چھپنے والے ایک خط کا اقتباس دستیاب ہوا ہے جو ہدیہ قارئین ہے۔ یہ اقتباس ہمیں منشی نذر محمد صاحب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس لاہور کے مجموعہ کلام ''کلام نذر'' میں ملا ہے۔ منشی نذر محمد علامہ اقبال سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اس حقیقت کا ذکر ان کے کلام میں جا بجا ملتا ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال کے کلام پر تضمینیں بھی کہی ہیں۔ لکھتے ہیں:

''کچھ عرصہ ہوا ہے کہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم اے، پی ایچ ڈی نے جو فخر پنجاب شاعر باکمال ہیں ایک دوست کو خط میں لکھا تھا کہ ''شعر و سخن آرام کرسی پر بیٹھ کر مطالعہ کرنے کے لائق ہوتے ہیں۔ نثر لکھنے والے بہت کم ہیں۔ ایسے آدمیوں کی ضرورت نہیں جو محض خیال سے ہی وابستگی رکھیں بلکہ ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو کچھ کر کے دکھائیں''۔

میں نے ''آبزرور'' میں ان کی چٹھی پڑھی تھی۔ مذکورہ بالا اقتباس ان کی چٹھی کا بعینہٖ ترجمہ تو نہیں لیکن ان کے خیالات کا صحیح عکس ہے۔ میں نے شیخ صاحب کے اس خیال کو ان کے چند اشعار سے جب مقابلہ کیا، طبعاً جوش اٹھا اور جو نظم ذیل میں ''متروا'' کے ناظرین کے لیے ہدیہ کی تھی، اس کے لکھنے پر مجبور ہوا۔ شیخ صاحب کے وہ اشعار جن کی طرف میں نے ایما کیا ہے یہ ہیں:

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثل شانہ جس کا اثر — تیری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو
زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا — مری خاموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرف آرزو کا
اگرچہ ہوں گھر سے دور اقبالؔ ہوں نہ محزوں عزیز مرے — وطن سے فرقت مثال گوہر کمال ہے میر آبرو کا۲۴

القصہ: پنجاب میں صحافت کا مقام انہیں (شیخ عبدالقادر) نے متعین کیا۔ وہ ایک مقامی کالج میں پروفیسر تھے، لیکن یہ ملازمت ترک کر کے اخبار (آبزرور) کے مدیر ہو گئے اور کچھ عرصے بعد اس کی ادارت کا ملا انہیں کے سپرد کر دی گئی۔ انہوں نے عین اوائل جوانی میں لکھنے پڑھنے کا کام شروع کیا جو مرتے دم تک قائم رہا۲۵۔

شیخ عبدالقادر خود محنتی تھے اور صحافت کی اونچ نیچ سے واقف تھے۔ نیز انہیں جو رفقائے کار ملے وہ بھی نہ صرف خدمت قوم کے جوش و جذبہ سے سرشار تھے بلکہ فرض منصبی کو کما حقہ نبھانا جانتے تھے۔ شیخ عبدالقادر کو سب سے پہلے جو نائب مدیر ملے وہ شیخ عبدالعزیز تھے جنہوں نے ۱۸۹۹/۱۸۹۸ء میں پنجاب آبزرور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض سنبھالے۔ شیخ عبدالعزیز اس وقت بی۔اے پاس کر چکے تھے۔ اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے شیخ عبدالقادر لکھتے ہیں:

''بی۔اے پاس کرنے کے بعد پہلی خدمت جو شیخ عبدالعزیز نے اپنے ذمہ لی وہ اخبار پنجاب آبزرور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے تھی۔ غالباً ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء کا ذکر ہے جب اس خدمت پر انہیں مقرر کیا گیا۔ میں ان دنوں اس اخبار کا ایڈیٹر تھا اور اس وقت یہ مسلمانوں کا واحد قومی اخبار تھا جو انگریزی زبان میں شائع ہوتا تھا۔ شیخ عبدالعزیز انگریزی خوب لکھتے تھے۔ اخبار کے فرائض کے متعلق انہوں نے جلد اچھی مہارت بہم پہنچائی اور جب تک وہ اس کام پر رہے اور جب اس کے بعد وہ خود ایڈیٹر ہو گئے، ان کے مضامین اخبار کے پڑھنے والوں سے تحسین و آفرین حاصل کرتے تھے''۲۶۔

دوسرے قابل ذکر معاون جو شیخ عبدالقادر کو میسر آئے وہ جناب مولوی عبدالرشید چشتی تھے۔ انہوں نے نہ صرف آبزرور کے ذریعے سے ملک و قوم کی خدمت کی بلکہ وہ مخزن کے بھی مسلسل مضمون نگار تھے۔ آبزرور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور جسٹس میاں محمد شاہ دین کی قائم کردہ ایسوسی ایشن ''ینگ میز محمڈن ایسوسی ایشن'' کے سیکرٹری تھے۔ ان کی خدمات کا اعتراف

کرتے ہوئے شیخ عبدالقادر رقم طراز ہیں:

''شیخ عبدالعزیز جواب میری جگہ آبزرور کے ایڈیٹر ہیں، عبدالعزیز ایم اے جواب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ہیں، صادق علی خاں جو اب مخزن کے لگاتار معاون ہیں، ان میں سے تھے جن کی ملاقات وہاں ہوتی تھی۔ عبدالرشید چشتی مرحوم بعد میں ینگ مینز محمڈن ایسوی ایشن کے سیکرٹری رہے، آبزرور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور مخزن کے نہایت قابل قدر معاون تھے''۔۲۷

﴿۸﴾

شیخ عبدالقادر کو ہمیشہ قومی مفاد عزیز تھا۔ وہ قومی مصالح پر اپنے مفادات کو قربان کر دیتے تھے۔ ۱۹۰۱ء میں ضلع سیالکوٹ میں پلیگ پھیلا جس سے سینکڑوں قیمتی جانیں لقمۂ اجل بن گئیں۔ اس کے محرکات اور اس پر قابو پانے کے لیے انہوں نے پنجاب آبزرور کی ۸ مئی ۱۹۰۱ء کی اشاعت میں اپنے ''اداریے'' میں لکھا:

"Most often we do not wish to refer to any particular place - it is not the rules that gall the people so much as the way in which they are enforced. It must be confessed that the fault lies mostly with some of our own countrymen in subordinate official capacities, and it is their doings that are responsible for the bitter feeling, suspicions, misery and bloodshed that ensue the affrays that occur in consequence of the harsh enforcement of plague rules. We have been informed - and one's blood curdles as one listens to such information - that even in the very jaws of death some people think no evil too serious to be refrained from and all sorts of misdemeanours, from illegal exactions and extortions, to inhuman insults on the honours of families, may be observed in or about infected places. When ever any disturbances occur, we think inquiries as to their ringleaders may, with advantage, embrace investigation into the problem of plague riots with special reference to this latter head as well."۲۸

ملک میں رائج The code of criminal procedure کی رو سے سلطانی گواہ سے متعلق پیدا شدہ بعض مسائل پر کلکتہ کے اخبار Weekly Notes نے تبصرہ کیا۔ شیخ عبدالقادر نے ''سلطانی گواہ'' کی مشکلات، مسائل اور ان کے حل پر بحث کرتے ہوئے پنجاب آبزرور کے ۲۵ مئی ۱۹۰۱ء کے شمارے میں مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا:

"A very telling instance of the hardships to which crown witnesses are put through the indiscriminate, and some times oppressive, procedure of legal tribunals in summoning them to their presence is given by the Calcutta Weekly Notes, giving the paper an occasion to draw attention to the question as a whole referring to the statement of a witness in the Calcutta court of sessions, who had been brought down to town from a distance, that he and other witnesses had been starving for three days, the weekly characterises the law as unjust enough which requires poor people to come such long distances away from their homes and work; and adds that it is much worse to pay them only a rupee each altogether for the fortnight, they have been in attendance to drag on their existence. The code of criminal procedure makes it optional with the court to grant or refuse subsistence allowance; and witnesses belonging to the labouring classes are paid at the rate of 2 annas per-day, the rate being much lower than even the minimum wages in the country". The paper continues: "It goes without saying that this liberal scale makes no allowance for the fact that a labourer has also to support his wife and children, whom he has left behind at home, out of his daily wages. Then, as regards the traveling expenses of withesses, if there happens to be railway communication, he is entitled to the lowest class fare. If there is a waterway, he may get something as boat fare. But where he has to walk long distances, he gets nothing towards the expense of his journey. All this seems to us to be the result of "misguided economy" which only works oppression on the poor without benefiting the state in any manner. There is much scope for economy in other directions, and compensation to witnesses on a reasonable scale would not appreciably add to our financial difficulties".۲۹

﴿۹﴾

کانگرس کے قیام ۱۸۸۵ء سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ کانگرس ۱۸۸۵ء سے قیام پاکستان تک ہمیشہ اس بات کی دعویدار رہی کہ وہ بلاتخصیص مذہب تمام ہندوستانیوں کی نمائندگی کرتی ہے جبکہ سرسید احمد خان سے لے کر قائداعظم تک تمام زعما اس بے بنیاد دعوے کی سختی سے تردید کرتے رہے ہیں۳۰۔

۱۹۰۱ء میں کانگرس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں منعقد ہونے والا تھا۔ کانگرس کے پجاریوں نے حسب سابق مسلمانوں کو چکمہ دے کر اور بہلا پھسلا کر اور یہ بے بنیاد پروپیگنڈہ کر کے کہ کانگرس ''بلاتخصیص مذہب تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہے'' مسلمانوں کو اپنے نرغے میں پھانسنے کی کوشش کی تاکہ وہ کانگرس کے آئندہ اجلاس میں شریک ہوں۔ کانگرس کا یہ خیال خام تھا کہ عام پڑھے لکھے مسلمان اس کے جال میں پھنس جائیں گے کیونکہ مسلمانوں کو من الحیث قوم کانگرس سے کوئی علاقہ نہ تھا اور اگر کانگرس مٹھی بھر مسلمان حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے تو اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ البتہ بے ضمیر، مردہ دل اور کرائے

کے ٹٹو ہر ملک میں اور ہمیشہ رہے ہیں، جو سب سے زیادہ بولی دینے والے کے ہاتھوں اپنا ''تن، من دھن'' بیچ ڈالتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر نے ''کانگرس اور محمڈنز'' (Congress And Muhammadans) کے عنوان کے تحت آبزرور کے ۷/اگست ۱۹۰۱ء کے شمارے میں جو مقالہ افتتاحیہ لکھا، اس میں ان حالات وواقعات سے مسلمانوں کو خبردار کرتے ہوئے فرمایا:

"The Congress is to be held this year at Calcutta once more and preparations for it have already commenced. Efforts to secure Muhammadan members for the Congress have begun as usual, but the results may be safely prophesied. It is not at all likely that the propaganda would gain in strength so far as Mussalmans are concerned. The fact that Muhammadans as a body have nothing to do with the Congress is freely admitted by all sensible Congressmen, who are averse to making any desperate efforts to induce Mussalmans to join the movement. They know full well that getting a handful of Mussalmans in a meeting consisting of hundreds of delegates and thousands of visitors, to represent a community numbering millions of men, makes the movement ridiculous ..... In Calcutta as well as other important places the congress will fare just as it did at Lahore in 1893 and in 1900. It will secure a small number of honest but misguided adherents from among Muhammadans, a few malcontents thinking themselves inadequately honoured in their own community and seeking fictitious importance amongst a rival one and a number of hirelings always ready to sell themselves to the best bidder, going as easily to the Congress as to the Anti-Congress camp. There are some who hold independent views on most things and believe that Mussalmans should constantly represent their grievances to Government, if they are to secure anything from it, but even they are now inclining to the belief that even for this purpose exertions independent of the Congress are required".[۳۱]

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو سیاست سے علیحدہ رہنے اور اپنے آپ کو تعلیم کے لیے وقف کر دینے کا مشورہ دیا تھا۔ مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اس صائب مشورے پر عمل کیا، لیکن ان کی وفات (مارچ ۱۸۹۸ء) کے بعد حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آیا سرسید احمد خاں کے مشورے پر عمل جاری رکھیں یا اپنے لیے کوئی نیا لائحہ عمل تیار کریں۔

ادھر بال گنگا دھر تلک کی تحریکوں نے مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس شدید تر کر دیا۔ تلک نے اپنی تحریک کی بنیاد ابتدا ہی سے غیر مذاہب سے نفرت پر رکھی۔ تلک کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ اردو ہندی تنازعہ نے بھی مسلمانوں کو ایک سیاسی جماعت کی ضرورت کا احساس دلایا۔ ۱۹۰۰ء میں اردو کے خلاف انٹونی میکڈانل کے طرز عمل نے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ادھر اخبارات میں مضامین اور مراسلات کا ایک سلسلہ شروع ہوا جس میں مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی جماعت کے قیام پر زور دیا جانے لگا۔ اس سلسلے میں نواب اسمٰعیل خاں (پیسہ اخبار)، نواب محسن الملک (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ)، مولوی مہدی علی اور سید رضا علی (پائنیر) نے مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کے سلسلے میں مضامین لکھے۔ سید رضا علی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ''اب مسلمانوں کو کانگرس سے علیحدہ نہیں رہنا چاہیے''۔

مسلم اخبارات جن میں شفاء الملک، عصر جدید، قلقل، ذوالقرنین، العزیز اور اردوئے معلیٰ شامل تھے لیجسلیٹو کونسل اور دیگر جگہوں پر اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت کے قیام کی اہمیت کا احساس دلایا۔ سر فضل حسین نے انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسہ میں ایک سیاسی جماعت کے قیام کی طرف مسلمانوں کی توجہ دلائی۔

اگرچہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں صوبائی سطح پر مسلمانوں کی سیاسی انجمنیں مثلاً محمڈن پولیٹکل ایسوسی ایشن (یوپی)، پروونشل محمڈن ایسوسی ایشن آف ایسٹرن بنگال اور پنجاب مسلم لیگ موجود تھیں، لیکن ابھی تک مرکزی سطح پر کوئی جماعت قائم نہیں ہوئی تھی۔ بالآخر ۲۰۔۲۱/اکتوبر ۱۹۰۱ء کو لکھنو میں مسلمانوں کا ایک جلسہ نواب حامد علی خاں کی کوٹھی پر منعقد ہوا۔ نواب وقار الملک نے مسلمانوں کی تنزلی، سرکاری عہدوں میں ان کی روز بروز کمی، ان کے سیاسی حقوق پر حملوں اور مرکزی اور صوبائی کونسلوں میں ان کی محرومیوں کی نشان دہی کراتے ہوئے ایک سیاسی جماعت کے قیام کو ناگزیر بتلایا۔ چنانچہ پولیٹکل آرگنائزیشن Political Organisation کے نام سے ایک سیاسی جماعت کا قیام عمل میں آیا مگر اس جماعت کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی[۳۲]۔

۱۰

یہ بات قابل ذکر ہے کہ پنجاب آبزرور اس میدان میں پیچھے نہیں رہا۔ اس میں اداریوں کے علاوہ مضامین بھی شائع ہوتے رہے اور مسلمانوں کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرواتے رہے۔ لکھنؤ میں مسلمانوں کے جلسۂ عام سے قبل (جس کا اوپر ذکر ہوا ہے) ۵/اکتوبر ۱۹۰۱ء کو میاں محمد شفیع کا ایک مضمون بعنوان (Indian Mussalmans and Politics) پنجاب آبزرور میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے مسلمانوں کی پس ماندگی اور پیش آنے والی مشکلات ومسائل کا ذکر کرتے ہوئے ایک علیحدہ سیاسی انجمن کے قیام کا مطالبہ کیا۔ آبزرور نے مذکورہ بالا مضمون پر اظہار خیال کرتے ہوئے مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی جماعت کے محرکات بیان کیے بلکہ ان کے مسائل کا حل، نئی سیاسی تنظیم کے اہم مقاصد اور تنظیم کا نام بھی تجویز کیا۔ آبزرور میں چھپنے والا یہ تبصرہ اگرچہ طویل ہے لیکن چونکہ نادر و نایاب ہے اور ہمیں خوش قسمتی سے دوسری اہم تحریروں کے ساتھ دستیاب ہوا ہے اس لیے اسے افادۂ عام کی خاطر پیش کر رہے ہیں۔

"Two of the principal questions agitated by the Congress in fact, really and strictly speaking, the two real causes of its existence — are (a) the introduction of representative elective element into the Indian Legislative Councils and (b) the recruiting for all departments of public service, by means of open competition in India. Now these are two great barriers which prevent the Mussalmans from taking a share

further the attitude of indifference which has hitherto been the characteristic feature of our political policy. The desire for a political organization has arisen amongst a considerable portion of our people and is, on the whole, an increasing one. Let us lead this new current into proper channels now, lest it should, in the end, get too strong to be managed and our very inaction be the cause of its drifting towards the National Congress. Such a result is one devoutly to be avoided as the Congress principles ignore the interests of the minorities and its methods of working retain within it suspicion of mischief. We would therefore, be false to our sentiments of loyaltly towards our great rulers as well as false to ourselves if we were not, so to speak, to take the bull by the horn and to control and guide the political current which, we find, has been set in motion amongst our co-religionists by the exigencies of the times.

"As to the aims which this political institution of ours should keep before its eyes and to the achievement of which its energies should be devoted there can be no two opinions. To maintain and strengthen the existing feeling of loyalty towards the British Raj amongst the Mussalmans of India and to protect and promote their political interests will, no doubt, be the two great objects of its existence, when it has assumed a definite shape.

"As regards its constitution, we are of opinion that its foundation ground should be of the form of the M.A.O. Defence Association of old, improved upon and altered in order to meet present wants and to carry strength and weight. And we venture to suggest that some such plan as we now proceed to sketch should be adopted. Every large Indian town should have a political association to consist of as large a number of its leading Muhammadan inhabitants as well as those of its surrounding ilaqa as possible with the usual compliment of office-bearers and Executive Committees, & c. Over and above, these each province should have a Provincial Council to consist of the leading members of the head-quarters association and either the Presidents and Secretaries, ex-officio, of all the Mofassil Anjumans affiliated to the Council or a certain number of representative in that political movement. The Congress resolutions qua thest two great aims of its supporters make no allowance whatever for the backward condition of the Indian minorities. A general system of election and competition without any regard to the interests of the Mussalmans would - as has been amply demonstrated by hard experience --- result in our co-religionists being placed at serious disadvantage in Boards, Councils and the public service. If the congress leaders are sincere in their professions of good faith towards the Mussalmans, let them modify their resolutions with regard to these two important matters, so as to give to the Mussalmans their due share on representative governing bodies as well as in the public service.

"These are some of the reasons which lead us to the conclusion that, under the existing circumstances, we cannot join the congress camp and we must therefore have a political organization of our own".

"Having discussed some of the main reasons why we consider it, under the existing circumstances, impossible for our co-religionists to join hands with the Congress, we proceed now to state what, in our judgment, the principal features of our national political organization ought to be. Of the necessity of starting a political organization of our own, there can, we venture to think, be no reasonable doubt in the minds of all intelligent readers. We have already given, as briefly as possible, some of the chief reasons which have led us to form this opinion in this respect. We have pointed out that there are various important political problems which call for action at our hands, that if it was considered essential to start the M.A.O. DEFENCE association during the lifetime of Sir Syed Ahmed Khan, his death itself coupled with other changes of circumstances and the birth of new political problems have made it of paramount importance for the Mussalmans to have a proper organization of their own in order to ventilate their feeling and represent their needs in the most constitutional way possible. There is another reason why we condider such a step an essential one - a reason on which we desire to lay a great deal of stress. After a careful study of the political mind of our co-religionists during the last five years, we consider it absolutely unsafe to prolong any

Provincial or National or both as may be considered necessary, by means of respectfully written re-presentations, open agitation or the holding of Annual Political Congresses being avoided. On questions of exceptional difficulty or national importance arising the National Council shall, however, have the power, after taking the opinion of the various Provincial Councils, of summoning a General Conference of the Mussalmans of India in order to discuss such questions.

"There can be obsolutely no objection, either theoretical or practival, against our starting a political organization with the aims and methods of working such as the above. If Principal Theodore Morison or any one else, no matter who he may be, is doubtful of the advisability of founding such a loyal, representative and effective organization as suggested above, the writer of these articles, who bows to none either in his deep-felt loyalty towards the British crown or his sincere advocacy of interests of his co-religionists, is, for one, convinced that the existence of such an organization will be a source of strength to the Empire and of infinite usefulness to our community. It is a most workable scheme, simple and not in the least costly of maintenance. And if any of our readers were to ask what name are we to give to this National Organization, we would suggest that any of the following names could be most suitable:

The Muhammadan Patriotic League

OR

The Indian Muslim Patriotic League"[۳۳]

مذکورہ بالا اور ایسے متعدد اداراتی نوٹس ہمارے پاس موجود ہیں جو ہمیں شیخ عبدالقادر پر ریسرچ کے دوران دستیاب ہوئے۔
ہم طوالت کے خوف سے وہ اداراتی نوٹس کسی اور موقع کے لیے "محفوظ" رکھتے ہیں البتہ ان کا موضوع عرض کیے دیتے ہیں:

The Mail Dispute in Turkey (18th May, 1901); Bishop Weldon on Native Religion (10th July, 1901); The Caliphate (7th September, 1901); Viceroy's Inaugural Address at the Educational Conference (14th September, 1901); The Coming Madras Muhammadan Educational Conference (18th September, 1901); The Hedjaz Railway (28th September, 1901); The Late Amir Abdur Rehman of Afghanistan (12th October,1901); Commissions in Civil Suits (19th October, 1901); Government and the National Congress (22nd April, 1903); Kashmir

gentlemen to be elected by such associations to represent them on the council. For facility of working, the Provincial Council should have an Executive Committee consisting of representative Muhammadan gentlemen nominated by the Council who should be residing either at the head-quarters or within easy reach of the Provincial Capital. Over and above, these Provincial Councils there should be a National Council to consist of a definite number of gentlemen to represent each province who should be elected by their respective Provincial Council, the President and the Secretary of each Council to be amongst them. The National Council so constituted will elect its own President and Secretary and should ordinarily meet once a year at the town where the Educational Conference sittings may be held. The election to the National and Provincial Council should be a periodical one. A net-work of representative bodies such as the one sketched above will be regarded by every one as a truly representative organization of the Muhammadan community in India and will, in consequence, carry proper weight and prestige.

As regards its method of working. All matters of town-politics will, of course be within the sole cognizance of each Association or Anjuman, unless it deems fit to consult the Provincial Council in the matter before it. All questions of purely provincial importance should be within the exclusive jurisdiction of the Provincial Council which should have the power, whenever necessary, to invite the opinion of the National Council on such important questions as it may consider essential. The Provincial Council may be moved in any matter either by any of its members or by any of the Associations attached to it. Finally, it will be for the National Council to consider and decide upon all matters of general national importance to which its attention may be drawn either by any one or more of its members or by any of the Provincial Councils.

"The Anjumans and Councils, will, without doubt, have to discuss and take action on a variety of matters. Some of these will be matters which it will be necessary to bring to the notice of Government. This should ordinarily be done by the Councils,

And Its Friends (24th June, 1903); France and England (11th July, 1903); Muhammadans, Hindus and the Congress (22nd July, 1903); Mr. Brodrick's Scheme of Military Expenditure (29th July, 1903); Lord Curzon's Extension (25th July, 1903); The King in Ireland (5th August, 1903); Lord Curzon's Extension of office (5th August, 1903); Muhammadan Loyalty and the Indian Army (19th August, 1903); The Postmaster Generalship, Punjab (22nd August, 1903); The Official Secrets Bill (9th December, 1903); Retired Indian Civilians as Critics of the Government of India (16th March, 1904); The Report of the Police Commission (25th May, 1904); The Public Services and the Natives of India (22nd June, 1904)۔[۳۴]

اپریل ۱۹۰۱ء میں ماہنامہ مخزن کا اجرا ہوا۔ شیخ عبدالقادر اپریل ۱۹۰۱ء سے آبزرور کے ساتھ ساتھ مخزن کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے۔ آبزرور کے لیے تو انہوں نے شیخ عبدالعزیز کی خدمات بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر حاصل کر لی تھیں اور دونوں اخبار اور رسالے کی اشاعت کا کام بخیر و خوبی چل رہا تھا۔ 1903ء کے وسط میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور فن اخبار نویسی کی تکمیل کے لیے انگلستان جانے کا پروگرام بنایا، لیکن ان کی دلی خواہش تھی کہ اخبار اور رسالے کی اشاعت جاری رہنے کے انتظامات ہو جائیں تو وہ روانہ سفر ہوں۔ اس پروگرام کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام اپنے ۹ر جولائی ۱۹۰۳ء کے مکتوب میں تحریر فرمایا:

''میں ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی دو مہینے کے اندر سفر انگلستان کا عازم ہوں اور وہاں مقصد قیام تکمیل فن اخبار نویسی ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور چیز بھی حاصل کرنے کا موقع مل جائے تو وہ بھی فتوحات بالائی میں سمجھ کر حاصل کر لی جائے گی۔ اس لیے اس عزم سے آپ کو مطلع کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ آپ ان چیدہ بزرگان قوم میں ہیں جن سے مجھے گونیاز دیرینہ نہیں مگر تھوڑے ہی دنوں میں تعلق گہرا ہو گیا ہے۔ فالحمد للہ علی ذالک۔ آپ سے درخواست گار دعا ہوں کہ خدا مجھے اس کام میں برکت دے اور توفیق عطا فرمائے کہ واپس آ کر پھر کچھ خدمت اس کے بندوں کی کر سکوں''۔[۳۵]

مولانا موصوف کے نام ایک دوسرے مکتوب محررہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۳ء میں ذرا تفصیل سے سفر انگلستان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''ہو سکا تو فن تقریر آپ کی خاطر ذرا باقاعدہ سیکھ آؤں گا تا کہ فغان میں تاثیر زیادہ ہو جائے آپ دعا میں یاد فرمایا کیجئے گا یہ میرے حق میں خاصی دولت ہوگی۔ میں خدا سے چاہتا ہوں کہ انگلستان کی سیر اور وہاں سے قیام کا مجھ پر وہ اثر پڑے جس کی آپ نے آرزو فرمائی ہے اور اگر کوئی برا اثر پڑتا ہو تو میں جا ہی نہ سکوں۔

مزید آنکہ جو استفسار آپ نے دربارۂ آبزرور فرمایا ہے اس میں ابھی قدرے متذبذب ہوں مگر امید ہے کہ عنقریب آپ کو اطلاع دے سکوں گا کہ خاطر خواہ انتظام ہو گیا ہے۔ ایک نظر محمد حیات پر

دوسرے شاہ دین صاحب ہیں۔ اس بارے میں خواجہ احمد شاہ سے خط و کتابت کر رہے ہیں۔ اس بات کی خاص احتیاط سوچی گئی ہے کہ اعتدال میں فرق نہ آئے جو انگریز ہمارے ہاں پہلے تھا اس کی نگرانی دوبارہ قائم کرنے کی تجویز ہو رہی ہے۔ میں اس بارے میں خصوصیت سے کوشش کر رہا ہوں کہ میری غیر حاضری میں آبزرور کے کام میں کوئی حرج نہ ہو۔ ممکن ہوا تو وہاں سے بھی کچھ اس کی خدمات کرتا رہوں گا''۔[۳۶]

شیخ عبدالقادر کی محنت اور خلوص نیت رنگ لائی اور آبزرور کے جاری رہنے کا بہت عمدہ بندوبست ہو گیا۔ سابق انگریز ایڈیٹر مسٹر والس سے مضامین کے حصول کے لیے بات چیت ہو گئی اور شیخ عبدالعزیز سابق اسسٹنٹ ایڈیٹر نے آبزرور کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنا منظور کر لیا۔ نیز یہ طے پایا کہ شیخ عبدالقادر قیام انگلستان کے دوران آبزرور کے لیے ایک خط اور ایک مضمون ارسال کیا کریں گے۔ چنانچہ ان سب انتظامات کے بعد شیخ عبدالقادر عازم سفر انگلستان ہوئے۔ مولوی بشیر الدین کے نام میسرز تھامس کک لندن کی معرفت انہوں نے ۲۶ جولائی ۱۹۰۴ء کو ایک مکتوب تحریر کیا جس میں ان امور کی نشان دہی فرمائی۔ انہوں نے لکھا:

''آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ خدا کے فضل سے آبزرور کے جاری رہنے کا عمدہ بندوبست ہو گیا ہے۔ گزشتہ سال میرے رک جانے کا یہی سبب تھا اور اب تسلی ہو گئی ہو تو چلا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں ہمہ وجوہ بہ نسبت سابق رونق ہو گی نہ کہ کمی۔ ٹائپ اب نیا آیا ہے۔ ترتیب مضامین میں کچھ جدت کی گئی ہے۔ ہمارے پرانے ایڈیٹر مسٹر والس سے مضامین میں مدد لی گئی ہے اور خدمت ایڈیٹری شیخ عبدالعزیز بی اے کے سپرد ہوئی ہے جو پانچ سال میرے ساتھ اسسٹنٹ ایڈیٹری کا کام کر چکے ہیں اور پورا تجربہ اور قابلیت رکھتے ہیں۔ مجھ سے یہ انتظام ہوا ہے کہ میں ہفتہ وار ایک خط اور ایک مضمون آبزرور کے لیے لکھتا رہوں جس کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ آپ کسی مختصر نوٹ میں اس امر کا تذکرہ کر دیں گے تا کہ قدر دانوں کو اطمینان ہو جائے''۔[۳۷]

مذکورہ بالا خط میں شیخ عبدالقادر نے تحریر فرمایا تھا کہ وہ لندن سے آبزرور کے لیے ہفتہ وار ایک مکتوب اور ایک مضمون ارسال کیا کریں گے۔ ہمیں تادم تحریر کوئی مضمون تو دستیاب نہیں ہو سکا البتہ ان کا تحریر کردہ ایک خط ملا ہے جس کا عنوان ''پیاری اور متبرک یادگاریں'' ہے۔ یہ خط انہوں نے احمد بابا مخدومی مدیر ماہوار رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے نام تحریر کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اسے حمایت اسلام میں بھی شائع کریں اور اس کے ذریعے سے یہ نیک تحریک پیش کریں کہ وہ والدین اپنے ان بچوں کا حصہ جو دنیاوی نعمتوں کو لات مار کر اس منزل کو سرعت سے طے کر گئے ہیں، قوم کے یتیم خانوں کو دیں اور اس طرح رضائے الٰہی کے جویاں ہوں اور اس کی مشیت پر صابر و شاکر ہوں''۔

شیخ عبدالقادر نے لکھا:

''چند روز ہوئے مجھے لندن کے قریب ایک مقام (بارکنگ سائیڈ) دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں ایک عیسائی ڈاکٹر کی کوشش سے ایک لڑکیوں کا یتیم خانہ قائم ہے جس میں بارہ سو لڑکیاں پرورش پا رہی ہیں۔ ان کے طریق تربیت وغیرہ کے متعلق میں نے گزشتہ ہفتے ایک مضمون آبزرور میں لکھا ہے۔ اس کی تفصیل یا خلاصہ اگر آپ چاہیں اخبار مذکور سے لے سکتے ہیں۔ لیکن ایک بات جو میں نے دانستہ اس مضمون میں نہیں لکھی اور جسے میں نے آپ کے رسالے کے ذریعے برادران اسلام تک پہنچانا زیادہ ضروری سمجھا وہ

یہ ہے کہ اس یتیم خانہ کے پُر فضا باغ کے چاروں طرف جو جھونپڑیاں بنی ہیں اور جنہیں ہندوستان میں بنگلے کہنا زیادہ موزوں ہوگا، ان میں سے کئی بنگلے بعض نیک دل اور صاحب مقدر لوگوں نے اپنے کسی مرحوم بچے کی یادگار میں بنائے ہیں۔ ایک ایک بنگلہ دس بارہ ہزار روپیہ کی لاگت کا ہے۔ ہمارے لاہور کے اسلامی یتیم خانہ کو مسلمانان پنجاب بالخصوص اور مسلمانان ہند بالعموم بڑی ہمت اور خوش عقیدتی سے مدد دیتے ہیں خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے مگر اب تک کوئی مثال ایسی قائم نہیں ہوئی کہ کسی اہل دل نے مسلمان یتیم بچوں کی پرورش کے لیے مکان یا مکان کا کوئی حصہ بنا دینے سے اپنے دل ریش کی مرہم تلاش کی ہو۔ مجھے یہ ترکیب بہت ہی عمدہ معلوم ہوئی اور خیال آیا کہ اگر ایسے والدین کو جنہیں اولاد کا صدمہ پہنچا ہو اور جنہیں حقیقت میں ان کا کوئی پیارا بچہ داغ دے گیا ہو، اس کی یادگار قائم کرنے کا شوق ہو تو ایسے خیر جاری سے بہتر اس یادگار کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ ایسی یادگار نہ صرف پیاری بلکہ میرے نزدیک متبرک ہوگی اور ایسی یادگار بنانے والے نہ صرف اپنے دل کی جلن کو کسی قدر ٹھنڈا کریں گے اور اسے اپنے زخموں کے مرہم بنائیں گے بلکہ خدائے کریم کی خوشنودی کی خلعت حاصل کریں گے۔

خواہی کہ خدائے برتو بخشد
با خلق خدائے کن نکوئی ۳۸

۱۱

شیخ عبدالقادر نے قیام یورپ کے دوران ۲۸ جولائی سے لے کر ۲۳/ اکتوبر ۱۹۰۶ء تک ترکی کا سفر کیا۔ یہ نادر روزگار سفرنامہ ''مقام خلافت'' کے نام سے ۱۹۰۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ چونکہ اپنی نوعیت کا یہ پہلا سفرنامہ تھا، اس لیے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اخبارات اور رسائل نے اس کے بارے میں اظہار خیال کیا۔ اخبار آبزرور نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''تین سو صفحوں کی اس خوبصورت کتاب میں جو نہایت قیمتی کاغذ پر چھپی ہے اور جس میں چھبیس دلکش تصویریں ہیں، شیخ عبدالقادر صاحب نے استنبول کے تمام مشہور مناظر و مقامات کی تفصیل لکھی ہے اور ترکوں کی سوشل، پولیٹیکل اور اقتصادی، ہر قسم کی حالت کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ اور تصاویر سے ہر شخص کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ تو اس مقام خلافت کو اپنی آنکھوں سے میں بھی دیکھ لوں۔ کتاب کی ہیئت مجموعی بہت مفید ہے اس کے مطالعہ کے لیے ہر مسلمان سے ہم نہایت شدومد سے سفارش کرتے ہیں۔ صورت ظاہری بھی ایسی ہی خوشنما اور دلکش ہے جیسی معنوی طور پر یہ کتاب دلچسپ اور مفید ہے۔ جس اہتمام اور محنت سے یہ کتاب مقام خلافت تیار ہوئی ہے، قیمت۔ کچھ گراں نہیں ہے''۔ ۳۹

شیخ عبدالقادر جون ۱۹۰۴ء میں فن اخبار نویسی کی تکمیل اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان تشریف لے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں شیخ عبدالعزیز آبزرور کے ایڈیٹر کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ شیخ عبدالعزیز بقول شیخ عبدالقادر ''فن اخبار نویسی کا تجربہ اور قابلیت رکھتے تھے''۔ شملہ وفد جو دراصل مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا نتیجہ تھا اور اسی وفد نے مسلمانوں کے لیے ''جداگانہ طریق انتخاب'' کا مطالبہ کر کے پاکستان کی بنیاد رکھ دی ۴۰ کی لارڈ منٹو سے ملاقات اور موصوف کی مسلمانوں کے مطالبات سننے کے بعد یاد دہانی کے باوجود مسلم پریس نے تبصرہ کیا۔ اور جداگانہ طریق انتخاب کے ضمن میں جان مورلے، سیکرٹری آف سٹیٹ کے طرز عمل پر تنقید کی۔ اس موقع پر پنجاب پریس نے جس میں آبزرور، پیسہ اخبار، زمیندار اور وطن شامل تھے، حکومت کے خلاف کھل کر لکھا۔ شیخ محمد اکرام اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"The battle of the separate Electorates had not been finally won with the reassuring reply of the Viceroy at Simla. Morley, the liberal Secretary of State, favoured a scheme by which the provision for separate Electorates was completely watered down. Muslim opinion in India was hostile. In particular, the punjab press, The Observer, Paisa Akhbar, Zamindar and Watan --- carried on a vigorous campaign against the proposed modifications."۴۱

جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ گورنر جنرل لارڈ منٹو نے مسلمانوں کے مطالبات سننے کے بعد یقین دلایا کہ حکومت ان کے مطالبات پر ہمدردی سے غور کرے گی۔ لارڈ منٹو نے کہا:

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک میرا تعلق اس ملک کے انتظامی امور سے ہے، مسلمانان ہند مطمئن رہ سکتے ہیں۔ ان کے قومی حقوق و مفاد کا پورا لحاظ رکھوں گا''۔ ۴۲

آبزرور نے اس ''لفظی طفل تسلی'' پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے اداریتی نوٹ میں لکھا:

"While appreciating the historical reforms in Minto's speech regretted that 'habitual political reserve in speech mastered the Viceroy so far as not to allow him to give us a better reply"۴۳

جداگانہ طریق انتخاب کے بارے میں جن ہندوستانی مسلمانوں کا نقطہ نظر اس کے برعکس تھا، یعنی وہ اس طریق انتخاب کے حامی نہ تھے، آبزرور نے ان پر کڑی تنقید کی:

"The reaction of the Indian Muslims towards the scheme of Electoral college was extremely adverse. The Observer characterised the scheme, as a "FLAGRANT VIOLATION" of an agreed principle and a "WEAK CONCESSION TO AGITATORS' which betrayed the hope of the "Loyal and less demonstractive classes of the people"۴۴

آل انڈیا مسلم لیگ کا جو اجلاس ۳۰ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۰۸ء کو امرتسر میں سید علی امام کی صدارت میں منعقد ہوا، اس میں استقبالیہ کمیٹی کے صدر خواجہ یوسف شاہ تھے۔ اس اجلاس میں آبزرور اخبار کے مالک خواجہ احد شاہ نے بھی شرکت کی۔ اجلاس مذکور میں جب Reform Scheme کے سلسلے میں گورنر جنرل لارڈ منٹو اور سیکرٹری آف سٹیٹ جان مورلے کے ''شکریے'' کے لیے قرارداد پیش کی گئی تو خواجہ احد اس قرارداد کے بالکل حق میں نہ تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ یہ قرارداد سرے سے پیش ہی نہ کی جائے۔ اس ضمن میں آبزرور نے لکھا:

"Khawaja Ahad Shah, proprietor of the observer, even proposed to suspend the resolution of thanks altogether till such time "when the scheme was modified in accordance with the Mohammadan

Wishes."۴۵

سید علی امام جنہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۳۰ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۰۸ء کی صدارت کی تھی، انہوں نے بہار کانفرنس میں مسلمانوں کے مفادات کے خلاف زہر اگلا اور جداگانہ طریق انتخاب کے برعکس خیالات کا اظہار کیا، آبزرور لاہور نے اس بات کا سختی سے نوٹس لیا اور انہیں ''مسلم مفادات سے غداری'' سے تعبیر کیا۔

"Ali Imam was later charged with "Betrayal of Muhammadan interests" by the Observer of Lahore"۴۶

"The Observer of Lahore considered Ali Imam's performance at the Bihar Conference a "Betrayal of Muslim interests" and declared that any Muslim who opposed the demand for exclusive "Separate Electorates" for the Muslims voiced "no views but his own and is a traitor to the national cause"۴۷

مختصر یہ کہ شیخ عبدالعزیز نے آبزرور کے ایڈیٹر کی حیثیت سے گیارہ سال (۱۹۰۳ء تا ۱۹۱۴ء) تک خدمات انجام دیں اور ہمیشہ مسلم مفاد کو پیش نظر رکھا اور مسلمانان برصغیر کی خواہشات کی ترجمانی کی۔ شیخ عبدالعزیز کے بعد ملک برکت علی نے یہ عہدہ جلیلہ سنبھال لیا اور ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک آبزرور کے ایڈیٹر رہے۔۴۸

آبزرور کے مالک خواجہ احد شاہ منٹو مارلے اسکیم کے تحت ۱۹۱۰ء میں مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور نو سال تک خدمات انجام دیں۔ ایک عرصے تک آبزرور کی پالیسی آزاد رہی لیکن بعد میں اس کی پالیسی پر کانگریس اور کانگری رہنماؤں نے اثر انداز ہونا شروع کر دیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب پنجاب میں مارشل لاء کا نفاذ ہوا تو حکومت نے پریس ضبط کر لیا اور اخبار کو بند کر دیا۔۴۹

شیخ عبدالعزیز اور ملک برکت علی کی ادارت میں آبزرور میں شائع ہونے والے بعض مضامین کی فہرست دستیاب ہوئی ہے، ہم افادہ عام کی خاطر اسے پیش کر رہے ہیں۔ ان تمام مضامین کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ سے ہے اور مضمون نگار مشہور و معروف شخصیات ہیں:

- Muhammadans and the Bombay Government, by Maulvi Rafi ud din Ahmad (Speech)
  Observer: 6th July, 1910.
- Syed Amir Ali on the Muslim League.
  Observer: 24th December,1913
- The All India Muslim, by Mohammad Yusuf Khan,
  Observer: 2nd February, 1916.
- The Muslim University Editorial,
  Observer; 2nd Febuary, 1916.
- An Open Letter From Aftab Ahmad Khan to Members of the Muslim University Association
  Observer: 5th February, 1916.۵۰

حواشی

۱. Modern Muslim India and The Birth of Pakistan, by S.M. Ikram, Lahore, Sh. Muhammad Ashraf, 2nd. Rev. Ed. 1970. p 204.

۲. The Punjab Press, 1880-1905, By N.Gerald Barrier, University of Missouri, Columbia, 1970. P.101.

۳. ماڈرن مسلم انڈیا (حوالہ مذکور) صفحہ ۲۰۴

۴. حوالہ مذکور صفحہ ۲۰۴

۵. The New School of Urdu Literature یہ کتاب پہلی بار ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی۔ دوسرا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء میں شیخ مبارک علی لاہور نے شائع کیا۔ یہ چھ انگریزی مقالات کا مجموعہ ہے اور آج کل نایاب ہے۔

۶. جسٹس میاں محمد شاہ دین ہمایوں باغبانپورہ لاہور کی معروف میاں فیملی سے تھے۔ ۱۸۶۸ء میں ولادت ہوئی۔ ۱۸۸۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا۔ انگلستان اعلیٰ تعلیم کے لیے تشریف لے گئے۔ سب سے پہلے پنجابی مسلمان تھے جو انگلستان گئے۔ ۱۰ نومبر ۱۸۸۹ء کو لندن میں انجمن اسلامیہ لندن کی بنیاد رکھی جس میں سر عبدالرحیم نے آپ سے تعاون کیا۔ لندن میں اپنی نوعیت کی پہلی مسلم تنظیم تھی۔ میاں شاہ دین اس کے نائب صدر چنے گئے۔ ۱۸۹۱ء میں ینگ مینز محمڈن ایسوسی ایشن لاہور قائم کی۔ نومبر ۱۹۰۷ء میں پنجاب مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو اس کے صدر منتخب ہوئے لیکن جب پنجاب چیف کورٹ لاہور کے جج بنے تو استعفیٰ دے دیا۔ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی دوبارہ صدارت کی۔ آپ نے ۲ جولائی ۱۹۱۸ء میں انتقال کیا (بحوالہ ماڈرن مسلم انڈیا صفحہ ۲۰۸)

۷. ماہنامہ حمایت اسلام لاہور (میاں محمد شفیع نمبر) ۱۴ جنوری ۱۹۳۴ء، جلد نمبر ۷ نمبر ۲

۸. حوالہ مذکور

۹. اکابرین تحریک پاکستان مولفہ محمد علی چراغ، لاہور۔ سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء، صفحہ ۲۱۵

۱۰. مقالات عبدالقادر مرتبہ محمد حنیف شاہد، لاہور۔ مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء، صفحہ ۳۰۔۳۹

۱۱. معائب دوست (مضمون) از شیخ عبدالقادر مطبوعہ روداد انجمن حمایت اسلام لاہور، انیسواں سالانہ جلسہ منعقدہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۴ء، صفحہ ۳۶ تا ۴۷

۱۲. محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۹۶ء، صفحہ ۱۳۲ تا ۱۳۳

۱۳. آغاز سے لے کر جون ۱۹۰۱ء تک پنجاب آبزرور کے نام سے چھپتا رہا۔ جولائی ۱۹۰۱ء میں اس کا نام تبدیل ہو گیا اور صرف آبزرور لاہور کے نام سے شائع ہوتا رہا۔

۱۴. ماہنامہ مخزن جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۴ جولائی ۱۹۰۱ء، صفحہ آخر

۱۵. ماڈرن مسلم انڈیا مولفہ شیخ محمد اکرام، صفحہ ۲۰۴ تا ۲۰۵

۱۶. The Punjab Press; 1880-1905, by N.G. Barrier, p.101

۱۷. روداد ندوۃ العلما لکھنو ساتواں سالانہ جلسہ منعقدہ ۴ تا ۶ نومبر ۱۹۰۰ء، مطبوعہ کانپور محمود المطابع، صفحہ ۵۸

۱۸. انتخاب مخزن حصہ سوم: مضامین شیخ عبدالقادر، لاہور، شیخ مبارک علی، س ن صفحہ ۱۰۵ تا ۱۰۶

۱۹. Dictionary of National Biography, ed. by S.P. Sen. calcutta, Institute of Historical Studies, 1973. Vol.2, page2

۲۰۔ اقبال اور انجمن حمایت اسلام، از محمد حنیف شاہد، لاہور۔ انجمن حمایت اسلام ۱۹۷۶ء، صفحہ ۹۳ تا ۹۴

۲۱۔ حوالہ مذکور، صفحہ ۹۳

۲۲۔ اقبال از عطیہ فیضی مترجمہ ضیاء الدین احمد برنی، کراچی، اقبال اکادمی، ۱۹۶۹ء، صفحہ ۳۶

۲۳۔ حوالہ مذکور، صفحہ ۵۴

۲۴۔ کلام نذر یعنی مجموعہ کلام منشی نذر محمد۔ لاہور، حمیدیہ سٹیم پریس ۱۹۱۲ء، صفحہ ۳۰

۲۵۔ نقوش لاہور نمبر ۹۲، فروری ۱۹۶۲ء، صفحہ ۱۰۷

۲۶۔ ایک پرجوش خادم قوم (مضمون) از شیخ عبدالقادر مطبوعہ حمایت اسلام لاہور ۱۲ جولائی ۱۹۳۱ء، صفحہ ۲

۲۷۔ غیر مطبوعہ خط جو شیخ عبدالقادر نے ۳۰ جون ۱۹۰۳ء کو مولوی عبدالرشید چشتی کی وفات پر تحریر کیا۔ مولوی عبدالرشید چشتی مولانا حامد علی چشتی کے فرزند تھے جو علم و ادب کے لحاظ سے لاہور میں ایک نہایت معزز و معروف شخصیت تھے۔ عبدالرشید چشتی، ینگ مین محمڈن ایسوسی ایشن کے سیکرٹری اور آبزرور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے۔ آپ مخزن کے باقاعدہ مضمون نگار بھی تھے۔ ۷/اپریل ۱۸۷۳ء کو پیدا ہوئے اور ۱۹/مارچ ۱۹۰۳ء کو وفات پائی۔

۲۸۔ Selections from the Native Newspapers published in the punjab.Vol.14, No.1, Pages290-291

۲۹۔ حوالہ مذکور، صفحہ ۳۴۸

۳۰۔ حصول پاکستان مولفہ پروفیسر احمد سعید، ایجوکیشنل ایمپوریم، لاہور، ۱۹۸۳ء، صفحہ ۵۲

۳۱۔ Selections from the Native Newspapers page 497

۳۲۔ حصول پاکستان (حوالہ مذکور) صفحہ ۸۶ تا ۸۷

۳۳۔ Selections from the Native Newspapers, page 497

۳۴۔ حوالہ مذکور، متفرق صفحات

۳۵۔ نقوش مکاتیب نمبر مکتوب شیخ عبدالقادر بنام مولوی حبیب الرحمٰن شروانی (ولادت ۱۸۸۵ء، وفات ۱۱/اگست ۱۹۵۰ء) تصانیف ذکر الحبیب، ذکر جمیل، شان رسالت، شمع ہدایت، مقالات شروانی، تذکرہ بابر، سرسید کی یاد اور خطبات صدارت۔

۳۶۔ حوالہ مذکور

۳۷۔ حوالہ مذکور

۳۸۔ ماہوار رسالہ انجمن حمایت اسلام لاہور ستمبر ۱۹۰۲ء، جلد ۲۱ شمارہ ۹، صفحات ۱۳ تا ۱۵، احمد یار مخدوی انجمن کے سرگرم رکن اور رسالہ مذکور کے پہلے ایڈیٹر تھے جو ۱۵ جون ۱۸۶۵ء کو پیدا ہوئے اور ۸ جون ۱۹۲۷ء کو وفات پائی۔

۳۹۔ ماہنامہ مخزن جون ۱۹۰۸ء، جلد ۱۵ نمبر ۳، صفحہ آخر

۴۰۔ حصول پاکستان مولفہ پروفیسر احمد سعید، صفحہ ۸۴

۴۱۔ Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, page110 for detailed view expressed by the Observer, Paisa Akhbar, Zamindar and Watan, Lahore, please see Syed Razi Wasti's book entitled "Lord Minto and the Indian Nationalists Movement, pages 171-172

۴۲۔ حصول پاکستان مولفہ پروفیسر احمد سعید صفحہ ۷۷

۴۳۔ From Consultation to Confrontation; a study of the Muslim League in British Indian Politics; 1906-1912, by Matiur Rahman, Luzac & Company, London, page 26

(بحوالہ آبزرور ۶/اکتوبر ۱۹۰۶ء)

۴۴۔ حوالہ مذکور، صفحہ ۹۳ (بحوالہ آبزرور ۲۳ دسمبر ۱۹۰۸ء)

۴۵۔ حوالہ مذکور صفحہ ۹۸

Evolution of Muslim Political Thought in India; From Syed to the Emergence of Jinnah, by A.M. Zaidi. Indian Institute of Applied Political Research, New Delhi, 1975. Vol.1, page 167

۴۶۔ From consultation to confrontation, page 112, Observer's comment نیز quoted in the Times of India Mail. 1st May 1909

۴۷۔ From consultation to confrontation, page 117, Observer's comment نیز quoted in the Times of India Mail. 1st May 1909

۴۸۔ Modern Muslim India and the Birth of Pakistan, page 409

ملک برکت علی یکم اپریل ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔ ایف سی کالج لاہور میں تعلیم پائی اور ۱۹۰۵ء میں وہیں اسسٹنٹ پروفیسر انگریزی تعینات کیے گئے۔ ۱۹۰۸ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں آ گئے۔ انہوں نے ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۱۲ء تک ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر اور مجسٹریٹ کی حیثیت سے بھی کام کیا، لیکن ۱۹۱۴ء میں مستعفی ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں لاہور میں وکالت شروع کر دی۔ انہوں نے پنجاب خلافت کمیٹی میں سرگرمی سے حصہ لیا اور ۱۹۲۸ء میں اس کے نائب صدر رہے۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ میں دوبارہ شامل ہو گئے اور اس کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ اسی سال انہوں نے لاہور سے ایک نیا اخبار ''نیو ٹائمز'' جاری کیا۔ ۱۹۳۷ء میں وہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں مسلم لیگ کے واحد نمائندے تھے۔ انہوں نے ۵/اپریل ۱۹۴۶ء کو وفات پائی۔ آبزرور کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انہوں نے صحافت میں ''نام'' پیدا کیا۔

۴۹۔ حوالہ مذکور صفحہ ۲۰۵

۵۰۔ A Handbook of Archives and Materials on Pakistan Freedom Struggle, by M.H. Siddiqui. Karachi, Karachi University, 1989. pages 276-77

جامعات میں تدریس نظم ۔ چند تجاویز

ڈاکٹر روبینہ ترین

نظم کی تدریس اور اس کے مسائل کے بارے میں غور کریں تو سب سے پہلے تو اس سوال کا سامنا ہوگا کہ کیا شاعری کی کلی تفہیم و تدریس ممکن ہے؟ یا شاعری کا احساس و تاثر تفہیم و تدریس کی گرفت میں آ بھی سکتا ہے یا نہیں؟ ہم میں سے بہت سے لوگ شاعری کو پڑھ سکتے ہیں، چند محسوس بھی کر سکتے ہیں لیکن بہت کم اپنے احساسات کو لفظوں میں سمیٹ سکتے ہیں۔ کروچے نے بڑی بلیغ بات کہی:

''شاعری سے لطف لینا نایاب بھی ہے اور عام بھی، یہ ان منتخب روحوں کے لیے مخصوص ہے جو ان کے لیے پیدا ہوئیں یا تعلیم کے ذریعے ان کی تربیت کی گئی''۔

کروچے شعر فہمی کے مدعیوں کے بارے میں کہتا ہے:

''یہ لوگ زندگی بھر شاعروں کی تصانیف پڑھتے ہیں، ان پر تبصرے لکھتے ہیں، ان کی شرحیں لکھتے ہیں، ان کے مختلف معنی پر بحث کرتے ہیں، ان کے مخرج اور ماخذ تلاش کرتے ہیں، سوانح، مقدمے اور حواشی لکھتے ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کی ذات شاعرانہ گرمی کا تجربہ کرنے سے محروم رہتی ہے''۔

گویا شاعری ذوقی و وجدانی شے ہے جسے طالب علموں میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ طالب علموں میں پہلے سے موجود ذوق کی جلا ممکن ہے۔ پھر اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہر بڑی نظم اپنے پڑھنے والے سے خیال کی پوشیدہ تہوں کو کھولنے کی سعی، ریاض، خلوص، لگن اور اپنائیت کا مطالبہ کرتی ہے اور اس عمل میں قاری کی لگن اور تجسس کی آنچ تیز ہوتی ہے اور یہ فطری عمل جمالیاتی حظ کا باعث بنتا ہے۔

شاعری کی تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے اندر شعر فہمی کا ذوق ہو جبکہ ہماری تربیت عموماً مشاعروں کے حوالے سے ہوتی ہے اور مشاعروں میں بھی غزل پڑھنے کا رواج رہا ہے۔ ہمارے شعری ذوق کی ابتدائی درس گاہ مشاعروں میں داد و بے داد 'آہ' اور 'واہ' کہنے سے ہے یا پھر اصحاب ذوق ''سکوت سخن شناس'' اور ''تحسین سخن ناشناس'' کو معیار انتقاد بناتے ہیں، شعری پذیرائی یا وپری یا حجاب قبولیت کو معیار نہیں بناتے۔

تدریس نظم کے لیے کچھ مسائل ہیں جن کا استاد کے لیے خیال رکھنا ضروری ہے:

(۱) ہمارے طالب علم اکثر غزل کے اشعار سے نامانوس ہوتے ہیں۔ وہ غزل کے اشعار کو یاد کر سکتے ہیں لیکن کسی نظم کو یاد کرنا بھی مشکل ہے اور تسلسل خیال کے ساتھ تلازمات کی پوری معنویت کو ذہن نشین کرنا مشکل ہے۔

(۲) نظم میں عام طور پر قافیہ و ردیف، آہنگ اور ہیت کے روایتی نظام سے انحراف کیا جاتا ہے جس سے ایک سادہ خیال کی نظم بھی طلبا کی نظروں [illegible] ناہموار اور منتشر دکھائی دینے لگتی ہے۔

(۳) جدید نظم نے رفتہ رفتہ لسانی تشکیل کے جو تجربے کیے یا شعوری سطح پر روانی اور بہاؤ کے عمل کو منہدم کیا (اردو کے ایک عظیم نظم گو مجید امجد نے کہا تھا کہ میں نے شعوری طور پر اپنی نظم کے آہنگ کو سبک نہیں رہنے دیا تا کہ میرا قاری مطلوبہ توجہ دیے بغیر آگے نہ بڑھ سکے) نظم گو کا یہ عمل بھی معنی کے ابلاغ میں رکاوٹ کا سبب بنا۔ جدت پسند شعرا نے اپنے دور کے مروجہ بحور و اوزان سے بے اطمینانی کا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ اردو شاعری میں بھی مغرب کے اثر سے نظم معریٰ، آزاد نظم، نثری نظم کے تجربے ہونے لگے، گویا نئے زمانے کے مرکب اور پہلو دار تجربے کو گرفت میں لینے کے لیے ہیئت اور اظہار میں آزادی کی آرزو نئی ہیئتوں اور لسانی تشکیلات میں ظاہر ہونے لگی، نظم میں نئے نئے تجربات کو مختلف فنی اور ادبی تحریکوں سے ملی جو سرریلزم، ڈاڈاازم، امیجزم (تصویریت) امپریشن ازم (تاثریت) سمبالزم (علامت پسندی) کے نام سے چلیں جن کے تحت شاعری موضوعات کے انتخاب کا نام نہیں، زندگی کے بدلتے رویوں اور پیچیدہ تر ہوتے احساس کے اظہار کا نام ہے۔

(۴) ہمارے طالب علم تنقیدی اصطلاحات سے مانوس نہیں ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مشرقی انتقاد اور مغربی طرز انتقاد میں فرق ہے۔ جدید اردو نظم سے قبل عموماً ہمارے یہاں مشرقی انتقاد ملحوظ خاطر رہا جس میں تین باتوں پر توجہ دی جاتی تھی۔

(i) علم بیان (ii) علم بدیع (iii) علم عروض

ہماری بدقسمتی ہے کہ آج تدریس سے وابستہ کچھ اساتذہ ان تینوں پر عبور نہیں رکھتے۔ انہیں اپنے شاگردوں کی طرح فصاحت و بلاغت کا فرق معلوم نہیں اور نہ قواعد زبان ہی سے آشنا ہیں۔ صنائع بدائع اور عروض تو اور بھی دور کی چیز ہے۔ اسی طرح اردو شاعری میں جن باتوں کو محسنات شعر اور جنہیں عیوب شمار کیا گیا وہ اصطلاحات آج کے اساتذہ کے لیے بھی کم و بیش لایعنی ہیں۔ مثلاً تعقید لفظی، تنافر لفظی، ایطائے جلی، ایطائے خفی اور شتر گربگی وغیرہ۔ پہلے تحسین شعر کے عمل کے لیے محض اس کی ہیئت، الفاظ اور صنائع بدائع جیسے خارجی حسن پیدا کرنے والے عناصر کا ذکر کیا جاتا تھا یا پھر شعر سے مخصوص قسم کے جذبات ابھارنا، مسرت حاصل کرنا یا جاذبیت پیدا کرنا سمجھا جاتا تھا تو بحر کا حسن، الفاظ کا ترنم، مٹھاس اور تحسین لفظی کی خوبصورت مثالیں تلاش کرنے کے لیے مخصوص اصطلاحات استعمال کی جاتی تھیں، لیکن اب تفہیم کے ساتھ انداز تحسین اور تکنیکی وسائل بھی بدل گئے ہیں۔

اب مشرقی انتقاد کی جگہ مغربی تنقید کے نئے پیمانے شاعری کی تفہیم کے لیے استعمال ہونے لگے، لیکن اس میں بھی قباحت یہ ہے کہ ان کی وضع کردہ اصطلاحات واضح نہیں ہو سکیں۔ مثلاً معروضی تلازمہ، امیجری، ڈرامائی خود کلامی، داخلی پکار، آزاد تلازم، فنٹیسی وغیرہ۔

(۵) مغرب سے ہمارے ہاں بعض ناقدین کے ادھورے جملے آئے ہیں جو سیاق و سباق سے الگ ہو گئے تو ان کی معنویت ہی بدل گئی۔ مثلاً مقدمہ شعر و شاعری میں ملٹن کے فقرے کا ترجمہ اس طرح کیا گیا:

''شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو''

ہم میں سے بیشتر جانتے ہیں کہ جملہ اصل میں کیا تھا۔ اسی طرح ہمارے یہاں عموماً تنقید شعر میں ٹی ایس ایلیٹ، میتھیو آرنلڈ، لانجائنس، سڈنی، والٹر پیٹر وغیرہ کے اقوال اردو میں دہرائے جاتے ہیں اور عموماً یہ جملے سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیے جاتے ہیں۔ اکثر اساتذہ بھی ان کے سیاق و سباق سے واقف نہیں ہوتے اور اس بات کا خیال نہیں رکھتے کہ بعض ادھورے بیانات گمراہ کن بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً میتھیو آرنلڈ کا جملہ اکثر درج کیا جاتا ہے کہ:

''شاعری تنقید حیات ہے''

جبکہ پورا فقرہ یوں ہے کہ:

''شاعری تنقید حیات ہے بہ شرطے کہ شاعرانہ حسن اور شاعرانہ صداقت کے اصولوں کا خیال رکھا جائے''

ٹی ایس ایلیٹ کا یہ ادھورا جملہ ہے کہ:

''شاعری جذبات اور شخصیت کا اظہار نہیں، جذبات اور شخصیت کا فرار ہے''

جبکہ مکمل جملہ اس طرح ہے کہ:

''شاعری جذبات اور شخصیت کا اظہار نہیں، جذبات اور شخصیت کا فرار ہے بہ شرطے کہ شاعر کے پاس جذبات بھی ہوں اور شخصیت بھی''۔

(۶) ہمارے ہاں تنقید شعر میں عموماً انگریزی تنقید سے اصول لیے گئے، لیکن ہم نے یہ فراموش کر دیا کہ انگریزی میں یہ اصول جس قسم کی شاعری کے لیے استعمال کیے گئے وہ اردو میں اول تو ہے نہیں اگر ہے تو ایک تہذیبی سیاق و سباق میں۔ مثلاً انگریزی تنقید کی جو بڑی کتابیں ہیں وہ رزمیہ اور ڈرامائی شاعری کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں جس میں پلاٹ، کردار، اساطیر، علامات استعارے ایک مخصوص پس منظر کے حامل ہیں جبکہ اردو میں رزمیہ شاعری بہت کم ہے اگر ہم ان اصولوں کو ہر طرح کی شاعری کے لیے استعمال کریں گے تو اس سے مغالطے پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہر زبان، عہد اور علاقے کی شاعری اپنا ایک تہذیبی و ثقافتی پس منظر رکھتی ہے اس لیے اس کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ وقتی طور پر کسی اور زبان یا تہذیب و ثقافت کی شاعری سے متاثر ہو کر اس کی پیوند کاری کی کوشش کی بھی جائے تو کچھ عرصے بعد وہ اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے یا ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہو جاتی ہے۔

(۷) اردو میں نظم کی تحریک کو ہم اس جدیدیت سے جوڑتے ہیں جو انگریزی ادب کے اثر سے مغرب سے آئی ہے۔ جبکہ جدیدیت سے مراد ہے کہ روایت سے کلی طور پر یا اس کے بیشتر اجزا سے انحراف، گویا ہمارے یہاں جدیدیت سے مراد کلاسک سے انحراف لیا گیا۔ یہ مسئلہ بھی اردو کی جدید نظم کے حوالے سے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو شاعری میں ن م راشد، مجید امجد، میراجی، مختار صدیقی، انیس ناگی، زاہد ڈار، افتخار جالب وغیرہ ایسے شاعر ہیں جو کسی قدر ماضی کے حوالے سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی شاعری افسردگی کے عناصر لیے ہوئے ہے اور ایک نئی مابعد الطبیعیات کو تشکیل دینے کی خواہاں ہے۔ ان نئے شعرا کے ساتھ عموماً ہمارے اکثر اساتذہ کی ذہنی مطابقت نہیں بنتی چہ جائیکہ طالب علموں کی ہو۔ کیونکہ ہماری جامعات میں بیشتر اردو کے اساتذہ فکری اعتبار سے جدیدیت سے خائف ہیں اس وجہ سے وہ غیر شعوری طور پر نئی نظم کے طرز احساس کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظم کی تدریس نصاب کا جزو تو بن سکی مگر یہ تدریس نہ تو تخلیقی تدریس بن پائی چہ جائیکہ قابل قدر تنقیدی تدریس کہلائے۔

بیشتر نظم گو، دروں بیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ دروں میں شاعر کے یہاں بیشتر شعری تلازمات خاص طرح کی نفسی کیفیت کو لیے ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ زندگی کے اتنے پیچیدہ مسائل جس تجربے سے اسے آشنائی بخشتے ہیں اس کی تفہیم بھی تو آسان کام نہیں ہو سکتی۔ اس کا ایک لمحے کا تجربہ، اس کے سوچنے، محسوس کرنے اور اس کے پچھلے تجربوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے تک سب مرحلوں کا حاصل ہے۔ اس کا تجربہ محض عقلی سطح تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کی شخصیت کا تمام تر تخلیقی جوہر اس میں شریک ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں عموماً جدید شاعری میں ن م راشد، میراجی اور مجید امجد کو پڑھایا جاتا ہے۔ ان تینوں شعرا کا ماضی کے حوالے سے رویہ مختلف ہے۔ ان کے یہاں اپنے عصر کے بارے میں تعبیر و تفسیر یکساں نہیں، ان کا لسانی رویہ بھی مختلف ہے۔ ان شعرا کا نفسیاتی جائزہ لیں تو بھی ایک جیسا نہیں، ان کے علاوہ فیض احمد فیض ترقی پسند شاعر ہے۔ اس کا انداز یکسر منفرد ہے۔

چنانچہ میرے نزدیک استاد کے لیے ضروری ہے کہ:

۱۔ وہ نظم کی فارم اور آہنگ کے بارے میں جانتا ہو۔

۲۔ اسے موضوع کے تعین کے لیے فکری تجزیہ کرنا چاہیے۔

۳۔ اس نظم کے عقب میں کہانی یا تلمیحات کی وضاحت کرنی چاہیے۔

۴۔ شاعر نے جو نامانوس تراکیب استعمال کی ہوں ان کے معانی ہی نہیں، ان کے محلِ استعمال بھی واضح کرے۔

۵۔ شاعر کی تخلیقی ذات کو تشکیل دینے والے عناصر اور تمام تخلیقات کا تعارف کرا کے طالب علموں سے زمانی اور معنی طور پر قریب تر کر دے۔

۶۔ اس کی شاعری کے مرکزی موضوعات کا تعارف کروائے۔

۷۔ شاعر کے طرزِ احساس کے بارے میں بتائے۔

۸۔ جو نظم کلاس میں پڑھائی جائے اس جیسے موضوع والی شاعر کی اگر دو تین اور نظمیں ہوں تو ان کی خواندگی بھی کروالینی چاہیے۔

۹۔ یونیورسٹی کی سطح کے طالب علموں کو خاص طور پر بتائے کہ شاعر نے اپنی شاعری میں جتنے تجربات پیش کیے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔

روایت میں انتخاب کے حوالے سے، تاثریت اور اپیل کے لحاظ سے وقت کے ساتھ ساتھ علامتیں اور اشارے بدلتے ہیں یا ان میں نئی معنوی گہرائیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ علامتیں روزمرہ کی زندگی سے لے کر قدیم تہذیب اساطیر، داستانوں، مذہب، جمالیات فطرت اور تاریخ سے اخذ کی جا سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاعر علامت نگاری کے سہارے اس وقت اظہار و ابلاغ کا حق ادا کر سکتا ہے جب وہ وسیع تر تہذیبی اور فکری پس منظر کا شعور رکھتا ہو۔ اگر اس کا مطالعہ اور مشاہدہ محدود ہے تو علامت نگاری کے شوق میں یا علامت سازی کے باعث اپنی شاعری میں ابہام پیدا کرے گا۔ شاعر کے تخلیق کردہ اشاروں اور کنایوں کے پس پردہ معانی کی تہیں چھپی ہوتی ہیں جنہیں ایک اچھا استاد شاگردوں تک پہنچا سکتا ہے۔

معاشیات کی دنیا میں فاضل زرکی ریزش "Trickle down Theory" کا چرچا ہے۔ ہم اس کی تعبیر اس طرح کر سکتے ہیں کہ آج تدریس ادبیات پر مامور اساتذہ کو ورکشاپ اور سیمینار میں شرکت اور امدادی قیمت پر کتب اور جرائد فراہم کر کے اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنے شاگردوں میں ادب و شعر کی لگن پیدا کریں یا اس لگن اور بصیرت کو جلا بخشیں۔ اس حد تک کہ ہمارا ہائر ایجوکیشن کمیشن بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لے کہ ادب و شعر کی تدریس پر مامور اساتذہ دوسرے تیسرے درجے کی ذہنی صلاحیت کے اساتذہ نہیں ہوتے۔

ماخذات

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مترجم) ''ارسطو سے ایلیٹ تک''۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۷ء

۲۔ عابد علی، سید۔ ''اسلوب'' لاہور: مجلس ترقی ادب

۳۔ ہادی حسین (مترجم) ''مغربی شعریات'' لاہور: مجلس ترقی ادب

۴۔ انیس ناگی۔ ''تنقید شعر'' لاہور: مکتبہ میری لائبریری

حیدر دہلوی کی غزل گوئی

ڈاکٹر اختر شمار

سید جلال الدین حیدر دہلوی (۱۹۰۶۔۱۹۵۸ء) کی غزل کو جانچنے کے لیے نئی یا پرانی غزل کی تاریخ میں الجھنا ضروری نہیں۔ حیدر دہلوی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ دلی میں گزارا۔ قیام پاکستان کے ایک برس بعد وہ ڈھاکہ اور پھر کراچی آ گئے اور یہیں وفات پائی، لیکن ان کی شاعری کا بیشتر زمانہ دلی کا ہے۔ حیدر دہلوی کی غزل کو سمجھنے کے لیے دلی میں تخلیق ہونے والی اس دور کی اردو غزل کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

حیدر دہلوی نے جس دور میں شعر کہنا شروع کیا وہ داغ اور امیر مینائی کی تربیت یافتہ نسل کا دور تھا اور اس وقت دلی میں، اس وقت کے استاد شعرا کی غزل کی گونج تھی۔ ان اساتذہ کے درمیان اپنی آواز میں انفرادیت پیدا کرنا اور منوانا حیدر دہلوی کے لیے چیلنج سے کم نہ تھا۔ سو انہوں نے اپنی شعری صلاحیتوں سے اساتذہ دلی کے درمیان نہ صرف اپنی شناخت کا سفر طے کیا بلکہ اپنی شعری اہمیت کو تسلیم کرانے میں بھی کامیابی حاصل کی۔

انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کی ابتدائی چند دہائیوں کو تبدیلی کا زمانہ قرار دیا جاتا ہے اور ان تبدیلیوں کے اثرات، اس دور کی شاعری پر بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ سیاسی انقلابات نے برصغیر پاک و ہند کو بالکل ایک نئی فضا سے ہمکنار کیا۔ اس دور کی غزل میں یہ فضا واضح نظر آتی ہے، لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود، غزل کہنے والوں میں ایک ایسا گروہ بھی تھا جس نے غزل کو ان تمام تبدیلیوں کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ خصوصاً دلی اور لکھنؤ میں داغ (۱۸۳۱ء۔۱۹۰۵ء) اور امیر مینائی (۱۸۲۸ء۔۱۹۰۱ء) کے شاگرد شعرا، روایتی غزل کی پٹڑی پر سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ میر اور غالب کے تتبع میں بھی شعر کہنے والے موجود تھے۔ اسی دور میں اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کی غزل بھی اپنی الگ پہچان کے ساتھ گونج رہی تھی، گویا اس دور میں اردو غزل کسی ایک خاص رجحان کی تابع دکھائی نہیں دیتی۔ داغ اور امیر مینائی کے اثر سے غزل میں، محبوب سے چھیڑ چھاڑ اور لذت پرستی کا جو دور آیا اسے صفی لکھنوی (۱۸۶۲ء۔۱۹۵۰ء) عزیز لکھنوی (۱۸۸۲ء۔۱۹۳۵ء) ثاقب لکھنوی (۱۸۶۹۔۱۹۴۶ء) اور یاس یگانہ چنگیزی (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۶ء) نے ابتذال اور سوقیت کو دور کر کے غزل کی سطح بلند کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ دلی میں استاد بیخود دہلوی (۱۸۶۲ء۔۱۹۵۵ء) نوح ناروی (۱۸۷۹ء۔۱۹۶۲ء) اور سائل دہلوی (۱۸۶۷۔۱۹۴۵ء) نے غزل کو اس وقت سنبھالا جب غزل، نظم کے نرغے میں آ رہی تھی۔ ان شعرا نے، دلی کی زبان اور محاورے کے ذریعے غزل کو آراستہ کیا۔ لکھنو سے باہر غزل کو نئی راہ دکھانے والوں میں اصغر گونڈوی (۱۸۸۴ء۔۱۹۳۶ء) فانی بدایونی (۱۸۷۹ء۔۱۹۴۱ء) حسرت موہانی (۱۸۷۵ء۔۱۹۵۱ء) جگر مرادآبادی (۱۸۷۵ء۔۱۹۵۱ء) اور سیماب اکبرآبادی (۱۸۸۰ء۔۱۹۵۱ء) وغیرہ شامل ہیں، جنہوں نے غزل کو نئے اسلوب سے ہم آہنگ کیا۔

حیدر دہلوی نے جس دور میں شعر گوئی کا آغاز کیا اس وقت دلی میں اردو شعری روایت کی حامل چند ممتاز ہستیاں موجود تھیں۔ خصوصاً پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی، بیخود دہلوی اور سائل دہلوی کا طوطی بول رہا تھا۔

حیدر دہلوی ایک کرخندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کی وجہ سے ان کا بچپن محرومیوں میں گزرا۔ ان کی والدہ نے اپنی بساط کے مطابق ان کی پرورش کی۔ ان کے ماموں نے بھی اس زمانے کے مطابق انہیں پڑھانے لکھانے کی کوشش کی مگر حساس طبیعت رکھنے والے نوعمر حیدر دہلوی نے جلد ہی اپنی والدہ کا بوجھ بانٹنے کا فیصلہ کیا اور ان کی محنت میں شریک ہو گئے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی ثروت مند گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے، نہ کسی نواب کی اولاد ہی تھے کہ ہر جگہ ان کی پذیرائی ہوتی اس کے باوجود جلد ہی حیدر دہلوی نے اپنی محنت اور ہنرمندی سے مالی آسودگی کی منزل حاصل کر لی۔ شاعری کا شوق تو انہیں بارہ تیرہ برس کی عمر سے تھا مگر اس دور کے ادبی ماحول میں ان کی زیادہ حوصلہ افزائی نہ ہوئی۔ ان کی شاعری میں تازگی اور توانائی سے اساتذہ دلی قدرے خوفزدہ تھے۔

خود حیدر دہلوی بھی محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کی پختہ شاعری کی وجہ سے یہاں کے سینئر اور بزرگ شعرا انہیں زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور شاید یہی وہ چیلنج تھا جس نے آگے چل کر حیدر دہلوی کو ایک ممتاز استاد شاعر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے شاعری میں محنت سے کمال پیدا کیا اپنے اردگرد شاگرد اکٹھے کیے اور مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرنے لگے۔ وہ دور مشاعروں کا دور تھا۔ حیدر دہلوی نے اپنی شاعری سے لوگوں کو متوجہ کرنا شروع کیا۔ ادبی طور پر آگے بڑھنے کے لیے انہوں نے باقاعدہ ماہنامہ ادبی رسالہ ''الہام'' جاری کیا۔ یوں اس دور کے ادبی ماحول میں حیدر دہلوی نے اپنے لیے جگہ بنائی۔ مگر اس کے باوجود انہیں مخالفین کی مزاحمت برداشت کرنا پڑی۔ حیدر کوئی بڑا سماجی مرتبہ نہ ہونے کی بنا پر اور کچھ اپنی طبیعت کی وجہ سے، اس دور کے اساتذہ سے دور ہی رہے۔ البتہ سائل دہلوی سے ان کی دوستی تھی۔ دلی کے دیگر شعرا، پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی، بیخود دہلوی، پنڈت زار زتشی، برق دہلوی، حیدر کو مغرور اور نک چڑھا سمجھتے تھے۔ حیدر دہلوی بھی اپنی شاعرانہ عظمت کا سودا سر میں رکھتے تھے۔ کچھ اس لیے بھی وہ ''پی آر'' کے آدمی نہ تھے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد جب تحریک پاکستان زوروں پر تھی اور ہندو مسلم فسادات کا آغاز ہو چکا تھا۔ حیدر دہلوی کو بھی ہندو شاعروں کے تعصب کی بھینٹ چڑھنا پڑا کیوں کہ حیدر دہلوی کے ہوتے ہوئے ہندو شعرا کی دال نہ گل سکتی تھی۔ سائل دہلوی وفات پا چکے تھے۔ بیخود دہلوی مشاعروں سے کنارہ کشی اختیار کر چکے تھے۔ ایسے میں حیدر دہلوی ہی دلی میں مانے ہوئے استاد شاعر کے طور پر مشہور تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو شعرا ان کے خلاف ہو گئے مگر پاکستان بننے کے باوجود حیدر دہلوی نے ہجرت نہ کی۔ جب ہر طرف سے انہیں تنگ کیا گیا اور انہیں جان کا خطرہ محسوس ہوا تو انہوں نے ڈھاکہ ہجرت کی۔ دہلی میں ان تمام تعصبات اور اذیتوں کی داستان حیدر دہلوی کی غزلوں کا حصہ ہے۔ دہلی میں قیام کے آخری ایام میں وہ دہلی کے ادبی ماحول سے خاصے بیزار تھے:

بہت ہی تنگ ہے حیدؔر فضائے دہلی سے
خدا پناہ میں رکھے بس اب یہاں سے مجھے

علم و فن ہی سے نہیں مجھ پہ مصیبت حیدؔر
ننگ احباب کو بھی پرسش احوال سے ہے [۲]

آفت رسیدہ زیست پہ حیدرؔ یہ اوجِ فکر
قسمت زمیں ملی ہے مزاج آسماں مجھے ۳

اس برے وقت میں مجھے حیدرؔ
حق نے کس جرم میں کمال دیا ۴

غالب کے بعد دلی کی حیدرؔ سے لاج تھی
وہ بے نوا فقیر بھی گوشہ نشیں ہے آج ۵

کیا سوچ کر ہیں در پئے آزار ہم وطن
حیدرؔ سے ان کو ضد ہے کہ علم و ادب سے ہے ۶

حیدرؔ مرے وطن میں ہمیشہ سے ہے روا
اہل ہنر کے باب میں تضحیک بالخصوص ۷

حیدرؔ نہ ملی داد کسے علم و ہنر کی
ہر اہل وطن میرے لیے تنگ نظر ہے ۸

حیدر دہلوی کو یہ قلق تھا کہ انہیں علم و ہنر کی داد کیوں نہ ملی۔ اس دور کے کسی ناقد نے ان کی شاعری پر توجہ نہ کی۔ یہ بات بالکل بجا ہے کہ رباعی کے مانے ہوئے استاد شاعر ہونے کے باوجود بھی انہیں پذیرائی نہ ملی۔ بلکہ رباعی کے باب میں کہیں ان کا نام تک نہ آیا۔ حالانکہ ان کا مجموعہ ''رباعیات حیدر'' ۱۹۴۰ء میں دہلی ہی سے شائع ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۸ء تک کا زمانہ حیدر دہلوی نے دہلی میں ایک عجیب بے بسی اور اذیت میں گزارا۔ حالانکہ ۱۹۴۰ء تک، آپ ایک ممتاز شاعر کے طور پر پہچانے جانے لگے تھے۔ اس دور میں حیدر دہلوی کی ایک غزل نے سارے ہندوستان میں دھوم مچادی تھی۔ اس غزل کی زمین میں بعد ازاں انجمن ترقی اردو دہلی نے طرحی مشاعرہ کرایا۔ اور بہت سے نامی گرامی شعرا نے اس زمین میں غزلیں کہیں مگر حیدر دہلوی کی غزل کو کوئی استاد شاعر نہ چھو سکا۔

حیدر دہلوی کی اس غزل کا ایک شعر بے حد مشہور ہوا تھا:

چمن والوں سے مجھ صحرا نشیں کی بود و باش اچھی
بہار آ کر چلی جاتی ہے ویرانی نہیں جاتی ۹

اسی غزل کا آخری شعر یہ تھا:

ابھی ماحول عرفان و ہنر میں پست ہے حیدرؔ
یکا یک ہر بلند آواز پہچانی نہیں جاتی ۱۰

حیدر دہلوی کو یقین تھا کہ ابھی ماحول عرفان و ہنر میں پست ہے۔ وہ اس ماحول سے مطمئن نہیں تھے اور پھر جب وہ ایسے فکر انگیز اشعار کہہ رہے ہوں تو انہیں اپنی قادر الکلامی پر فخر کیوں نہ ہو۔

یہ کیا دست اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے توڑنا پھول اور ویرانے میں رکھ دینا ۱۱

اب سے نہیں اول سے ہوں مشتاق نظارہ
آنکھوں سے یہیں نیند مقدر سے اڑی ہے ۱۲

تنقیص سے خفا نہ ستائش پسند ہوں
یہ دونوں پستیاں ہیں میں ان سے بلند ہوں ۱۳

حیدرؔ یہ جھریاں نہیں چہرے سے آشکار
کروٹ بدل رہا ہے زمانہ شباب کا ۱۴

میری بے تابی بدل دیتی ہے نظم کائنات
اب زمانے کی طرح کروٹ لیا کرتا ہوں میں ۱۵

وہ دن گئے کہ صرف گریباں پہ زور تھا
اب ہاتھ میں ہوں دامن صحرا لیے ہوئے ۱۶

یہ ہم صفیر کیا مری وسعت کو پا سکیں
سب سے زیادہ طائر رفعت پسند ہوں ۱۷

حیدر دہلوی اپنے آپ کو سب سے زیادہ طائر رفعت پسند قرار دیتے تھے تو پھر کیوں نہ اپنے ہم عصروں کی آنکھ میں کھٹکتے۔ ان کے شعری مجموعے ''صبح الہام'' میں ان کے بے شمار ایسے اشعار موجود ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ ایسے اشعار ہی کی بدولت انہیں دلی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ ان کی ہجرت کے دکھ کی ترجمانی ان کی اس رباعی میں نمایاں ہے جو اس دور میں بے حد مشہور ہوئی:

جو کچھ بھی میسر تھا گنوا کے آئے
ارباب سیاست پہ لٹا کے آئے
اک قلعہ اعزاز و طرب تھی دلی
اس قلعے کو ہم توڑ کے ڈھاکے آئے ۱۸

دلی سے ڈھاکے ہجرت کر کے بھی وہ زیادہ مطمئن نہ ہوئے کیونکہ وہاں کی ادبی فضا ان دنوں عندلیب شادانی کے اثر میں تھی اور حیدر دہلوی کی عندلیب شادانی سے نہ بن سکی اور انہیں کچھ عرصہ بعد ہی کراچی جانا پڑا۔ کراچی میں وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکے۔ مالی آسودگی جاتی رہی۔ ان کے عزیز دوست اور شاگرد بھی ان سے نظریں چرانے لگے۔ سو انہیں اپنے وطن میں بھی اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا جو وہ دلی میں چھوڑ کر آئے تھے۔ یہ دور افراتفری کا دور تھا۔ ہجرت کے بعد کے مسائل نے لوگوں کو مضطرب کر رکھا تھا۔ حیدر دہلوی بھی اس مصیبت کی زد میں تھے مگر جس قدر یہاں ان کی عزت افزائی ہونی چاہیے تھی، نہیں ہوئی۔ ان کی خودنوشت کے اقتباس سے بھی ان کے حالات کا پتہ چلتا ہے وہ لکھتے ہیں:

"کم عمری میں میرے کلام کی شہرت، میرے لیے خاصی مہنگی پڑی۔ معمر اور بزرگ شعرا میرے درپے آزار ہو گئے۔ بدقسمتی سے دوستوں اور بعض شاگردوں نے بھی وفا نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ مالی اطمینان کے باوجود مجھے آسودہ خاطری کبھی نصیب نہ ہوئی۔ پاکستان آنے کے بعد مالی آسودگی بھی نہیں رہی۔ اب بظاہر ہشاش بشاش اور متبسم نظر آتا ہوں لیکن دل و دماغ اور روح ہر وقت کرب و اضطراب میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں"۔ ۱۹

حیدر دہلوی کی خودنوشت سے یہ اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں ہے کہ انہوں نے دہلی اور پھر کراچی میں کیسے حالات میں زندگی گزاری اور شاعری کے میدان میں کن کن مسائل اور مراحل سے گزرے۔ حیدر دہلوی کے اشعار میں ان کی زندگی کی محرومیاں تلخیاں اور زمانے کی ناقدری کے نقوش بکھرے پڑے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

حیدر یہ بزم وقت میں شمع ہنر کی قدر
دن بھر جلا کے شب کو بجھایا گیا ہوں ۲۰

اگر اہل فن کی نہیں قدر حیدر
تو پھر کیا رہے گا کوئی فن سلامت ۲۱

اولاد کی طرح جنہیں درس ادب دیا
حیدر وہ معترض ہیں ہمارے شعار پر ۲۲

کیا کیا ستم ہیں مجھ پہ اہل وطن کے حیدر
پامال ہو رہا ہوں اپنی ہی رہگزر میں ۲۳

حیدر دہلوی کی شاعری میں ان کی شخصیت بھرپور انداز میں نمایاں ہوتی ہے۔ انہوں نے غم دوراں کے دکھوں کا تذکرہ غم جاناں سے کہیں زیادہ کیا ہے۔ طبیعت کے اعتبار سے وہ ایک درویش انسان تھے۔ تسلیم و رضا کے فلسفے پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے کبھی دنیاوی آسودگی کے لیے اپنی خودداری اور انا پر حرف نہ آنے دیا۔

لب واقف ثنائے امارت نہ ہو سکے
حیدر فقیر گوشہ نشیں تھا غیور تھا ۲۴

حیدر یہ قدم اور انھیں جانب دنیا
دنیا انہی قدموں کی ہے ٹھکرائی ہوئی سی ۲۵

وہ چاہتے تو کراچی آنے کے بعد اپنے حالات بہت بہتر کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے اپنے جاہ و جلال اور آسائش و آرام کے لیے اپنی خودداری اور انا کبھی مجروح نہ ہونے دی۔ ان کی غزلوں کے موضوعات پر نگاہ ڈالی جائے تو وہ اس دور کی عمومی غزل سے مختلف نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کے ہاں ایک تازگی اور فکری انفرادیت نمایاں ہے۔ حیدر دہلوی کی غزل قدیم و جدید رنگ کا حسین امتزاج ہے۔ ان کے ہاں زبان و بیان کی چاشنی، کیف و مستی، ماحول کی ترجمانی اور عصری شعور اور صداقتوں کے نقوش واضح دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ان کی تہذیبی شخصیت صاف پہچانی جا سکتی ہے۔ کسی بھی شاعر کی شاعری میں اس کی شخصیت بہر حال موجود ہوتی ہے۔ شخصیت کیا ہے اور شاعری میں شخصیت کس حد تک ظاہر ہوتی ہے اس سلسلے میں اقبال احمد خاں کا بیان ملاحظہ کیجیے:

"انسان کا کوئی فعل غیر شخصی نہیں ہوتا۔ وہ حیات و کائنات کو اپنے ہی وسیلے سے سمجھتا ہے اور اس کا علم اس کا تجربہ اس کے احساسات اس کے جذبات اس کے مدرکات اسباب و علل سے نتائج کا استخراج و استنباط اور ان کا اظہار و بیان (مع تمام ذہنی نفسی کیفیات کے) اس کا اپنا ہوتا ہے۔ پھر فنکار (شاعر ادیب) جس کی شخصیت (یقیناً دوسروں کے مقابلے میں) زیادہ قوی ہوتی ہے اور جسے دوسروں سے زیادہ اظہار و بیان کی قدرت و صلاحیت حاصل ہوتی ہے، اس کلیے سے کیوں کر مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ اس لیے شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ شاعر کی شخصیت اس کی شاعری میں پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے"۔ ۲۶

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں حیدر دہلوی کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بے حد سریع الحس اور شدید الاحساس واقع ہوئے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اسی شدت احساس نے ان کا رشتہ شاعری سے جوڑا۔ انہیں زندگی میں کیسے ہی حالات سے سابقہ پڑا وہ زندگی سے کبھی مایوس نہ ہوئے۔ فطرت نے انہیں اطمینان قلب سے نوازا تھا۔ وہ طمانیت کی ایسی دولت سے مالا مال تھے جس سے انسان ہر حال میں خوش، مطمئن، شگفتہ اور پر امید رہتا ہے۔ اور اس کی نگاہ ہمیشہ زندگی کے روشن پہلوؤں پر رہتی ہے۔ حیدر دہلوی بھی ایسی ہی شخصیت کے مالک تھے۔ بقول ڈاکٹر اسلم فرخی، حیدر دہلوی، دہلی مرحوم کی آخری بہار تھے۔

قیام پاکستان کے بعد یہ بہار ڈھاکے اور کراچی کے دامن میں سمٹ آئی اور پھر کراچی ہی میں یہ بہار خزاں کی نذر ہو گئی ۲۷۔ لیکن حیدر دہلوی جس قلعے کو چھوڑ کے ڈھاکے آئے تھے اس قلعے کی تہذیبی علامات اور اثرات ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

کی پیروی میں اس نسل نے زبان و بیان کی صفائی اور برجستگی بھی حاصل کی اور اپنے لیے ایک نیا راستہ بھی نکالا۔ ان شعراء نے قدیم وجدید کی آمیزش سے اردو غزل کو ایک نیا انداز دینے کی کوشش کی۔ حیدر دہلوی انہی شعراء کی صف میں نظر آتے ہیں لیکن ان تمام شعراء میں اپنے لہجے اور فکر کے اعتبار سے، وہ سب سے الگ دکھائی دینے والے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں روایت کے ساتھ اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہوئے بھی، عصری صداقتوں اور نئے ماحول کی پرچھائیوں کے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ذرا گھر سے نکل گھر میں ذریعے ڈھونڈنے والے
ذریعہ خود نکل آتا ہے منزل تک رسائی کا ۲۸

نہ اذن زمزمہ سنجی نہ مہلت گلگشت
برائے نام علاقہ ہے گلستاں سے مجھے ۲۹

اے ہم قفسو! قید سے چھٹکارا مبارک
ہر شاخ کو اب شاخ نشیمن نہ سمجھنا ۳۰

ہر صبح ایک حادثۂ جانگداز ہے
ہر شام ہے نمونہ قیامت کی شام کا ۳۱

اللہ ہی سفینے کو لگائے گا کنارے
طوفاں ہے غضب ناک غضب کوش حوادث ۳۲

درج بالا اشعار میں کلاسیکی روایت مدنظر رکھتے ہوئے، جدید تر فکر بیسویں صدی کا ذہنی کرب، بیچارگی اور ارد گرد کے مسائل نمایاں ہیں۔ حیدر دہلوی کے یہ اشعار، محسوسات و تصورات کے نئے ترکیبی امتزاج سے، اس عہد کی غزل کو جلا بخشتے نظر آتے ہیں۔ ان اشعار میں احساس کی نزاکت اور گہرائی کا جو بھرپور اظہار ہوا ہے وہ فکر و احساس کا حسین امتزاج قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دور کے بہت سے شعرا محض جذبے اور احساس کے دھارے میں بہتے دکھائی دیتے ہیں جس میں فکری سطح معدوم یا برائے نام نظر آتی ہے۔ مگر حیدر دہلوی کی غزل سے جذبہ اور فکر ایک خاص توازن کے ساتھ اور بالآخر ایک اکائی میں ڈھل جاتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھئے:

خاک ہی آپ کے قدموں کی میسر نہ ہوئی
ورنہ دیوانے کی منھی میں بیاباں ہوتا ۳۳

میں بد نصیب اسیر قفس خود ہی نہیں ہوا
ملتا ہوا تھا رنگ، رگ گل سے دام کا ۳۴

کبھی رویا کبھی ہر نقش قدم پر تڑپا
میں تری راہ میں آنکھوں سے کبھی دل سے چلا ۳۵

مندرجہ بالا اشعار حیدر دہلوی کی دل سوزی اور دل گرفتگی میں ان کا سہارا بنتے ہیں۔ فنی حوالے سے دیکھا جائے تو وہ غزل کی کلاسیکی روایت سے الگ ہونا گوارا نہیں کرتے۔ عشق محبت، ہجر و وصال، شکوہ زمانہ، عشق کے دکھ، نارسائی، غرض کہ کلاسیکی غزل کے تمام موضوعات ان کے جدید آہنگ میں ڈھل کر ایک نیا رنگ اور لطف پیدا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ حیدر کے اشعار کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ سراپا دید تھے۔ وہ دنیا اور زندگی کے حقیقی راز سے آشنا تھے۔ وہ دنیا کو فریب رنگ و بو کی بجائے ''جلوہ گاہ ناز'' کہتے اور سمجھتے ہیں۔ وہ مشاہدۂ کائنات کو زندگی کی اصل سے آگاہ ہونا سمجھتے ہیں:

ذرے میں بھی مشاہدۂ مہر و ماہ کر
ہر چیز پر فراخ دلی سے نگاہ کر ۳۶

اے حیدر حزیں گلہ اس شاہ حسن کا
اے خرقہ پوش اپنی طرف تو نگاہ کر ۳۷

تجلی شناس آنکھ پیدا تو کیجیے
تجلی سے خالی کوئی شے نہیں ہے ۳۸

نہیں کوئی اس کی مقرر جگہ
وہ اظہر من الشمس ہے ہر جگہ ۳۹

حیدر دہلوی کی غزلوں کا غالب رنگ یہی ہے۔ وہ کائنات کے ذرے ذرے میں ذات حقیقی کا نور کارفرما دیکھتے ہیں۔

حیدر دہلوی کی غزلوں میں متصوفانہ رنگ نمایاں ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر حسن وقار گل لکھتے ہیں:

''حیدر نے بھی غالب کی طرح مسائل تصوف بیان کیے ہیں جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تصوف کے مسائل پر اسے کس قدر عبور حاصل تھا لیکن حیدر کی صوفیانہ شاعری اس کے کلام کا جزو ہے کل نہیں''۔ ۴۰

ڈاکٹر حسن وقار گل نے غالب کے مسائل تصوف کا ذکر کرتے ہوئے عجیب بات کی ہے کہ حیدر دہلوی کو بھی تصوف کے مسائل پر عبور حاصل تھا۔ مسائل پر عبور حاصل ہونا۔ کیا بات ہوئی؟ غالباً حسن وقار گل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حیدر کے ہاں بھی تصوف کا رنگ خوبصورتی سے اظہار پاتا ہے۔ آگے چل کر انہوں نے اسے ان کے کلام کا جزو قرار دیا ہے۔ جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ حیدر دہلوی کے کلام کا غالب رنگ تصوف کا رنگ ہے اور اس کی مثالیں اوپر دی جا چکی ہیں۔ حیدر دہلوی کی

شاعری میں فکر و فلسفہ اور روحانیت کی باتیں ملتی ہیں اور کہیں کہیں ان کے ہاں زمانے کی ناقدری، رندی، مستی اور جوش اور سرشاری کا اظہار بھی ملتا ہے۔

حیدر دہلوی کو اپنی قدر و منزلت کا شدت سے احساس تھا مگر اس دور کے بیشتر اساتذۂ فن ان کی شعری صلاحیتوں سے خائف تھے۔ وہ حیدر دہلوی کو کسی طور پر ابھرتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سو دلی کے مشاعروں اور ادبی رسائل جرائد میں حیدر دہلوی کو یکسر نظر انداز کیا جاتا رہا۔ بقول گلزار زتش دہلوی حیدر دہلوی تک چڑھے شاعر تھے انہیں اپنی شاعرانہ عظمت پر کچھ زیادہ ناز تھا۔ لوگ انہیں مغرور کہتے تھے[۴۱]۔ مگر حیدر دہلوی کا رویہ متکبرانہ نہیں تھا۔ بیخود دہلوی اور سائل دہلوی کی موجودگی میں بھی ان کی استادانہ حیثیت مسلم تھی۔ ان کے شاگرد اور ماننے والے سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھے۔ ایسے میں اگر کسی کو اس کا جائز حق نہ ملے تو حرف شکایت زباں تک آ ہی جاتا ہے۔ حیدر دہلوی کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ اپنے ہنر میں یکتا ہیں مگر ان کی صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ حیدر دہلوی کی غزلوں کے بیشتر مقطعوں میں ان کا احساس محرومی اور زمانے کی ناقدری کا اظہار نمایاں ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر مجتبیٰ حسین کا بیان ہے:

''حیدر دہلوی کے کلام میں ایک خاص قسم کا طنطنہ اور تیور پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے معاصرین اور زمانے کی ناقدری سے بیک وقت نبرد آزما ہونے کے لیے اس طنطنے اور تیور سے بڑا کام لیتے ہیں۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا مقطع ہوگا جس میں شکوہ روزگار، ان کی مخالفوں سے زور آزمائی کا حوصلہ نہ پایا جاتا ہو''۔[۴۲]

حیدر دہلوی کی غزلوں سے چند اشعار مزید ملاحظہ ہوں جن میں یہی ناقدری اور زمانے کے رویے کی شکایت محسوس کی جاسکتی ہے:

سرزمیں دہلی کی کوفہ ہے یہاں جائز سمجھ
خون ناحق علم و فن کا قتل حیدر کشت داد [۴۳]

وائے بے قدری ہنر حیدر
کوئی معقول نکتہ چیں بھی نہیں [۴۴]

کس کس سے آج تک نہیں پہنچیں اذیتیں
میں ابتدا سے تختۂ مشق گزند ہوں [۴۵]

حیدر دہلوی کی غزلوں میں خارجی اور داخلی فضا کا ایک خاص توازن دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے غزل میں لطافت بیان، شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کر کے غزل کو نئے ذائقے سے روشناس کرایا۔ یعنی بیان بھی غزل کا اور زبان بھی غزل کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں ہر جگہ سچائی کی تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس میں رس بھی ہے اور نمک بھی۔ یہ رس شاعر کی دردمند فطرت اور ان کے تجربے کی سچائی کا فیضان ہے۔ شہاب دہلوی ان کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کا کلام زندگی کے مشاہدات کا آئینہ دار ہے۔ ہر شعر ایک پیغام اور اچھوتے خیال کا ہوتا ہے۔ خمریات، فلسفہ، اخلاق، تصوف اور تغزل سے ان کا کلام بھرا ہوا ہے۔ ہجر و وصال، گل و بلبل اور کنگھی چوٹی کے فرسودہ اور پامال مضامین سے ان کا کلام یکسر مبرا ہے۔ زندگی کی کٹھن راہوں سے گزرنے کے باوجود ان کے کلام میں قنوطیت نام کو نہیں۔ ان کی نظر ہمیشہ بلندیوں پر رہتی ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں بلا تکلف کہہ جاتے ہیں۔ تصنع اور مبالغہ کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔ باعتبار تخیل ان کے کلام میں انفرادیت ہے۔ صفائی بیان ایسے جیسے دریا کا شفاف پانی پوری طاقت کے ساتھ بہہ رہا ہو۔ پختگی کلام اور مصرعوں کی دروبست وہ کہ کوئی لفظ ہٹائے نہ بنے''۔[۴۶]

شہاب دہلوی نے بجا تحریر کیا ہے کہ حیدر دہلوی کی شاعری فرسودہ مضامین سے بالکل پاک ہے۔ 'صبح الہام' کی غزلوں میں ایک والہانہ سرمستی نغمگی اور کیف دلوں کے تار چھونے کی قوت رکھتا ہے۔ ان کے مصرعوں کی بناوٹ، شاندار تراکیب اور برجستگی انہیں ان کے ہم عصر شعراء سے ممتاز اور الگ کرتی ہے۔ ان کے کلام میں والہانہ پن جوش اور سرشاری ان کی تہذیبی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے۔ صبح الہام کے دیباچے میں ڈاکٹر اسلم فرخی لکھتے ہیں:

''ان کے ہر شعر میں سرشاری کی روح اور زندگی کی مستی ہے۔ دراصل ان کی شاعری مستی کا ایک ایسا ترانہ ہے جس میں شباب کی ہیجان خیزی نہیں عرفان ذات ہے۔ جس مجموعہ کلام میں عرفانِ ذات اور روح کی سرشاری کی یہ فضا موجود ہو اس کی خوبی اور عظمت میں کوئی شبہ نہیں۔ حیدر کی غزل اور رباعی دونوں میں یہ فضا موجود ہے''۔[۴۷]

'صبح الہام' کے دیباچہ نگار کی رائے سے سو فیصد اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ اور اس کے لیے حیدر دہلوی کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں:

یہ وقت شام یہ پیمانہ شراب طلوع
اک آفتاب غروب ایک آفتاب طلوع [۴۸]

وہ حسن شگفتہ ہے بہرحال شگفتہ
جب دیکھیے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی [۴۹]

وہ ڈال کر شراب ذرا مسکرا دیے
لو اور بھی نکھار دیا رنگ جام کا [۵۰]

اللہ رے جوانی کا دلآویز زمانہ
ہر چند کہ تاریک ہے یہ رات مگر مست [۵۱]

اگر ذرا بھی شب ہجر لطف خواب اٹھا
تڑپ کے بستر مشرق سے آفتاب اٹھا ۵۲

یہ کیا دست اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے توڑنا پھول اور ویرانے میں رکھ دینا ۵۳

حیدر دہلوی کی غزلوں سے اشعار کی مثالیں کچھ زیادہ ہو گئیں لیکن اس سے یہ اندازہ یقیناً ہو جاتا ہے کہ ان کی غزل میں سوز و گداز، گھلاوٹ اور شیرینی کے ساتھ ساتھ تغزل بھی اپنے جوبن پر ہے۔ ان کے ہم عصروں میں سائل دہلوی، بیخود دہلوی، جوش اور جگر کا نام لیا جا سکتا ہے لیکن حیدر دہلوی کا رنگ ان سب سے جدا تھا۔ بقول شہاب دہلوی ان کی شاعری قدیم و جدید رنگ کا حسین امتزاج ہے ۵۴۔ حیدر دہلوی کی غزل کا اچھا رنگ ہے۔ وہ زندگی کے کسی موضوع کو بھی چھیڑتے ہوئے اصول فن کی حدود سے متجاوز نہیں کرتے بقول افسر امروہوی:

''یہ بڑی خوبی کی بات ہے کہ حیدر صاحب نے غزل کو غزل کے درجے میں رکھا ہے۔ اسے شیخ سعدی کا کریما یا فرید الدین عطار کا پند نامہ نہیں بنایا۔ جس شعر کو دیکھیے اس کے تیور بتاتے ہیں کہ صرف جذبات حسن و عشق کا مصور ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں تصوف کا رنگ بھی غالب آیا ہے لیکن ایسے اشعار تمام و کمال حدود تغزل سے نہیں نکلے بس اتنا فرق ہوا ہے کہ حسن فانی اور عشق مجازی کے مظاہر کی جگہ جمال حق اور محبت حقیقی نے لے لی ہے''۔ ۵۵

حیدر دہلوی کی غزلوں سے ان کی قادر الکلامی نمایاں ہے۔ فنی حوالے سے مشکل زمین میں بھی خوبصورت برجستہ اور عام فہم شعر نکالنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ صرف چند اشعار دیکھیے:

اسرار کائنات مرے رنگ رخ میں دیکھ
میری زبان حال میں ہیں ہر زبان کے لفظ ۵۶

خلاف وقت یہ تشریف آوری کیسی
طلوع صبح سے پہلے ہی آفتاب طلوع ۵۷

تمہارے گرمیٔ محفل کے رنگ نے اڑ کر
کہیں پناہ نہ پائی تو آفتاب بنا ۵۸

بذات خود اب تو نہ تکلیف فرما
تصور ہی رہنے دے تشریف فرما ۵۹

اپنے گھر دوش پہ احباب کے مشکل سے چلا
میں جنازے کی طرح کوچۂ قاتل سے چلا ۶۰

ان کی قادر الکلامی کے بارے میں گوری سرن لال سنبل لکھتے ہیں:۔

''وہ اکثر غزلوں کی زمین لمبی اور سخت انتخاب کرتے ہیں جو بغیر مہارت کے کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچنے دیتی۔ لیکن حیدر صاحب نے انہیں اس طرح پانی کیا ہے گویا اشعار خود بخود قلم سے ٹپکتے ہیں''۔ ۶۱

حیدر دہلوی کی غزلوں میں نادر تشبیہات اور تراکیب کا ایک خزانہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی غزلوں میں دلی کی ٹکسالی زبان اور روزمرہ محاورے کا استعمال برجستہ اور ان کی فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لیکن وہ بیخود دہلوی اور سائل دہلوی اور نوح ناروی کی طرح محض صحت زبان، محاورہ اور روزمرہ کے شاعر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے دیگر ہم عصر شعراء پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی، آغا شاعر دہلوی، سیماب اکبرآبادی، برق دہلوی، پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی سے بالکل الگ اور منفرد اسلوب کے شاعر ہیں اور ان تمام اساتذہ فن کی شاعری میں رفعت تخیل کی جس کمی کا شدید احساس نمایاں ہے۔ وہ حیدر دہلوی کے ہاں قطعی نہیں ہے۔ حیدر دہلوی نے فنی مہارت اور زبان کی مروجہ پابندیوں اور استادانہ آن بان کو ملحوظ رکھتے ہوئے غزل کے تمام لوازمات کو سلیقے سے اپنایا اور اپنے لیے الگ اور نیا راستہ بنایا۔ ان کی غزل نہ تو فانی کی طرح قنوطیت زدہ ہے اور نہ حسرت موہانی کے عاشقانہ مضامین کی مرقع ہے۔ البتہ ان کے ہاں غالب کے اثرات کے علاوہ اصغر گونڈوی کے متصوفانہ رنگ اور یاس یگانہ کے تفکر کا پرتو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

حواشی

۱۔ گلزار زتشی دہلوی، انٹرویو نو ویدا دہلی، ۱۹۹۹ء
۲۔ حیدر دہلوی، ''صبح الہام'' کراچی، مکتبہ دہلی
۳۔ ایضاً، ص ۱۷۵
۴۔ ایضاً، ص ۴۲
۵۔ ایضاً، ص ۸۲
۶۔ ایضاً، ص ۸۴
۷۔ ایضاً، ص ۹۷
۸۔ ایضاً، ص ۱۲۸
۹۔ ایضاً، ص ۲۲۶
۱۰۔ ایضاً
۱۱۔ ایضاً، ۶۵
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۰۶
۱۳۔ ایضاً، ص ۱۲۶
۱۴۔ ایضاً، ص ۴۱

۱۵ ایضاً، ص ۱۲۹
۱۶ ایضاً، ص ۱۸۵
۱۷ ایضاً، ص ۱۲۰
۱۸ ایضاً، ص ۲۵
۱۹ حیدر دہلوی، خودنوشت سے اقتباس مشمولہ صبح الہام، ص ۱۱۔۱۲
۲۰تا۲۵ حیدر دہلوی، صبح الہام
۲۶ اقبال احمد خان، اصغر گونڈوی آثار و افکار، لاہور، مغربی پاکستان اکیڈمی ۱۹۹۴ء، ص ۳۰۔۳۱۹
۲۷ اسلم فرخی، ڈاکٹر، دیباچہ صبح الہام، ص ۱۴
۲۸ حیدر دہلوی، صبح الہام، ص ۵۲
۲۹تا۳۹ حیدر دہلوی، صبح الہام
۴۰ حسن وقار گل، ڈاکٹر، مضمون حیدر دہلوی داغ سکول ایک غلط فہمی کا ازالہ، مشمولہ سہ ماہی گلرنگ کراچی، مارچ ۱۹۸۳، ص ۲۶
۴۱ گلزار زتشی دہلوی سے راقم کا انٹرویو، ۱۹۹۹ء
۴۲ مجتبیٰ حسین پروفیسر، تبصرہ صبح الہام، ریڈیو پاکستان کراچی ۴ دسمبر ۱۹۶۷ کو نشر ہوا
۴۳تا۴۵ حیدر دہلوی، صبح الہام
۴۶ شہاب دہلوی، مضمون حیدر دہلوی مطبوعہ سہ روزہ زم زم بہاول پور، ۱۶ دسمبر ۱۹۵۸ء
۴۷ اسلم فرخی، ڈاکٹر، دیباچہ صبح الہام، ص ۲۳۔۲۴
۴۸تا۵۳ حیدر دہلوی، صبح الہام
۵۴ شہاب دہلوی، مضمون حیدر دہلوی ایک عظیم شاعر مشمولہ مجلہ حروف بہاول پور، ۱۹۸۳ء
۵۵ افسر امروہوی، مضمون بعنوان خیام الہند مشمولہ قومی زبان کراچی، انجمن ترقی اردو، نومبر ۱۹۶۶، ص ۱۰
۵۶تا۶۰ حیدر دہلوی، صبح الہام
۶۱ گوری سرن لال سنبل، مضمون خیام الہند کی شاعری مطبوعہ ماہنامہ الہام، دہلی، دسمبر ۱۹۴۰، ص ۱۵

فرہنگ تلفظ ..... ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی

ایک علم دوست نوجوان نے کچھ عرصہ قبل مجھے جناب شان الحق حقی صاحب کی مرتب کردہ ''فرہنگ تلفظ'' ہدیۃً پیش کی۔ میں خوش ہوا کہ حقی صاحب نے ایک بہت ضروری علمی کام انجام دیا ہے کیوں کہ اکثر میں لوگوں سے بہت سے الفاظ کا غلط تلفظ سن کر افسوس کرتا تھا۔ اب خیال ہوا کہ لوگوں کی اصلاح ہو جائے گی لیکن کتاب کی پہلی فرصت میں ورق گردانی سے بڑی مایوسی ہوئی، مزید الفاظ کا تلفظ اور معانی دیکھے تو یہ مایوسی بڑھتی گئی۔ کتاب کی جو خوبیاں ہیں وہ اپنی جگہ پر اور یہ تحریر تبصرہ نہیں ہے کہ میں ان خوبیوں کا ذکر کروں۔ کتاب کا مقصد اصلاح تلفظ اور فائدہ رسانی تھا، مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب میں زبان کی ضرر رسانی کا پہلو بھی کافی ہے۔ میری اس تحریر کا مقصد یہی ہے کہ قارئین کو اس کے ضرر رساں پہلوؤں سے محفوظ رکھا جائے۔

''مقتدرہ اردو زبان'' کی طرف سے جو لغت یا فرہنگ شائع ہو تو اس کی حاکمانہ یا ''مرشدانہ'' حیثیت تو مسلم ہی ہے، خود جناب مرتب نے ایک ابتدائی صفحہ میں اس کتاب کو اردو زبان کی ایک جامع لغت بھی کہا ہے جس میں ''معانی کے علاوہ الفاظ کا رائج فصیح تلفظ'' بھی دیا گیا ہے۔

اس سے قبل کہ میں ان الفاظ پر کچھ لکھوں جو کتاب میں اس ناچیز کو مختلف حیثیتوں سے غلط نظر آئے، کتاب کے مقدمے بعنوان ''عرض مرتب'' میں ہی مجھے ایک چیز کی کمی کھٹکی، وہ یہ ہے کہ مرتب موصوف نے اس ''عرض'' میں اپنے مآخذ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ شان الحق حقی صاحب کو ماہر زبان ادبا میں شمار کیا جاتا ہے اور مقتدرہ کے چیئرمین نے بھی کتاب کے ''پیش لفظ'' میں حقی صاحب کی اس حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کوئی لغت نویس اپنے مآخذ کا مقدمہ کتاب میں ذکر نہ کرے۔ عربی زبان کے ایک نہایت ہی بلند پایہ لغت نویس اور مایہ ناز محقق علامہ رضی الدین حسن الصغانی لاہوری ثم البغدادی (متوفی ۶۵۰ھ) نے اپنی لغت ''التکملة و الذیل و الصلة'' (۶ مجلدات، مطبوعہ قاہرہ) کے مختصر مقدمہ میں ان بیسیوں کتابوں کا ذکر کیا ہے جو اس لغت کی تصنیف میں ان کے مآخذ رہی تھیں۔ اسی طرح ان کے بعد کے انتہائی مشہور و مستند لغت نویس ابن منظور (متوفی ۷۱۱ھ) نے اپنی انتہائی ضخیم لغت لسان العرب (باریک ٹائپ میں ۱۵۶ ضخیم مجلدات) میں اپنے صرف اہم ترین لغوی مآخذ کا ذکر کیا ہے۔

میں نے یہ بات لکھنا اس لیے ضروری سمجھا کہ ''فرہنگ تلفظ'' میں، میں نے عربی زبان کے بہت سے ایسے الفاظ دیکھے جو دیگر اردو لغات (فرہنگ آصفیہ اور اردو علمی لغت وغیرہ) تو کیا خود عربی لغات میں بھی موجود نہیں، بعض الفاظ کے معانی جدا ہیں لہٰذا اگر حقی صاحب اپنے اہم مآخذ کا ذکر کر دیتے تو پتہ چلایا جا سکتا تھا کہ ان بے بنیاد عربی الفاظ اور ان کے غلط تلفظ و معانی کا مآخذ کیا ہے۔

۱۔ اصل کتاب کے شروع ہونے سے قبل صفحہ ''ن'' پر ایک طویل عنوان: ''عربی جمع مکسر کے اوزان جو اردو میں معروف و

مستعمل ہیں'' کے تحت ہیں اوزان تحریر کیے گئے ہیں۔

اس عنوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربی جمع مکسر کے صرف یہی اوزان اردو میں معروف و مستعمل ہیں جبکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ کئی دیگر اوزان بھی اردو میں معروف و مستعمل ہیں، جیسے:

(آ) مفاعیل: جس کے وزن پر مکاتیب، مساکین، مقادیر، مواثیق وغیرہ ہیں۔

فُعُل: جس کے وزن پر کتب، رسل وغیرہ ہیں

فَعلیٰ: جس کے وزن پر حمقیٰ ہے (اکثر مصنفین احمق کی جمع حمقا لکھتے ہیں، جو بالکل غلط ہے)

فعائل: جس کے وزن پر عزائم، خصائل، قبائل، فضائل، رسائل وغیرہ بہت سے الفاظ ہیں۔ اس صفحہ پر جمع کے یہ سب الفاظ (فعالل) کے تحت دیئے گئے ہیں جو غلط ہے۔

افاعل: جس کے وزن پر اکابر، افاضل وغیرہ ہیں۔

افاعیل: جس کے وزن پر اسلوب سے اسالیب اور اقلیم سے اقالیم وغیرہ ہیں۔

تفاعل: جس کے وزن پر اردو میں تجارب ہے۔

فواعل: جس کے وزن پر موانع اور خواتم (خاتم کی جمع) ہیں۔

مرتب صاحب نے موانع کو ''فعالل'' کے وزن پر لکھا ہے، جو غلط ہے کیونکہ یہ مانع جمع ہے جو منع سے ہے، فعالل میں دوسرا حرف (ع) اصلی ہے، جب کہ موانع دوسرا حرف یعنی (و) اصلی نہیں۔

(ب) مندرجہ ذیل اوزان کے تحت جو جموع دی گئی ہیں، وہ غلط ہیں۔

فعالل: کے وزن پر عزائم، خصائل، فضائل، قبائل اور موانع کو شمار کرنا غلط ہے۔ اوپر بتایا گیا ہے کہ یہ الفاظ فعائل کے وزن پر ہیں۔

ایک اہم بات اس موقع پر یہ کہ عربی کی جمع خصائل کا مفرد خصیلۃ ہے جس کے معنی ہے، بالوں کا گچھا یا پٹھوں والا گوشت۔ اردو میں خصائل اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کو خصلت کی جمع سمجھا جاتا ہے جیسا کہ وارث سرہندی نے یہ جمع دی ہے، ساتھ ہی دوسری جمع خصال بھی دی ہے، یہی خصلت کی صحیح جمع ہے۔ حقی صاحب نے بھی حرف (خ) میں خصلت کی یہ جمع لکھی ہے مگر ساتھ ہی خصائل جمع بھی لکھی ہے جو درست نہیں۔ فعالل کے وزن پر عسکری کی جمع عساکر صحیح ہے۔ مزید جموع عندلیب کی جمع عنادل اور بلبل کی جمع بلابل ہے، اول الذکر تو اردو میں کثرت سے مستعمل ہے۔

فعالیل: کے وزن پر مکاتیب، مضامین، مجانین، اقالیم، اقانیم کو شمار کرنا قطعاً غلط ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، مکاتیب، مضامین، مجانین اور ایسے دیگر الفاظ جن میں ابتدا میں میم زائد ہے، مفاعیل کے وزن پر ہیں اور اقالیم و اقانیم، افاعیل کے وزن پر۔ حقی صاحب نے ان دونوں اوزان کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ جب کہ وہ عربی کی کتب صرف میں موجود ہیں۔

اس موقع پر ایک فاش غلطی یہ ہے کہ اقانیم کو ''اقنون'' کی جمع کہا گیا جبکہ صحیح یہ ہے کہ یہ اقنوم کی جمع ہے۔ یہ غالباً طباعت کی غلطی ہے۔ اقنوم سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی شخص کے ہیں۔ اس کی صرف جمع اقانیم ثلاثہ کی ترکیب کی صورت میں استعمال ہوتی ہے یعنی (Trinity) اور اس کا استعمال عربی کی عیسائی ادبیات میں ہے۔ شام، لبنان، عراق اور مصر میں اسلام سے قبل بیشتر آبادی عیسائی تھی، ان کے اثر سے یہ لفظ عربی زبان میں داخل ہوا کیونکہ شام، لبنان اور عراق کے عیسائی زیادہ تر عرب تھے۔

اسی صفحہ پر افعال کے وزن کے تحت ''اتبار'' (تے کے ساتھ) طباعت کی غلطی ہے، یہ لفظ ''انبار'' ہوگا، لیکن مشکل یہ ہے کہ ''انبار'' عربی کا نہیں بلکہ فارسی کا لفظ ہے اور یہاں جو اوزان دیے گئے ہیں وہ عربی کی جمع مکسر کے اوزان ہیں اور ''اتبار'' عربی زبان میں کوئی لفظ نہیں۔ شاید حقی صاحب نے لفظ (تبر) کو عربی سمجھ کر اس کی یہ جمع بنادی ہو مگر وہ فارسی ہے۔

(ج) آخر میں مرتب نے عربی جمع مکسر یا جمع تکسیر کا ایک وزن ''فعلان'' دیا ہے اور اس وزن پر اردو میں غزلان (غزال کی جمع) کا لفظ دیا ہے۔ یہ لفظ اردو میں شاید ہی کوئی لکھتا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اردو کے بہت سے ادبا و شعرا (غزلان) سے ناواقف ہوں گے کیونکہ اردو میں غزال کی جمع عام طور پر فارسی انداز میں ''غزالاں'' لکھی جاتی ہے۔ اٹھارھویں صدی کے شاعر رام ترائن موزوں کا مشہور شعر ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

غزال کی یہ جمع نور اللغات، فرہنگ آصفیہ اور وارث سرہندی کی علمی اردو لغت میں بھی موجود نہیں۔ غزلان کے بجائے جناب مرتب اگر لفظ غلمان اس وزن پر دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا کہ یہ لفظ اردو میں معروف و مستعمل ہے۔

جمع مکسر کے ان عربی اوزان پر گفتگو ختم کرنے سے قبل میرا سوال یہ ہے کہ آخر عربی کے ان اوزان کو تحریر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اگر جناب مرتب کی عربی کے علم صرف سے دلچسپی اس کا باعث تھی تو لازم تھا کہ اوزان اور ان پر مبنی الفاظ کو لکھتے وقت صحت کا خیال رکھتے اور علم صرف کی کسی کتاب سے رجوع کر کے اپنی معلومات تازہ و درست کر لیتے۔ میں یہاں ان کے اور دیگر قارئین کی اطلاع کے لیے عصری انداز میں لکھی گئی عربی کی ایک انتہائی مفید کتاب ''جامع الدروس العربیۃ'' (۳، اجزا، ایک جلد میں) تالیف شیخ مصطفیٰ الغلاییني کی نشان دہی کرتا ہوں، یہ کتاب ۱۹۱۲ء سے چھپ رہی ہے اور مسلسل تنقیح کے بعد اس کے اب تک تیس ایڈیشن بیروت سے چھپ چکے ہیں۔ یہ کتاب عرب ممالک میں یونیورسٹی کے طلبہ کو رہنمائی کے لیے بتائی جاتی ہے۔

ایک توضیح جس سے فرہنگ تلفظ کا یہ صفحہ خالی ہے، یہ ہے کہ عربی میں جمع مکسر کی تین قسمیں ہیں: جمع قلۃ (قلت)، اس کے صرف چار وزن ہیں۔ افعال، افعلۃ، فلعتہ، افعل۔ جمع الکثرۃ (کثرت) کے سولہ اوزان ہیں اور پھر منتہی الجموع جس کے انیس اوزان ہیں، جمع قلۃ، تین سے لے کر دس تک کے لیے ہے اور جمع الکثرۃ و منتہی الجموع گیارہ سے لے کر بے انتہا جموع کے لیے ہے۔ بعض عربی مصنفین نے صرف دو جمعیں یعنی جمع القبلۃ و جمع الکثرۃ لکھی ہیں اور ثلاثی، رباعی، خماسی وغیرہ الفاظ سے جمع بنانے کے قواعد و ضوابط ہیں جو علم صرف کی قدیم یا مذکورہ بالا جدید کتاب میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

۲۔ صفحہ (س) پر ایک عنوان ''بعض عام الفاظ کا تلفظ'' کے تحت تین صفحات پر ایسے الفاظ کا تلفظ دیا گیا ہے۔

☆ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس صفحہ پر لفظ (ازدھام) بمعنی ہجوم بھی دیا گیا ہے۔ بہت سے لوگ اس لفظ کو اژدھام بھی لکھتے ہیں، یہ دونوں غلط ہیں۔ صحیح لفظ ''ازدحام'' ہے جو عربی الاصل ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جناب مرتب نے اندر کتاب میں صرف ازدحام ہی دیا ہے لیکن یہاں ابتدا میں انہوں نے اس کا تلفظ بتاتے ہوئے اس طرح ذکر کیا ہے، جیسے یہ املا بھی درست ہے۔

☆ صفحہ (ع) عربی مہینے کے نام جمادی الاول کا تلفظ صحیح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی پہلے لفظ کے جیم پر زبر کے بجائے پیش اور دال پر زیر کے بجائے زبر (فتح) دیا گیا ہے جو درست ہے لیکن یہ صرف آدھی صحیح ہے، کیونکہ اس عربی ترکیب میں الاول غلط ہے، الاولیٰ (دوسرے الف پر پیش) ہونا چاہیے۔ عربی میں اسی طرح لکھا جاتا ہے کیونکہ جمادیٰ (ج پیش و زبر آخر میں

الف مقصورہ) مونث ہے، اس کی صفت بھی عربی قاعدے کے مطابق مؤنث ہے۔

اسی طرح جمادی الثانی بھی غلط لکھا گیا ہے، اسے جمادی الثانیہ یا جمادی الآخرۃ ہونا چاہیے۔ اردو میں بھی عربی زبان سے بخوبی واقف لوگ اسی طرح لکھتے ہیں، یعنی جمادی کے آخر میں ی کا تلفظ نہیں بلکہ الف مقصورہ ہے، جیسے مصطفیٰ میں۔

☆ صفحہ (ف) پر ایک بہت ہی فاش غلطی لفظ ''ولد'' کے تحت ہے، ولد کے معنی بیٹا تو صحیح ہیں، لیکن ''ولدہ'' بمعنی بیٹی غلط ہیں۔ اس سے اندازہ ہوا کہ مرتب موصوف کو کتنی عربی آتی ہے۔ بیٹی کے لیے عربی میں لفظ بنت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب مرتب نے لفظ ولد میں تائے تانیث لگا کر یہ لفظ خود ایجاد کیا ہے۔ یہ خاکسار مرتب موصوف اور عام قارئین کے فائدے کے لیے لکھتا ہے کہ لفظ (ولدۃ) واؤ پر زبر اور لام پر سکون کے ساتھ لفظ ولد کی جمع ہے اور خود یہ لفظ ''وَلَد'' عربی زبان میں مفرد و جمع اور مذکر و مونث سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اور بھی جمعیں ہیں جن کی تفصیل یہاں بے محل ہوگی۔

۳۔ اس فرہنگ میں عربی الفاظ کی بہتات ہے۔ بہت سے لفظ ایسے ہیں جو اردو میں استعمال ہوتے ہیں نہ اردو کی متداول و مستند لغات، جیسے فرہنگ آصفیہ، نور اللغات اور علمی اردو لغت مرتبہ وارث سرہندی میں پائے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں جناب مرتب نے اپنی طرف سے عربی کے بعض الفاظ اختراع فرمائے ہیں جو خود قدیم و جدید عربی لغات جیسے لسان العرب (۱۵ جلدیں باریک حروف)، القاموس المحیط، (۱۴ جزاد و مجلدات) المعجم الوسیط (۲ مجلدات مرتبہ مجمع اللغۃ العربیۃ (عربی زبان اکیڈمی) مصر اور المنجد، بیروت وغیرہ میں بھی نہیں پائے جاتے ہیں۔

☆ اول النوع الفاظ میں ہیں: ارشاش، ارشق، اشدی، اثغار اثلاث، اثیل، ثالیل، ثدی، ثقالہ، ثقت، ثلج، حزون، حصرم، خفی، حقبہ وغیرہ وغیرہ۔

☆ دوسری نوع کے الفاظ ہیں: انغماد، انفاخ، انفاخ روح، انفاخ صور، انفراغ، استثھاء، تبطق، تجیم، انفائیت، خزعیل وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک پہلی نوع کے الفاظ کا تعلق ہے، ان میں سے بعض کا تلفظ غلط دیا گیا ہے۔ بعض الفاظ کی شکل ہی جدا ہے، مثلاً اشدی (الف پر فتحہ ش ساکن، د پر فتحہ اور آخر میں الف مقصورہ)۔ یہ عربی کے لفظ ثدی (د ساکن) بمعنی پستان کی جمع بتائی گئی ہے۔ پھر حرف ''ث'' کے اندراجات میں ثدی جمع اثداء لکھی گئی ہے۔ وہاں محترم مرتب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس لفظ کا تثنیہ ''ثدیان'' ہے۔

☆ پہلی بات تو یہ کہ (ثدی) کے جمع نہ اثدی ہے اور نہ اثداء بلکہ اس کی تین جمعیں ہیں: ثُدِی اور اَثد (ث پر ضمہ، ث پر کسرہ اور د پر پہلی دونوں صورتوں میں کسرہ اور تیسری جمع ث ساکن اور د پر دو سکرے (تنوین) اور اس کا تثنیہ ثدان نہیں بلکہ ثَدْیان ہے کیونکہ اس ثلاثی حرف میں (ی) اصلی ہے۔

☆ (ثالیل) نہیں بلکہ الف پر مد کے ساتھ بہ لفظ ثآلیل۔ ثولوں کی جمع ہے۔ فرہنگ میں اس کا املا ثالول غلط ہے۔

(ثقت) کوئی نہیں ہے۔ یہ عربی فعل وثق یثق ثقۃ کا مصدر ہے اور اس کا املا ثقۃ ہی ہونا چاہیے۔ (حصرم) کا تلفظ فتح سک ص، فتح ر، یعنی ح پر زبر ص ساکن اور پھر ز بر غلط ہے۔ اس کے تلفظ میں ح پر زیر (کسرہ) ہے اور را پر بھی کسرہ ہے یعنی حصرم۔ عرب اپنی روزمرہ کی غیر فصیح بولی (Colloquial) میں حصرم (ح اور ر دونوں پر پیش) بولتے ہیں۔ حقبہ (صفحہ ۴۶۴) کا تلفظ بھی ح پر پیش کے ساتھ دیا ہے، صحیح تلفظ حقبتہ ح کے زیر کے ساتھ ہے۔ ایک دوسرا لفظ حُقُب ہے اور تیسرا لفظ حَقَب (ق ساکن) قرآن مجید میں سورہ کہف آیت ۶۰ میں لفظ حُقُب آیا ہے اور ان الفاظ کی جمع احقاب سورہ نباء کی آیت ۲۳ میں ہے۔ لابثین فیھا احقابا۔ اس کے معنی بھی درست نہیں دیے گئے ہیں۔ یہ صرف اسی (۸۰) سال نہیں بلکہ اسی اور اس سے زائد اور ایک قول کے طابق اس کے معنی ہیں ایک ایسی طویل مدت جس کا کوئی وقت متعین نہیں اور سورہ نبا کی آیت جو دوزخیوں کے بارے میں ہے اس سے یہ آخری معنی ہی درست نظر آتے ہیں۔

جہاں تک دوسرے نوع کے الفاظ کا تعلق ہے، یعنی انغماد، انفاخ، انفراغ، استثھاء، تبطق، تجیم، انفائیت، خزعیل تو یہ وہ الفاظ ہیں جو ادھر ادھر سے مطالعہ کے دوران سامنے آئے۔ یہ بالاستیعاب کتاب پڑھ کر نہیں چنے گئے ہیں۔ یہ سب الفاظ جو عربی کی شکل رکھتے ہیں یا عربی اوزان پر ڈھالے گئے ہیں، عربی لغات میں ہیں نہ عربوں کے استعمال میں۔

☆ انغماد اور انفراغ دونوں فعل غمد اور فرغ سے باب انفعال میں ڈھالے گئے ہیں جو غلط ہیں۔ عربی زبان میں عربی کے ہر ثلاثی مجرد فعل سے ثلاثی مزید کے اوزان پر افعال نہیں ڈھالے جاسکتے۔ مثلاً سمع یسمع سماعا سے انسمع ینسمع انسماعا نہیں ڈھالا جا سکتا، کیونکہ یہ اوزان سامی ہیں، خیاسی نہیں۔ ہاں سمع سے استماع، تسمع، تسمیع، اسماع، تسامع تو آئے ہیں لیکن انسماع اور استسماع نہیں آیا۔ عربی لغت کی کتابوں میں ثلاثی مزید یعنی افعال، انفعال، تفعّل، تفصیل، استفعال، تفاعل، فعاعلۃ کے وزن پر جو الفاظ آئے ہیں، ان میں ایسے الفاظ کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً عربی لغت میں استغفار کا لفظ تو ہے جو ''غفر'' سے ماخوذ ہے، لیکن استدخال کا لفظ دخل سے اخذ کرنا روا نہیں رکھا گیا ہے۔

☆ اسی طرح مصدر ''انفاخ'' بھی غلط ہے جو ''نفخ'' سے ڈھالا گیا ہے اور اس سے بنائے ہوئے دونوں مرکبات لفظی یعنی انفاخ روح و انفاخ صور غلط ہیں۔ دراصل عربی لغات میں باب افعال کے وزن پر ''انفاخ'' مذکور نہیں اور انفاخ روح اور انفاخ صور لکھنا تو بہت ہی غلط ہے۔ قرآن کریم میں نفخ روح اور نفخ صور تو متعدد آیتوں میں آیا ہے لیکن انفاخ روح اور انفاخ صور کہیں نہیں اور قرآن کی عربی فصاحت و بلاغت کا انتہائی اعلیٰ معیار رکھتی ہے۔ معلوم نہیں کہ محترم مرتب فرہنگ نے کبھی کسی عربی لفظ کے لیے قرآن دیکھنے کی زحمت کی یا نہیں لیکن جن کو قرآن پڑھنے کی توفیق ہوتی ہے وہ زیادہ نہیں تو ایک دو آیتیں ایسی جانتے ہوں گے جن میں انفاخ صور نہیں بلکہ نفخ صور و نفخ روح ہے۔ یہاں حسب گنجایش دو آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔ سورۃ السجدۃ کی آیت ۹ ہے:

ثُمَّ سَوّٰهُ وَ نفخ فِيهِ مِنْ روحِهِ

اور نفخ صور سے متعلق آیت سورۃ الحاقۃ کی آیت ۱۳ ہے:

فاذا نفخ فی الصور نفخة واحدة

☆ استثھاء بھی کوئی لفظ نہیں ہے، نہ اردو لغات میں اور نہ عربی لغات میں اور اس کی اختراع بھی غلط ہے۔ کیونکہ اس لفظ کا اصلی مادہ شہی (ش ہ ی) جس کے معنی کسی چیز کے خواہش کرنا اور چاہنا ہیں۔ اس لفظ سے باب افتعال میں اشتہا زیادہ معروف و متداول ہے۔ عربی میں بھی اور اردو میں بھی اور عربی زبان کا باب استفعال کسی چیز کی خواہش کے صیغوں یا افعال میں استعمال ہوتا ہے۔ اب خواہش کی خواہش ایک لایعنی اور مہمل بات ہے۔ اسی سے لفظ شہوت ہے، یعنی خواہش۔ اردو میں یہ جنسی خواہش کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ اشتہا کا فعل عرب ممالک میں سے یمن میں روزمرہ کی بولی میں ذرا بگڑی ہوئی صورت میں استعمال ہوتا ہے۔ وہاں بولا جاتا ہے، ایش تشتی؟ (ایش تشتھی) یعنی تمہیں کیا چاہیے۔ تمہیں کس چیز کی خواہش ہے۔

☆ تبطق (صفحہ ۲۷۸) تو انتہائی حیران کن اور مضحکہ خیز ''ایجاد بندہ'' ہے۔ یہ لفظ بھی اردو لغات میں ہے نہ عربی میں بلکہ عربی میں تو اس کا مادہ اصلی یعنی ب ط ق (بطق) بھی موجود نہیں۔ پوری عربی زبان میں صرف ایک لفظ ''بطاقۃ'' استعمال ہوا ہے

اور آج بھی ہوتا ہے، جس کے معانی ہیں کاغذ کا ایک چھوٹا رقعہ جس پر کچھ لکھا ہوتا ہے۔ عہد جاہلی کی کسی تحریر و تقریر میں اس کا وجود نہیں۔ لغت نویسوں کے مطابق یہ لفظ مصر میں استعمال ہوتا تھا، آرامی الاصل ہے، اور وہیں سے اولین عہد اسلامی میں عربی زبان میں داخل ہوا۔ ماڈرن عربک میں بطاقۃ شخصیۃ شناختی کارڈ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اس کے جو معنی صاحب فرہنگ نے دیے ہیں، یعنی پوشیدہ رکھنا، چھپانا وہ بھی عربی زبان میں نہیں۔

میں اس لفظ کی طباعت کی غلطی سمجھ کر اس کی تصحیح تبطن (ن کے ساتھ) کر لیتا لیکن کیا کیا جائے کہ عربی زبان میں تبطن کے بھی وہ معنی نہیں جو مرتب نے لکھے ہیں بلکہ تبطن الوادی کے معنی وادی میں داخل ہونے کے ہیں اور تبطن الامر کے معنی کسی چیز کی حقیقت جاننا اور معاملے کی تہہ تک پہنچنا ہے، چھپانے کے معنی کہیں نہیں۔ عربی میں اس معنی کے لیے لفظ استبطان زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ بعض اردو لغات (جیسے علمی اردو لغت) میں لفظ تبطن کے وہ معنی لکھے ہیں جو حقی صاحب نے اختیار کیے ہیں (یہ اس مفروضے پر کہ تبطن طباعت کی غلطی ہے، اصل لفظ تبطن ہے) لیکن اطمینان کی بات ہے کہ فرہنگ آصفیہ کے مصنف سید احمد دہلوی نے اپنی فرہنگ میں اس لفظ کو نہیں لیا ہے۔ مجھے ان کی لغت دیکھنے سے انکشاف ہوا کہ وہ بہتر عربی جانتے تھے اور اپنی فرہنگ میں انہوں نے بے جا عربی الفاظ کی بھرمار نہیں کی ہے۔

☆ جسیم (بتقدیم ح) بھی غلط لفظ ہے۔ عربی میں یہ لفظ کہیں نہیں۔ بعض اردو لغت نویسوں (جیسے وارث سرہندی وغیرہ) نے اسے اختیار کیا ہے لیکن یہ ہے غلط، اسی لیے صاحب فرہنگ آصفیہ نے اس لفظ کو نہیں لیا ہے۔ ایک اور لفظ جو اردو والوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ ضخیم ہے، یہ بھی عربی میں نہیں اور غلط ہے۔ کیونکہ موٹائی کی صفت کے لیے یہ لفظ نہیں بلکہ ''ضخم'' استعمال کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے ''کتاب'' ''ضخم''۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے بھی لفظ ضخیم کو اپنی فرہنگ میں شامل نہیں کیا ہے، پھر جسم کے معنی موٹائی اور ضخامت نہیں بلکہ لمبائی چوڑائی ہے۔

☆ انفائیت بھی ایک بے معنی اور مہمل لفظ ہے۔ اس کا عربی لغت میں وجود ہے نہ اردو میں، عربی میں اصل ثلاثی لفظ ''نفی'' سے باب افعال میں انفاء نہیں آتا ہے۔ یہ ایجاد بندہ کے زمرے میں آتا ہے اور عربی زبان سے بے خبری کی دلیل ہے۔

☆ خرعیل بھی عربی میں کوئی لفظ نہیں۔ اگر حق صاحب اس کے حروف اور ان کے تلفظ میں حرف (ی) ساکن کی تصریح نہ کرتے تو میں اور دیگر قاری اس کی طباعت کی غلطی سمجھتے۔ اصل صحیح لفظ خرعبل (ب کے ساتھ) ہے۔ اس کے معنی خرافات درست لکھے ہیں۔ جمع خرعبلات نہیں لکھی۔

ص ۴۴ پر حرف الف میں ''استقداس'' بھی غلط ہے۔ یہ کسی اردو لغت میں ہے نہ عربی میں۔ عربی میں اس کا مادہ اصلی ''قدس'' جس کے معنی پاک و طاہر کے ہیں۔ اس ثلاثی مجرد فعل سے صرف دو ثلاثی مزید آئے ہیں، ایک قدس سے تقدیس اور دوسرا باب تفعل میں تقدس اور یہ دونوں اردو میں مستعمل ہیں اور ان کے معانی بھی معروف ہیں۔ عربوں نے اس مادہ سے باب استفعال میں استقداس نہیں نکالا، اس کے معنی بھی غلط لکھے ہیں، خشوع و خضوع کا تقدس سے کوئی تعلق نہیں۔

ص ۴۵۹ پر ایک لفظ ''حریسہ'' دیا گیا ہے، جس کے معنی لکھے ہیں ایک طرح کا کھچڑا یا حلیم۔ یہ غلط املا ہے۔ یہ لفظ بڑی (ح) سے نہیں بلکہ چھوٹی (ہ) یا ہائے ہوز اس سے ہے۔ یہ عربی کا لفظ ہے اور عربی میں ھرس کے معنی ہیں کوٹنا، توڑنا۔ چونکہ ہریسہ ایک ایسا کھانا ہے، جس میں گیہوں، جو وغیرہ کو کوٹ کر گوشت کے ساتھ اس طرح پکایا جاتا ہے کہ وہ ایک لپٹا سا بن جاتا ہے اور گوشت اس میں بالکل تحلیل ہو جاتا ہے چونکہ یہ ہلکی آگ پر رات بھر پکایا جاتا ہے اس لیے اس کو ہریسہ کہا جاتا ہے۔ مہراس لکڑی کے اس بڑے سے باون کو کہا جاتا ہے جس میں اجناس اور گوشت کوٹا جاتا ہے۔ یہ لفظ ہریسہ اردو کی دوسری لغات میں صحیح املاء کے ساتھ موجود ہے۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسی فرہنگ جو تلفظ کی تصحیح کے لیے تصنیف کی گئی ہے، اس میں الفاظ کا املا تک غلط ہے۔

غلط تلفظات:

اوپر بعض الفاظ کے غلط تلفظ کی نشان دہی کی جا چکی ہے، جیسے حُقبہ (پیش کے ساتھ)۔ ذیل میں ایسے بعض دیگر الفاظ ذکر کیے جاتے ہیں جو یوں ہی ورق گردانی کرتے ہوئے سامنے آئے۔ اس میں استیعاب نہیں ہے۔

ص ۱۶۴ پر بضعۃ (ب کے کسرہ کے ساتھ)، صحیح لفظ بضعۃ (ب کے فتحہ سے) اور جس حدیث نبوی کا حوالہ دیا گیا، اس میں یہ لفظ اسی طرح (ب) کے زبر کے ساتھ ہے، ''فاطمۃ بضعۃ منی'' یہ حدیث بخاری میں باب مناقب فاطمہ میں ہے، کسرہ کے ساتھ بضعۃ کے معنی چند کے ہیں۔

ص ۲۷۹ پر حرف ''ت'' کے اندراجات میں تبیّض اور تبیّن ہمزہ کے ساتھ غلط ہیں۔ مصنف نے دونوں لفظوں کے ساتھ یہ جملہ لکھا ہے نیز تبیّض و تبیّن۔ یہ بات غلط ہے، صحیح صرف مؤخر الذکر الفاظ ہیں دراصل ان دونوں لفظوں کے مادہ اصل میں کہیں ہمزہ نہیں کہ پہلے کا مادہ بیض ہے جس سے باب تفعیل پر ''تبییض'' ہے اور دوسرے کا مادہ اصلی بین ہے جس سے باب تفعیل ''تبیین'' ہے۔

ص ۳۶۵ پر جمادی الاول اور جمادی الآخر تلفظ اور املاء دونوں اعتبار سے غلط ہیں۔ ان کے املاء کی توضیح پہلے کی جا چکی جمادی میں حرف 'ی' پر الف مقصورہ لکھنا چاہیے جیسے مصطفیٰ، مرتضیٰ وغیرہ میں ہوتا ہے۔

ص ۴۹۳ پر خلیہ کے تلفظ میں 'ل' پر سکون لکھا ہے، جو غلط ہے 'ل' پر کسرہ ہے، یعنی بہ لفظ ''خلیہ'' ہے، جس کے معنی Cell صحیح لکھے ہیں۔ ص ۵۷۲ پر ''رعایا'' پر کسرہ کے ساتھ غلط ہے، صحیح تلفظ 'ر' پر فتحہ کے ساتھ ہے۔ ص ۷۴۱ پر ''قدس سرہ'' (د پر کسرہ، ر پر ضمہ) غلط ہے، صحیح 'د' پر فتحہ اور 'ر' پر فتحہ کے ساتھ ہے۔ عربی میں دعائیہ فقرے اسی طرح ہوتے ہیں، جیسے طال عمرہ وغیرہ۔

غلط املاء و غلط تلفظ:

ص ۸۲۷ ''مابقی'' غلط ہے، صحیح املاء اور تلفظ مابقی (ق پر کسرہ) ہے کیونکہ یہ عربی لفظ بقی (ق پر کسرہ) ماضی اور بقی (ق پر الف مقصورہ) مضارع سے ماخوذ ہے۔ ''ما'' کے ساتھ مرکب صورت میں اور وقف کی حالت میں مابقی ہے۔

ص ۸۲۸ پر ''ماذن'' اور اس کے مفرد ''ماذنہ'' کا املاء، تلفظ اور معانی سب غلط ہیں۔ صحیح الماذن (الف پر مد کے ساتھ) ہے، اور مفرد ''مئذنہ'' (میم پر کسرہ ذ پر فتحہ) یعنی اذان دینے کی جگہ۔ منارہ جو اردو میں مینار ہو گیا ہے، اس کے معنی ہیں نور یا روشنی کی جگہ۔ سمندر کے کنارے جہازوں کی رہنمائی کے لیے لائٹ ہاؤس (Light House) بنا ہوتا ہے، اس کو بھی منارہ کہتے ہیں۔ اس کو مئذنہ نہیں کہہ سکتے، قطب مینار کو بھی مئذنہ نہیں کہہ سکتے۔

ص ۷۴۳ قزیفہ (ز کے ساتھ) غلط املاء ہے، یہ لفظ ''ذ'' کے ساتھ قذیفہ ہے، اور یہ فعل قذف سے ماخوذ ہے، جس کے معنی پھینکنا ہے۔ جدید عربی میں توپ گولا اس کے صحیح معنی ہیں لیکن انگریزی میں اس کے لیے میزائل (Missile) متبادل غلط ہے کہ Missile کے لیے عربی میں لفظ ''صاروخ'' ہے۔ قذیفہ کے لیے انگریزی کا متبادل لفظ Shell ہے اردو لغت میں یہ لفظ نہیں۔ یہ جدید عربی کا خالص عربی لفظ ہے۔

ص ۵۶۲ پر ایک عجیب لفظ ''راسو'' دیا گیا ہے جو اہل زبان اردو داں جانتے ہیں نہ وہ متداول و مستند اردو لغات میں موجود ہے۔ شاید یہ کسی مقامی بولی کا لفظ ہے اس کے معنی دیئے گئے ہیں۔ نیولا اور عرسہ، نیولا تو معروف ہے لیکن عرسہ کوئی نہیں جانتا صحیح لفظ ابن عرس (ع پر کسرہ) ہے جو عربی میں نیولے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ محترم مؤلف اور قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایک لفظ ''عرس'' عربی زبان میں دولہا اور دلہن دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن ''عرسہ'' کوئی لفظ نہیں۔

ص ۴۶۷ پر حلی کی جمع حلی کا تلفظ (ضمہ ح کسرہ ل بروزن علی) واملا غلط ہے۔ اس کا صحیح املا و تلفظ حلی اور حلی (ح ضمہ یا کسرہ، ل کسرہ اور ی تشدید) بمعنی زیورات ہے۔ یہ حلیۃ (بکسرہ ح) کی جمع ہے۔

غلط الفاظ غلط معانی:

اس فرہنگ میں بہت سے الفاظ غلط ہیں یا ان کے معانی بھی غلط ہیں۔

ص ۴۵۴ حجت البالغہ غلط ہے، صحیح ہے الحجۃ البالغۃ یا پھر ''حجۃ اللہ البالغۃ'' جو قرآن میں ہے۔ لفظ حجۃ بمعنی حج دیا گیا ہے۔ پھر ترکیب لفظی دی گئی ہے۔ حجت البلاغ و حجت الوداع جو غلط ہیں دونوں جگہ حجۃ البلاغ و حجۃ الوداع ہونا چاہیے۔

ص ۴۶۰ حسن (ح فتحہ، س فتحہ) کی جمع حسنات دی گئی ہے جو غلط ہے، حسنات جمع حسنہ کی ہے جب کہ حسن کی جمع حسان ہے۔ (بکسرہ ح)

ص ۴۶۱ حشیشین ''حسن بن صباح کے پیروؤں کے لیے لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔ صحیح لفظ عربی میں حشاشین ہے یعنی حشیش یا بھنگ پینے والے۔

ایضاً ''حصیر'' کی جمع ''حصائر'' دی گئی ہے جو غلط ہے، حصائر درحقیقت حصیرۃ کی جمع ہے اور حصیر کی جمع حصر (ح ضمہ، ص ضمہ) ہے۔

ص ۴۶۲ ''حضارت'' بمعنی موجودگی۔ کوئی شک نہیں کہ عربی فعل حصر کا ایک مصدر حضور کے علاوہ حضارت بھی (گول ۃ) ہے لیکن وہ زیادہ تر تمدن یا مدنیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے حضارۃ اسلامیۃ یا حضارۃ اوربیۃ موجودگی کے لیے حضور ہی عربی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ صاحب فرہنگ سے زیادہ بہتر وارث سرہندی نے کیا ہے کہ علمی اردو لغت میں اس کے معنی مدنیت دے دیے ہیں۔

ص ۴۶۲ لفظ حضن کا تلفظ دیا گیا ہے (فتح ح سک ض) اور معنی دیئے گئے ہیں آغوش جو غلط ہیں۔ آغوش کے معنی ہیں حضن جس کا تلفظ بکسر (ح) وسکون (ض) ہے، البتہ دوسرے معنی یعنی مرغی کا انڈا سینا (ح) کے فتحہ کے ساتھ درست ہے۔ یہاں بھی مرغی کی تخصیص درست نہیں، کوئی بھی پرندہ جو انڈا سیتا ہے اس کے اس عمل کے لیے حضن (بفتح ح) استعمال ہوتا ہے۔

بچہ دانی (Uterus, Womb) کے لیے ''حضنہ دانی'' کی ترکیب مہمل اور غلط ہے۔ حیوانیات میں یہ ''ایجاد بندہ'' درست نہیں کیونکہ بنیادی طور پر حضن، تربیت کے لیے استعمال ہوتا ہے اسی لیے عربی میں بچوں کی نرسری کو ''دار الحضانۃ'' کہا جاتا ہے اور آیا کہ حاضنہ۔ پرندوں کے جسم کے اندر بچہ پلتا ہی نہیں ہے لہٰذا یہاں انگریزی کا لفظ Embryo بھی بے محل ہے کیوں کہ اس لفظ کے مقابل تو تلفظ جنین ہے۔ لفظ حضن سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ص ۴۶۶ حلم (فتح ح ل) سرپستان۔ یہ غلط ہے، صحیح لفظ عربی زبان میں حلمۃ (آخر میں گول ۃ)

ص ۴۶۸ حوطایا (فتح ح، سک م) اس کے ساتھ عبارت درج ہے۔ ''آنحضرت (ﷺ) کا ایک سری لقب'' اس کے بعد غالباً مقتدرہ کی طرف سے عبارت درج ہے (غالباً ح م ط ی کا مجموعہ)

یہ سب کچھ غلط ہے۔ عربی کی ضخیم اور مستند لغت ''لسان العرب'' میں مادہ حمط (ح م ط) میں ایک قدیم تراقت نویس ازہری کے حوالے سے ایک مسلمان ہو جانے والے یعنی یہودی کعب الاحبار کا قول درج ہے کہ قدیم کتب (توراۃ وغیرہ) میں حضور ﷺ کا جو نام محمد، احمد، التوکل، المختار، فارقلیط درج تھے، ان میں سے ایک نام حمیاطا (بکسر ح وسکون و فتح ی) تھا، جس کے معنی عربی زبان میں مقدسات کا احترام کرنے والا۔

اس طرح نہ تو لفظ حطایا درست ہے، اور نہ یہ کہ آنحضرت کا سری لقب ہے یہ ایک غیر ذمہ دارانہ انداز تحریر ہے اور اس کا مادہ (ح م ط ی) کہنا بھی غلط ہے۔ کیونکہ جب یہ عبرانی لفظ ہے تو اس کا مادہ تلاش کرنا بے سود ہے۔ اس موقع پر مجھے دو تین سال قبل کراچی یونیورسٹی کے سلیکشن بورڈ کی میٹنگ کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے، عربی کے لکچرار کے لیے ہم انٹرویو لے رہے تھے۔ ایک پاکستانی نوجوان جو لیبیا میں پیدا ہوا تھا اور اس کی گریجوایشن تک تمام تعلیم بن غازی، لیبیا، میں ہوئی تھی اس کا نام تھا آصف۔ انٹرویو میں شریک ایک صاحب نے جو اردو کے مشہور صاحب قلم، محقق بلکہ اردو ڈکشنری بورڈ میں ایک اہم منصب پر فائز رہے، نے اس نوجوان سے پوچھا تمہارے نام آصف کا مادہ اصلی کیا ہے۔ لڑکا گھبرا گیا اور کچھ جواب نہ دے سکا۔ جواب دیتا بھی کیا کیونکہ یہ لفظ عبرانی ہے۔ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے وزیر کا نام تھا، عبرانی میں اس کا تلفظ آصاف ہے۔ آج بھی اسرائیل میں بعض یہودیوں کے نام آصاف ہوتے ہیں۔ میں ان محترم ڈاکٹر صاحب کے احترام کے خیال سے اس میٹنگ میں نہ کہہ سکا کہ یہ سوال ہی غلط ہے کیونکہ یہ عبرانی لفظ ہے۔ اس لیے عربی میں اس کا مادہ اصلی ڈھونڈنا بے کار ہے۔

بعد میں مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ صاحب فرہنگ آصفیہ نے تصریح کر دی ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے، واقعی سید احمد دہلوی بہت ذی علم آدمی ہیں۔

یاد رہے کہ حدیث نبوی اور سیرت نبوی کی کسی مستند اور معتبر کتاب میں حضور ﷺ کا یہ لقب مذکور نہیں۔ صرف بعض قدیم لغت نویسوں نے عہد خلافت راشدہ میں ایک نومسلم یہودی عالم کعب الاحبار کے قول کی بنا پر اس لفظ حمیاطا یا حمیاطی کو حضور ﷺ کا لقب قرار دیا ہے، لیکن یہ ملحوظ خاطر رہے کہ کعب الاحبار سے منقول بہت سے احادیث موضوع اور ضعیف ہیں۔

ص ۴۶۸ پر مادہ حمق میں احمق کی جمع حمقاذ کر کی گئی ہے، جو غلط ہے۔ یہ جمع فعلی کے وزن پر حمقی ہے (بفتح ح وسکون میم و الف مقصورہ) اس وزن پر دیگر جمع کے الفاظ ہیں موتی، میت کی جمع، مرضی مریض کی جمع وغیرہ۔ افسوس کہ یہ غلطی اردو کے تمام مصنفین کرتے ہیں، حتیٰ کہ وارث سرہندی نے بھی یہی غلط جمع حمقادی ہے لیکن صاحب فرہنگ آصفیہ بہت محتاط آدمی تھے، انہوں نے احمق کی کوئی جمع نہیں دی ہے۔

ص ۴۶۵ پر ''حلاج'' کے تحت ''انا الحق'' کا نعرہ لگانے والے قدیم صوفی کا نام منصور بن حسین دیا ہے۔ یہ ایک عجیب اور افسوس ناک غلطی ہے۔ ان کا صحیح نام حسین بن منصور ہے۔ یہ نام عربی و فارسی، اردو کے تمام قدیم و جدید تذکروں میں ملتا ہے، البتہ شاعروں نے فارسی و اردو اشعار میں باپ کا نام بیٹے کو دے دیا ہے۔ یہ اس دور میں بھی ہوتا ہے، جیسا کہ مصر کے مرحوم جمال عبدالناصر کو لوگ عبدالناصر یا صرف ناصر کے نام کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ عبدالناصر ان کے باپ کا نام تھا اور ان کے مصری ساتھی ان کو جمال کے نام سے ہی یاد کرتے تھے۔

ص ۴۵۹ پر ''حرونی'' کے معنی دیئے ہیں ''حدیث کا راوی، محدث'' پر سراسر غلط ہے۔ دراصل حرونی، جس کی جمع حروفیہ عربی میں کی جاتی ہے، ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو حدیث کے صرف ظاہری (Literal) معنی پر اصرار کرتے ہیں۔ اس کی

تاویل اور مجازی معنی کو جائز نہیں سمجھتے۔ ان کا دوسرا مشہور نام ''ظاہریہ'' ہے ان کے امام کا نام علی بن داؤد تھا جنہیں مذہب ظاہری کا امام سمجھا جاتا ہے۔

ص ۸۵۸ ''مرفاع'' کے معنی Lift دیئے گئے ہیں جو غلط ہے۔ مرفاع Crane کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ Lift کے لیے عربی زبان میں مصعد (بکسر میم وسکون صاد) استعمال ہوتا ہے، کیونکہ جب آدمی اوپر چڑھتا ہے تو اس کے لیے عربی میں ''صعد'' کہا جاتا ''رفع'' نہیں۔

ص ۸۶۳ ''مساہمت کے ایک معنی شرکت تو درست ہیں، لیکن دوسرا معنی شریک جودیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ شریک کے لیے لفظ ''مساہم'' (بضمہ میم وکسرہ ہ) ہے۔

ص ۳۶۳ پر ''جزوی'' اور ''جزئی'' دونوں تلفظ دیئے گئے ہیں اور جمع جزئیات دی گئی ہے۔ یہ غلط در غلط ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ جزئیات، جزئی کی جمع نہیں بلکہ جزئیۃ کی جمع ہے، جو فلسفہ کی سائنس میں ایک علمی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر لفظ ''جزوی'' صحیح ہے تو جزئیات کی طرح جزویات بھی جمع لکھنا چاہیے تھی۔

اسی لفظ ''جزء'' (صحیح جزء) کے ضمن میں نیچے ''جزلاینفک'' دیا گیا ہے، اور پھر ''جزلاینفک'' یہ جمعیں اور تراکیب لفظ ''جز'' کے تحت دی گئی اور اس کی دوسری فارسی تراکیب: جزبندی، جزوان، جزرس، جزوقتی دی گئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عربی کے اس لفظ کے بارے میں قدیم سے اردو تحریروں اور اردو لغات میں بڑی ابتری کی کیفیت (Confusion) ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں لکھی جانے والی لغت فرہنگ آصفیہ میں یہ لفظ تنہا اور مرکب صورت میں ''جزو'' اس طرح لکھا گیا ہے: جزولاینفک، جزولاینجزی، جزوبندی، جزورسی وغیرہ وغیرہ۔ بعد میں فارسی تراکیب جزبندی، جزدان، جزرس وغیرہ میں واو ختم ہوگیا (علمی اردو لغت) لیکن اس لغت میں بھی لفظ ''جزو'' پر اضافت کی وجہ سے ''جزولاینفک'' دیا گیا ہے۔ حقی صاحب نے اپنی فرہنگ تلفظ میں اس لفظ سے (و) ختم کر دیا ہے اور لفظ ''جزئیات'' میں ہمزہ کا اضافہ کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انجمن ترقی اردو کے اصلاحی تصرفات کے پروگرام کے مطابق ہو یا بہت ممکن ہے کہ حقی صاحب کا خود یہ تصرف ہو۔ بہر حال قدیم سے اس لفظ کے ساتھ غلط برتاؤ ہوتا چلا آرہا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض قدیم عرب اس لفظ کے آخر میں جو ہمزہ ہے اس کو ''و'' کے اوپر (جزوٴ) املا کے پرانے عربی اسلوب کے مطابق لکھا کرتے تھے۔ لیکن اصلاً یہ تین حرفی لفظ ہے اور (ج ز ء) سے مرکب ہے۔ یعنی لفظ کے آخر میں حرف ہمزہ لفظ کے حروف اصلی میں سے ہے، واو نہیں۔ اس لیے قدیم عربی لغات جیسے لسان العرب، القاموس المحیط وغیرہ جو لفظ کے حرف آخر پر ترتیب دیئے گئے ہیں، ان میں لفظ ''جزء'' حرف ہمزہ میں ملے گا واو میں نہیں۔ قدیم اردو لکھنے والوں کی یہ زیادتی تھی کہ انہوں نے ہمزے کے بجائے واو کو اس کا حرف آخر بنا دیا، جید لکھنے والوں (جن میں مصنف فرہنگ تلفظ بھی شامل ہیں) کی یہ زیادتی ہے کہ انہوں نے اس سہ حرفی لفظ کا حرف آخر یعنی ہمزہ سرے سے ختم کر دیا لیکن جزئیات میں اس کو باقی رکھا۔ اس میں معتدل اور معقول رویہ یہ ہے کہ اس لفظ کو اس کی عربی اصلی ہیئت کی طرح جزء (بغیر واو کے) لکھا جائے اور جمع اجزاء میں ہمزہ لکھا جائے اور عربی تراکیب جزء لاینجز اور جزء لاینفک وغیرہ میں بھی۔ فارسی تراکیب جزدان، جزرس، جزبندی، جزوقتی میں اس کو بغیر ہمزے کے لکھا جائے اور جزو اور جزوی کو غلط قرار دیا جائے۔ میں ذاتی طور پر جزء اور جزئی ہی لکھتا ہوں اور میں نے اردو کے عظیم مصنف مولانا سید ابوالحسن ندوی مرحوم کو بھی ایسا ہی لکھتے پایا ہے۔ غالباً مولانا شبلی وغیرہ نے اپنے عہد کے مطابق جزوی لکھا ہے جو بہر حال غلط ہے۔

اس سے زیادہ اور اس کے مماثل غلطی فرہنگ تلفظ میں جزء ''لاینجزی'' کی ترکیب کے آخری لفظ ''لاینجزی'' میں ہے۔ برصغیر کے اردو نویسوں کی یہ غلطی قدیم سے چلی آرہی ہے۔ ایک ایسی فرہنگ جس میں تلفظ صحیح کیا جارہا ہے، مناسب بلکہ ضروری تھا کہ اس میں الفاظ کا املا بھی درست کر دیا جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس لفظ کے آخر میں الف مقصورہ کس منطق کی رو سے داخل ہوگیا؟ درحقیقت عربی زبان میں ایک فعل ماضی ہے: جزا (عربی املاء کے اصول کے مطابق ہمزہ مفتوح ہو تو وہ الف پر لکھا جاتا ہے) باب تفعل (جس کے وزن پر اردو میں تحمل، تصرف وغیرہ ہیں) میں لفظ ماضی کی صورت میں تجزأ (الف پر ہمزہ اور اس پر فتحہ) ہے جس سے مضارع یتجزأ (الف پر ہمزہ مضمومہ) ہے۔ یہی لفظ جس کے شروع میں حرف نفی کا اضافہ ہے، اس ترکیب ''جزء لاینجزا'' میں ہمزہ کے سکون کے ساتھ ہے کیونکہ عربی میں وقف کی صورت میں آخری حرف ساکن ہوتا ہے۔ یہ لفظ عباسی عہد میں مسلمان فلاسفہ و متکلمین کی ایجاد ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں وہ جزء (یا جوہر) جس کے مزید اجزاء نہیں ہو سکتے لیکن بیسویں صدی میں اس ایٹم (Atom) کے بھی مزید اجزاء ہوگئے۔

لفظ جزء پر اس تفصیل سے لکھنے کا محرک یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو، مقتدرہ یا اردو ڈکشنری بورڈ، جو اصلاح زبان کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں، اس لفظ اور اس ترکیب لفظی (جزء لاینجز) کا املا ہمیشہ کے لیے صحیح کر دیں۔ اس میں کسی قسم کا تردد نہیں کرنا چاہیے اور جس طرح انجمن ترقی اردو نے قدما کے بہت سے دیگر الفاظ کے املاء کی تصحیح کی ہے، اس کی بھی کر دینا چاہیے۔

ص ۶۸۴ پر ''ضحاک'' کے تحت ''پیشادی خاندان'' غلط ہے، ایران کے اس قدیم خاندان کا نام پیشدادی تھا۔ یہ غالباً طباعت کی غلطی ہے۔

ص ۶۸۴ لفظ ''ضر'' کے تحت جملہ قرآنی سے استشہاد غلط ہے اور اس لفظ قرآنی کو ''مسنی الضر'' غلط لکھا گیا ہے۔ قرآن میں اس دعائے ایوبی کے موقع پر لفظ الضر (ض پر ضمہ) ہے، الضر (فتحہ کے ساتھ) نہیں ہے۔ قرآن سے استشہاد میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہے، افسوس کہ یہ ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ عربی زبان میں یہ لفظ ض پر فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ہے لیکن میری ناچیز رائے میں تو بہت سے دیگر غیر ضروری عربی الفاظ کی طرح اس کو بھی لکھنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اردو میں تو صرف لفظ ضرر ہی استعمال ہوتا ہے۔

ایک اور جگہ صفحہ ۳۲۷ پر لفظ ففر میں حرفی تلفظ دینے میں غلطی (فت ف سک ف) ہے، کیونکہ اس میں دوسری ف پر سکون نہیں بلکہ کسرہ ہے۔ اصل میں یہ لفظ ایک جملہ قرآنی سے ماخوذ ہے، وہ پورا جملہ ''ففروا الی اللہ'' یہاں لکھ دیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ (یہ سورۃ الذاریات، آیت نمبر ۵۰ میں ہے)

ص ۳۳۷ پر ''فکر'' کے تحت ''فکرت'' کا لفظ اور اس کی جمع دونوں غلط ہیں۔ صحیح لفظ فکرۃ ہے۔ اس کی جمع فکر (ف ضمہ، ک ضمہ) نہیں بلکہ فکر (ف کسرہ، ک فتحہ) ہے اور افکار اس لفظ کی نہیں بلکہ صرف ''فکر'' کی جمع ہے۔

اسی صفحہ ۳۳۷ پر لفظ فلاحت (شد، ل) بمعنی کاشتکاری غلط ہے۔ اس لفظ میں ل پر تشدید نہیں ہے اور اس کی (ف) پر کسرہ ہے فتحہ نہیں، بالکل اس طرح جیسے زراعت کا لفظ ہے، فلاح اور فلاحت۔ یہ دونوں لفظ خالص عربی ہیں اور اردو میں مستعمل نہیں لہٰذا انہیں اردو فرہنگ تلفظ میں شامل کرنا تعجب خیز ہے۔

ص ۳۴۷ پر ''فی بشوق'' کے تحت قرآن کریم کی ایک سورت کا غلط املا، صفت دیا گیا ہے۔ صحیح صفت (ص کی طرح ف پر بھی الف مقصورہ ہے)

اس صفحہ پر ''فواد'' دیا گیا ہے۔ صحیح عربی لفظ فؤاد (واو پر ہمزہ اور تلفظ صرف ہمزہ مفتوحہ) ہے۔ اس کے معنی صرف دل ہے، جگر نہیں، جگر کو عربی میں کبد (ک فتحہ، ب کسرہ) کہتے ہیں، اور فواد مجازاً عقل کو بھی کہتے ہیں۔

ص ۳۶ ''فی'' کو ''حرف جار'' لکھا گیا ہے، صحیح لفظ حرف جر ہے۔ جار اس لفظ کو کہتے ہیں جو ترکیب اضافی میں مضاف کہلاتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ مضاف الیہ پر حرکت جر یا کسرہ ہوتا ہے جیسے غلام زید (د پر دو زیر) اس ترکیب میں مضاف غلام ''جار'' اور زید مجرور ہے۔ جار و مجرور کی دوسری صورت یہ ہے کہ یہ حروف جر جیسے فی، علی، من، فوق کے ذریعہ ہو جیسے، فی الکتاب، فوق السریر، من المدرسۃ وغیرہ ان سب تراکیب میں حروف جر کی وجہ سے کتاب، سریر اور مدرسہ پر کسرہ آ گیا ہے اور یہ اعرابی ترکیب میں مجرور ہیں اور فی، فوق، من جار ہیں۔ اس لفظ کے معنی کھینچنے والا اور مجرور کے معنی ہیں کھینچا ہوا۔ اور ان کو حروف جر اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اسم کو حرکت یا حرف کے ذریعہ فعل کی صورت دیتے ہیں۔

ص ۵۰ عصابہ، جو عربی لفظ ع فتحہ (زبر) کے ساتھ دیا گیا ہے، کا صحیح تلفظ یہ ہے کہ ''ع'' پر زیر ہے۔ اس لفظ کے معنی بھی سربند ناقص ہیں۔ پگڑی وغیرہ کے علاوہ اس کے ایک معنی انسانوں کے ایک گروہ کے بھی ہیں اور اس معنی میں یہ لفظ حدیث نبوی میں آیا ہے۔ جنگ بدر کے موقع پر حضور ﷺ نے جو دعا مانگی تھی اس میں مسلمانوں کے فریق کو ''عصابۃ'' کے نام سے یاد کیا تھا، مزید یہ کہ عصابہ گھوڑوں اور پرندوں کے غول کو بھی کہتے ہیں۔

ص ۶۳۱ ''سلوا (بفتح س وسکون ل)'' اس کا درست املاء سلویٰ (آخر میں ی پر الف مقصورہ ہے) ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس لفظ کے فوراً بعد ایک دوسرا عربی لفظ سلویٰ دیا گیا ہے۔ اس ٹھیٹ عربی لفظ کے معنی تسلی درست دیے گئے ہیں۔ پہلے لفظ کے معنی دیے گئے ہیں ''آسمانی نعمت جو از روئے اساطیر بنی اسرائیل پر اتری تھی''۔ جس انسان کو بھی قرآن یا مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر سے ذرا سا بھی لگاؤ ہے وہ جانتا ہے کہ اس معنی میں یہ لفظ ''من و سلویٰ'' کا ایک جزء ہے اور قرآن اور تمام مذہبی ادبیات میں اس کا املاء دوسرے لفظ سلویٰ کی طرح آخر میں الف مقصورہ کے ساتھ ہے۔ اس طرح فرہنگ تلفظ میں اس کا دیا ہوا املا غلط ہے۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ یہ لفظ اردو میں تنہا استعمال نہیں ہوتا بلکہ لفظ مَن (میم پر تشدید) کے ساتھ ہی، یعنی من و سلویٰ جیسا کہ قرآن کی سورہ بقرہ، سورہ اعراف اور سورہ طٰہٰ میں یہ لفظ ہمیشہ مَن کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور فرہنگ آصفیہ میں دیے ہوئے متعدد اردو اشعار میں ہے۔

اردو کی مستند لغت فرہنگ آصفیہ میں یہ لفظ حرف میم میں من و سلویٰ کی ترکیب میں دیا گیا ہے اور وہاں اس کا املاء بھی درست (الف مقصورہ کے ساتھ) دیا گیا ہے۔

تیسری انتہائی اہم بات یہ ہے کہ مصنف نے اس لفظ کی تشریح میں جیسا کہ اوپر گزرا اس کو ''از روئے اساطیر'' یعنی خرافات (Mythology) ایک آسمانی نعمت قرار دیا ہے جو بنی اسرائیل پر اتری تھی۔ یہ ایک افسوس ناک بد عقیدگی کی علامت اور غیر محتاط انداز بیان ہے کہ قرآن میں مذکور ایک تاریخی واقعہ کو ایک اسطوری یعنی خرافاتی روایت کہا جائے، اور ایک ایسی کتاب میں جو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک مؤقر علمی ادارے کی طرف سے شائع ہو، یقیناً یہ قابل مذمت فعل ہے اور اس پر احتجاج ہر صاحب ایمان کا فرض ہے۔

ص ۶۳۱ سلوت (س فتحہ، ل سکون، و فتحہ) اس کے معنی دیے گئے ہیں ''طمانیت، قناعت، دلجمعی'' علامت اضافہ [ ] کے اندر اس کو عربی لفظ کہا گیا ہے اور اس کا تلفظ دیا گیا ہے: سلوۃ (س فتحہ، ل سکون) لفظ تو یہ واقعۃً عربی ہے لیکن عربی زبان میں اس کا تلفظ س پر زبر اور پیش (فتحہ و ضمہ) دونوں طرح سے ہے۔ اس کے معنی ہیں ''ہر وہ چیز جو تسلی بخش ہو'' یا پھر دوسرے معنی ہیں مادی خوش حالی۔ آخر میں یہ بات ہے کہ اردو زبان میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہے۔ اس لیے خواہ مخواہ اردو کو بوجھل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے ہاتھ کوئی عربی کتاب لغت لگ گئی ہے جس سے بے موقع و محل بہت سے عربی الفاظ لے لیے گئے ہیں۔ جو اردو نثر و نظم میں مستعمل نہیں اور اکثر عربی تراکیب میں غلطی کی ہے، جیسے:

ص ۶۹۶ پر خالص عربی فعل امر ظنو (ظ فتحہ ن تشدید ضمہ) اور اس میں غلط عربی ترکیب'' ظنوا المومنین خیرا '' دی گئی ہے۔ صحیح جملہ ہے ظنوا بالمؤمنین خیرا یعنی اہل ایمان کے ساتھ خوش گمانی رکھو۔

غلط معانی:

فرہنگ میں ایسے الفاظ کی بھی کمی نہیں جن کا تلفظ اور املاء تو درست ہے لیکن ان کے معانی غلط دیے گئے ہیں۔ یہ زیادہ تر عربی الاصل یا خالص عربی الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ صرف مثال کے طور پر حرف الف کے الفاظ صفحہ ۹۴، ۹۵ پر ملاحظہ کریں۔

انسلاخ:

کے معنی دیے گئے ہیں، کھال اتارنا، علیحدہ یا جدا کرنا۔ یہ بالکل غلط ہے، اس کے معنی کھال اتر جانے اور جدا ہو جانے کے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مصنف نے لفظ سلخ کے بھی یہی معنی دیے ہیں۔ یہ عربی زبان سے ''واجبی'' واقفیت کے سبب ہے کیونکہ عربی میں باب انفعال عام طور پر ''مطاوعہ'' کے لیے استعمال ہوتا ہے، جیسے سلخ و انسلاخ، کسر و انکسار، شق و انشقاق وغیرہ ہیں۔ یعنی جلد اتارنا اور جلد کا اتر جانا، توڑنا اور ٹوٹ جانا، پھاڑنا اور پھٹ جانا۔ بالفاظ دیگر باب انفعال کے الفاظ اکثر و بیشتر لازم ہوتے ہیں، متعدی نہیں ہوتے۔ مصنف نے اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کے سبب اکثر الفاظ کے معانی میں ٹھوکر کھائی ہے۔

انشراح:

انشراح کے معنی دیے گئے، کھولنا، واضح کرنا، فرحت پہنچانا۔ یہ بدیہی طور پر غلط ہے۔ کھولنے اور واضح کرنے کے لیے جو لفظ ہے وہ ہے: شرح جبکہ انشراح کے معنی ہیں، کھل جانا، واضح ہو جانا اور دل کا کسی مسئلہ میں مطمئن ہو جانا۔

انشقاق:

انشقاق کے معنی دیے ہیں، شق کرنا، توڑنا، ٹکڑے ٹکڑے کرنا، م (یعنی مثال کے طور پر) ایٹم کا انشقاق۔ یہ سب کچھ غلط ہے، انشقاق کے معنی شق ہو جانا، پھٹ جانا، دو ٹکڑے ہو جانا ہے۔ پھاڑنے کے لیے لفظ شق ہے، جس انسان کا بھی قرآن سے تھوڑا بہت تعلق ہوگا، وہ اقتربت الساعۃ وانشق القمر، سورہ قمر کی پہلی آیت اور آخری پارے میں سورہ انشقاق کی پہلی آیت: اذا السماء انشقت سے واقف ہوگا، کے معنی علی الترتیب چاند کے دو ٹکڑے ہو جانے (وہ بھی ایک طرح سے چاند کا پھٹ جانا تھا) اور آسمان کے پھٹ جانے کے ہیں۔

انطفا:

انطفا کے معنی دیے ہیں ''بجھانا، فرو کرنا''۔ اول تو یہ کہ اس خالص عربی لفظ کے آخر میں ہمزہ ضروری ہے، دوسرے یہ کہ اس کے معنی بجھانے کے نہیں بلکہ بجھنے کے ہیں، فرو ہو جانے کے ہیں۔ بجھانے کے لیے لفظ اطفاء ہے جو قرآن میں بھی آیا ہے

اور عرب ممالک میں اطفائیہ Fire Brigade کو کہتے ہیں۔

انطلاق:

انطلاق کے معنی دیے ہیں: ''طلوع ہونا، یکبارگی نکل پڑنا، ابھر آنا، پھٹ پڑنا'' عربی پڑھنے، پڑھانے اور لکھنے کا تعلق میرا نصف صدی سے زائد کا ہے، اور آج تک میں نے لفظ انطلاق کے یہ معنی کہیں نہیں دیکھے۔ اس کے سیدھے سادے معنی ہیں تیزی سے چلنا اور جانا یا بغیر رکاوٹ کے چلنا اور قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں سورہ طٰہٰ اور سورہ کہف میں یہ لفظ ان دونوں معانی میں آیا ہے۔ متعدد سورتوں میں اور بھی یہ لفظ آیا ہے لیکن یہی دو معنی ایک دوسرے سے بالکل قریب ہیں۔ ''انطلاق'' کے یہ عجیب معانی دیکھ کر مجھے ۱۹۹۰ء کا ایسا ہی ایک واقعہ یاد آیا جب عراق کے صدر صدام حسین نے کویت پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانے میں ایک دوسکہ بند ''مولانا'' لوگوں کے بیانات جنگ اخبار میں چھپے جن میں انہوں نے لفظ ''صدام'' کے عجیب وغریب دو معانی بتائے جو یہ ہیں ''زوال اور حادثہ کو روکنے والا'' اور ''اچانک نمودار ہونے والا''۔ فرمایا گیا صدام حسین مسلمانوں کے زوال کو روکے گا اور ان کو پیش آنے والے حوادث سے ان کو بچائے گا اور یہ کہ اچانک نمودار ہونے والے ستارے کی طرح صدام حسین مسلمانوں کو شوکت وصولت کے بام عروج پر پہنچائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ''صدام'' عربی کے فعل صدَم (ص پر فتحہ، د پر فتحہ، میم پر فتحہ) سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں ٹکر مارنا، دھکا دینا۔ اسی سے اردو میں رائج لفظ تصادم (باب تفاعل) ہے۔ جس کے معنی ہر شخص جانتا ہے۔ صدام اسی فعل سے صیغہ مبالغہ ہے۔ عراقی، کویتی اور پھر عراقی امریکن جنگ کے حوالے سے تو صدام حسین اسم با مسمّٰی تھا کہ اس نے اپنے اقدام سے خلیج میں ایک زبردست تصادم کیا تھا۔ اسی فعل کا ایک مصدر ''صدمہ'' ہے، جس کے معنی اردو میں رنج و غم کے ہو گئے ہیں لیکن درحقیقت یہ مجازی معنی ہیں، کیونکہ انسان کو چوٹ لگنے سے تکلیف و رنج تو ہوتا ہی ہے، اس لیے حدیث شریف ہے: الصبر عند الصدمۃ الاولیٰ۔ ''پہلی چوٹ پر کوئی شخص صبر کرے تو وہی موجب اجر وثواب ہے''۔

بعد میں تو سب ہی کو صبر آ جاتا ہے۔ حقی صاحب نے بھی لفظ ''انطلاق'' کے ساتھ یہی سلوک کیا جو ان مولانا حضرات نے لفظ صدام کے ساتھ کیا تھا۔ ص ۵۳۷ رفض کے معنی فرار، دغا اور بدعہدی دیے ہیں جو غلط ہیں۔ رفض کے معنی ہیں انکار کرنا۔ اصطلاحاً حضرت زید بن علی زین العابدین کی امامت کا انکار کرنے والے۔

آخر میں شاید راقم السطور سے کہا جائے: عیبہا جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو''۔ سو عرض ہے کہ یہ فرہنگ تلفظ جو تصحیح تلفظ و معانی کے لیے لکھی گئی ہے اس سے تو یہی امید کی جاتی ہے کہ وہ لفظ کے صحیح تلفظ کی نشان دہی کرتے ہوئے اردو لکھنے والوں کی صحیح رہنمائی کرے اور واقعۃً اس میں منتخب (خ پر فتحہ) اور منتج (ت پر فتحہ) اور خاص طور پر قمیص (بغیر نقطہ کے صاد) اور نقض امن (نقطہ والا ض) وغیرہ جیسے الفاظ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مؤخر الذکر دونوں لفظ تو تقریباً ۹۵ فیصد لوگ غلط لکھتے اور بولتے ہیں اور بہت سے مشہور لکھنے والے مصنف یہ غلطی کرتے ہیں۔ مشتاق یوسفی صاحب کی ایک کتاب میں مجھے صحیح لفظ نقض امن (ص نقطہ والا) دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی اور میں نے ان سے اس کا اظہار بھی کیا تھا لیکن یہاں بھی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کتاب کے شروع میں فاضل مصنف نے ''بعض مماثل الفاظ کا جداگانہ'' تلفظ اور معانی'' کے عنوان کے تحت پانچ صفحات میں جو فہرست الفاظ دی ہے ان میں املا (الف پر کسرہ) اور املاک (الف پر فتحہ) کا ذکر نہیں کیا۔ اس میں عام طور پر لوگ غلطی کرتے ہیں، خاص طور پر ٹیلیویژن پر خبریں پڑھنے والے جو اکثر ''املاک'' (بفتحہ الف) کو املاک (بکسرہ الف) بولتے / بولتی ہیں۔ دونوں الفاظ کے معانی میں بڑا فرق ہے۔ الف پر زبر کے ساتھ جو لفظ ''املاک'' ہے اس کے معنی مملوکہ اشیا، اور جائیداد وغیرہ جب کہ الف پر زیر کے ساتھ جو لفظ ''املاک'' ہے اس کے معنی ہیں کسی کو کسی شے کا مالک بنانا، یعنی پہلا لفظ اسم ہے (جمع ملک) اور دوسرا فعل ہے۔ اسی طرح اسرار (بفتحہ الف اول) اور اسرار کے فرق کو بھی نمایاں نہیں کیا ہے؟ جن کے تلفظ میں اکثر لوگ غلطی کرتے ہیں۔ اگرچہ اہل علم اور محققین جانتے ہیں کہ اسرار (الف پر کسرہ) کے معنی چھپانے یا راز رکھنے کے ہیں اور اسرار (بفتحہ الف) سر (راز) کی جمع ہے۔

اسی طرح فاضل مرتب نے کتاب کے شروع میں ''اردو کے بعض تصرفات جو مروج اور مسلم ہیں'' کے عنوان کے تحت چار صفحات میں الفاظ کی فہرست دی ہے۔ یہ ایک مستحسن اقدام ہے لیکن افسوس کہ یہاں بھی دقت نظر کا فقدان نظر آتا ہے بلکہ بعض غلط تصرفات کو، جو محققین کی زبان پر نہیں ہیں، سند جواز عطا کی گئی ہے۔ اس فہرست میں صفحہ ''خ'' پر تلفظ شعور (بفتحہ ش) کو مروج و مسلم تسلیم کیا گیا ہے اور اس کا صحیح تلفظ شعور (بضمہ ش) بھی دیا گیا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر جو لوگ حکومت، اصول (بفتحہ ح والف) بولتے ہیں اس کو بھی سند جواز ملنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی الفاظ کے ساتھ یہ نرم روی یا تساہل درست نہیں۔ ''شعور'' کا صحیح تلفظ ش پر ضمہ (پیش) کے ساتھ ہی درست ہے اور فتحہ کے ساتھ غلط ہے۔ اسی طرح حکومت اور اصول بھی غلط ہیں۔

اسی فہرست میں صفحہ ''د'' پر ایک لفظ صدمہ نظر آیا جو (ص) پر زبر اور (د) پر سکون کے ساتھ عربی کا لفظ ہے اور اردو میں اسی طرح صحیح تلفظ کہا جاتا ہے۔ جناب مرتب نے دوسرے کالم میں صحیح طور پر اس کو عربی کا لفظ قرار دیتے ہوئے اس کا جو عربی تلفظ (فتحہ ص د) صدمہ دیا ہے، وہ ایک فاش غلطی اور آسان تلفظ کو ثقیل تر بنانے کی ناروا کوشش ہے۔ حدیث میں بھی یہ لفظ اسی طرح ہے جیسے اردو میں بولا جاتا ہے۔ فاضل مصنف نے یہی زیادتی لفظ ہریسہ کے ساتھ بھی کی ہے جس کو جیسا کہ پہلے ذکر ہوا حریسہ تحریر فرمایا ہے۔ موصوف کے اس عجیب وغریب تصرف کو دیکھ کر مجھے ابتدائے جوانی (یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے) میں جب میں منشی فاضل کے لیے برصغیر کے مشہور فارسی داں اور محقق مرحوم شاداں بلگرامی سے فارسی پڑھتا تھا، ان کی زبانی سنا ہوا ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ اردو میں خواہ مخواہ عربی کے حروف حلقی گلے کے اندر سے نکالنے اور اس میں مبالغہ سے کام لینے کی بات ہو رہی تھی یا شاید مولویوں کی اردو کی بات تھی، فرمایا کہ ایک مولوی صاحب ایک حلوائی کی دکان پر شیرہ خریدنے گئے اور اس نے کہا کہ ایک پاؤ ''شیرح'' ح کو قاریوں کی طرح حلق سے نکالتے ہوئے) دے دو۔ حلوائی خوش مذاق انسان تھا اس نے جواباً کہا: ''مولوی صاحب میرے پاس اتنا گاڑھا شیرہ نہیں ہے''۔

فرہنگ تلفظ کے فاضل مرتب نے خریسہ، صدمہ (د کے زبر کے ساتھ) جیسے غلط الفاظ لکھ کر اور اس لغت میں عربی کے الفاظ کی بھرمار کر کے بلکہ خود عربی میں بعض الفاظ اختراع کر کے اردو کو ثقیل بنانے کی کوشش کی ہے جو یقیناً نامحمود سمجھی جائے گی۔ غضب ہے کہ ایک لغت میں جو ''مقتدرہ قومی زبان'' کی طرف سے بڑے تحکمی دعوے کے ساتھ شائع کی جائے اس میں الفاظ کا املا تک درست نہ ہو۔ حریسہ قریفہ، حمطا وغیرہ بعض مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ اسی طرح غلط معانی اور غلط تلفظات کی بھی کتاب میں کمی نہیں۔ راقم الحروف نے جو مثالیں گزشتہ صفحات میں دی ہیں وہ ''مشتے نمونہ از خروارے'' ہیں۔ اس سب کے پیش نظر ''مقتدرہ'' سے استدعا ہے کہ اس کتاب کی مکمل تصحیح بطور ضمیمہ شائع کی جائے۔ یہ اردو کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔

کتابیات

(اس مقالے کی تیاری میں جن کتابوں سے رجوع کیا گیا وہ درج ذیل ہیں)

نمبر شمار	کتاب	مصنف
۱۔	لسان العرب	ابن منظور (۱۵ جلدیں) بیروت (دار صادر)
۲۔	القاموس المحیط	الفیروز آبادی (چار اجزاء، دو جلدیں) قاہرہ
۳۔	اساس البلاغۃ	الزمخشری، قاہرہ
۴۔	معجم مقاییس اللغۃ	احمد بن فارس (متوفی ۳۹۵ھ) تحقیق عبدالسلام ہارون، قاہرہ
۵۔	مختار الصحاح	محمد بن ابی بکر بن عبدالقادر رازی متوفی ۶۶۶ھ، قاہرہ
۶۔	التکملۃ والذیل والصلۃ	الصغانی، الامام رضی الدین حسن بن محمد، (۱۶ جزء) قاہرہ
۷۔	المعجم الوسیط	مرتبہ مجمع اللغۃ العربیۃ (دو اجزاء) قاہرہ
۸۔	المنجد	لوئس معلوف (انیسواں ایڈیشن) بیروت ۱۹۶۶ء
۹۔	مصباح اللغات	مولانا عبدالحفیظ بلیاوی (عربی اردو لغت) مجلس نشریات اسلام کراچی ۱۹۹۲ء
۱۰۔	فرہنگ آصفیہ	سید احمد دہلوی (۳ جلدیں) ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء
۱۱۔	علمی اردو لغت	وارث سرہندی، ۱۹۹۳ء، ایڈیشن، لاہور
۱۲۔	النہایۃ	ابن الاثیر (متوفی ۶۰۶ھ) الفاظ حدیث کی لغت، ۵ جلدیں، بیروت ۱۹۹۷ء
۱۳۔	المعجم المفہرس الالفاظ الحدیث النبوی	ونسنک وغیرہ المستشرقون، ۷ جلدیں برل لائیڈن، ہالینڈ ۱۹۳۶ء۔ ۱۹۶۹ء

Concordance et Indices Tradition Musulman By A.J. Wensinck, E.J. Brill, Leiden, 1969

۱۴۔	السیرۃ النبویۃ (عربی)	ابن ہشام (دو جلدیں، چار اجزاء) قاہرہ
۱۵۔	الطبقات الکبریٰ	ابن سعد جلد اول السیرۃ النبویہ (باب ذکر اسماء الرسول) بیروت
۱۶۔	جامع الدروس العربیۃ	الشیخ مصطفیٰ الغلاینی، المکتبۃ العصریۃ، بیروت ۱۹۸۷ء

چونکہ یہ فہرست مختصر ہے اس لیے اس میں ترتیب ہجائی کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ بلکہ اہمیت اور شہرت کے لحاظ سے کتب لغت وسیرت وغیرہ کا ذکر ہے۔

(بشکریہ اخبار اردو)

فرہنگ تلفظ

(مرتب کا مؤقف)

شان الحق حقی

مکرمی تسلیم!

یہ کوئی نیا مضمون نہیں ہے۔ اب سے کوئی ڈیڑھ برس پہلے جناب مصنف نے اسے ایک کتابچے کی صورت میں چھاپ کر تقسیم کر دیا تھا۔ اتفاق سے میرے علم میں آیا تو میں نے ان کو ایک خط لکھا تھا جس کی نقل ملفوف کرتا ہوں۔ اس میں بعض نکات کا جواب آ گیا ہے۔ دوسری ضروری درستیاں نئے ایڈیشن میں کر دی گئی ہیں جو چھپنے کے لیے تیار ہے۔

لغت نگاری ٹیڑھا کام ہے۔ اردو یا فارسی کی کوئی لغت نہیں جو شدت سے ہدف تنقید نہ بنی ہو۔ بعض معروف لغات پر مقتدرہ نے خود تنقیدی جائزے شائع کیے ہیں۔ ان میں سے ایک پر میرا مقدمہ بھی تھا۔ برہان قاطع والے طویل تنازع میں خود غالب نے بہت گالیاں کھائیں۔

دراصل لغت نگاری پورے اداروں کے کرنے کا کام ہے۔ کوئی شخص تنہا اپنی ساری زبان پر حاوی نہیں ہوتا، چہ جائیکہ دوسری زبانوں پر بھی جن سے اکتساب کیا گیا ہو۔ دنیا کے بڑے بڑے مصنف بھی چند ہزار سے زیادہ الفاظ پر تصرف نہیں رکھتے۔ (میری اپنی گنتی کے مطابق مرزا غالب نے اردو کلام میں چھ ہزار سے کچھ زیادہ الفاظ برتے ہیں) آکسفورڈ ڈکشنری کی تیاری میں پوری برطانوی قوم شریک تھی۔ بعض قیدیوں نے بھی حصہ لیا جو قرض داری وغیرہ کے سلسلے میں ماخوذ، قید محض بھگت رہے تھے۔ اردو لغت بورڈ کی ابتدائی جلدوں کی ترتیب وتصحیح میں کوئی ایک درجن حضرات کی نظر شامل تھی۔ ان جلدوں میں اب بھی بہتیری اغلاط موجود ہیں۔

میں نے مقتدرہ کی فرمایش پر اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اور اسے حسب مقدور انجام دینے کی کوشش کی۔ اب اگر مناسب سمجھیں تو ڈاکٹر رضوان علی صاحب سے اس پر ایک بار نظر ثانی کرالیں۔ ان کے تمام اعتراضات عربی الفاظ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بہت سے عربی الفاظ جو متداول سائنسی لٹریچر میں استعمال ہو رہے ہیں، ان کے احاطہ علم میں نہیں آنے پائے۔

مجھے انہی دنوں مشفق خواجہ صاحب سے معلوم ہوا تھا کہ یہ مضمون پہلے ''قومی زبان'' میں اشاعت کے لیے آیا تھا۔ انجمن والوں کو اس کے لہجے پر اعتراض تھا اور چاہتے تھے کہ چند جملے حذف کر دیے جائیں تو چھاپ دیں گے۔ ناقد موصوف ایک حرف بھی کم کرنے پر راضی نہ ہوئے اور اسے خود ہی کتابچے کی صورت میں چھاپ کر تقسیم کر دیا۔ مقتدرہ کو بھی بھیجا ہو گا لیکن شاید زیر غور نہ آیا۔ والسلام

نیازمند
شان الحق حقی

۷ مئی ۲۰۰۲

مخدوم و مکرم ڈاکٹر رضوان علی صاحب، تسلیم و نیاز

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آپ جیسے صاحبان علم کا دم غنیمت ہے۔ خدا آپ کے فیوض کو جاری رکھے۔

آپ نے جو تبصرہ میری مرتب کردہ فرہنگ تلفظ پر فرمایا، مجھ تک بھی پہنچا اور میں نے اس سے پورا استفادہ کیا۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ فرہنگ کے اوراق آپ کی نظر سے گزرے اور اس کے نتیجے میں اصلاح کا موقع ملا۔ البتہ اس سلسلے میں چند امور کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

عربی مادوں سے بنائے ہوئے کچھ وضعی الفاظ جن پر آپ نے توجہ دلائی، وہ میں نے نہیں گھڑے بلکہ متداول فرہنگوں اور جدید علوم پر بعض کتابوں میں موجود ہیں جو مختلف اداروں سے شائع ہوئیں جیسے جامعہ عثمانیہ، انجمن ترقی اردو، اردو سائنس بورڈ، مقتدرہ قومی زبان۔ ہو سکتا ہے کہ ان کتابوں کے مرتبین نے بھی بعض جدید عربی کتابوں سے اخذ کیے ہوں: مثلاً انغماد، انفاخ، تبطق، تجیم، انقائیت، خزعبل، استشہا، انفراغ۔ یہ لفظ تو اتفاق سے میر انیس کے ہاں بھی موجود ہے اور شاہ عالم ثانی کی عجائب القصص میں بھی:

پرسے سے بیبیوں کو ہوا تھا نہ انفراغ ...... جو رن میں غل ہوا کہ لٹا فاطمہ کا باغ

(مراثی انیس جلد ۳ ص ۳۰۹)

''نماز اور وظائف سے انفراغ حاصل فرما کر ...... جلوہ افروز ہوتے تھے''۔ (عجائب القصص ص ۲۲)

انفراق کی مثال: ''کھوپڑی کا بھی یہی حال ہے کہ زوال انجماد بالیدگی انفراق و اتصال سے بنتی جاتی ہے''۔ فزیالوجی (ترجمہ حفیظ الرحمان چشتی) ص ۳۵

انغماد کی مثال: ''اس نہوضے سے ایک شکمیہ بنتا ہے لیکن انغماد کے ذریعے نہیں''۔ ابتدائی حیوانیات، ص ۲۰۷

انقائیت کی مثال: ''مگا جن کی انقائیت اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے''۔ مقدمہ تاریخ سائنس جلد اول (نذیر نیازی) ص ۶۵۶ وعلیٰ ہذا القیاس۔

یہ سب الفاظ اردو سائنس بورڈ کی شائع کردہ فرہنگ اصطلاحات میں بھی موجود ہیں۔ جتنے الفاظ آپ کی نظر میں کھٹکے سب مختلف علوم کی کتابوں میں برتے گئے ہیں۔

دوسری بات لائق ذکر یہ ہے کہ ہر زبان دوسری زبانوں سے الفاظ اخذ کرتی ہے۔ بولنے والوں کے لیے محال ہے کہ اتنی زبانوں پر حاوی اور ان کے الفاظ کو اصل کے مطابق ادا کرنے پر قادر ہوں۔ چنانچہ ہر زبان کے بولنے والے دخیل الفاظ کو عام طور پر بالتصرف اپنے لب و لہجے اور سمجھ بوجھ کے مطابق بولتے ہیں۔ عرب تو بالخصوص ہمیشہ تعریب سے کام لیتے ہیں۔ ان کی اصوات ویسے بھی بہت محدود ہیں۔ اردو جیسی جامع الاصوات زبان تو کوئی ہے ہی نہیں۔ اب انگریزوں سے بعید ہے کہ وہ لفظ COT کی جگہ ''کھاٹ'' بولنے کی سوچیں کہ اس کی اصل یہی ہے یا COWRIE کو کوڑی بنائیں۔ اردو پہلے فارسی سے دبی ہوئی تھی پھر انگریزی کے غلبے میں رہی اور اتنی باصلاحیت اور باثروت ہونے کے باوجود گھٹیا شمار کی جاتی ہے۔ غدر سے پہلے تک ہمارے لوگوں نے پھر بھی خود اعتمادی کے ساتھ تارید سے کام لیا تھا۔ لانٹین کو لینٹرن، پلٹن کو پلیٹون بولنے کی کوشش نہیں کی۔ Velvetine کو مخمل ٹین بنایا اور دھڑلے سے دخیل الفاظ پر اپنا ٹھپا لگایا۔ پرتگالی کے درجنوں الفاظ جو لا بدل کر اردو میں داخل ہوئے۔ بالٹی، چابی، گرجا، پادری، تولیا، گوبھی، گودام، بوتام، باسن، مُنکی، فالتو، مستری (پرتگالی Mestre) اس کی چند مثالیں ہیں۔ عربی سے ہم کو مذہبی لگاؤ ہے اس لیے عربی الفاظ کی صحت کو قائم رکھنے کا جذبہ قائم رہا اور اب بھی ہے۔ پھر بھی مسلمان قدرتاً نقل کو نقل ہی سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ اس کی اصلاح مشکل ہے۔ کتنے ہی عربی الفاظ کا تلفظ بدل گیا ہے بلکہ معنی میں بھی بہتیرا تصرف ہوا ہے۔ فارسی والوں نے بھی کیا اور اردو والوں نے بھی۔ فارسی سے بھی ہمارا تہذیبی رشتہ ہے۔ اچھا ہے کہ ہمارے اسلامی ممالک کے درمیان جو اشتراک لغات ہے مناسب صحت کے ساتھ برقرار رہے اور الفاظ کی صورت ناحق نہ بدلنے پائے۔

لغت نگاری مشکل کام ہے جس کے لیے کئی زبانوں پر عبور ہونا شرط ہے۔ اس کا حق فرد نہیں ادارے ہی ادا کر سکتے ہیں۔ اصولاً لغت نویس کو بولنے والوں کی روش کا پابند ہونا چاہیے۔ وہ حقیقت حال کو واضح کر سکتا ہے اور بس۔ اسے اپنی طرف سے حکم لگانے کا حق نہیں۔ میرے سپرد کسی خوش گمانی کی بنا پر (نہ کہ میری درخواست پر) از راہ عنایت ایک کام کیا گیا تھا جسے میں نے حسب توفیق انجام دینے کی کوشش کی۔ اگر کچھ سہو واقع ہوئے انہیں سر جھکا کر قبول کرتا ہوں۔ کوئی اور بات آپ کی نظر میں آئے تو از راہ کرم مجھے بھی مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اصلاح کی جا سکے۔ جزاکم اللہ خیرا۔

اقتباس

موسکو میں میرے لیے سب سے زیادہ کشش کا باعث ''بیلے'' (Ballet) تھا۔ روسی بیلے کا دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ اس رقص نے جنم اٹلی میں لیا اور پروان فرانس اور انگلستان میں چڑھا۔ روس میں یہ بہت بعد میں پہنچا۔ اس کے باوجود، اس فن میں آج روس ساری دنیا کو مات دے چکا ہے اور دنیا بھر میں چوٹی کی رقاصائیں روسی ہی ہیں۔ کلاسیکل آرکسٹرا کی معیت میں پنجوں کے بل ناچا جانے والا یہ رقص، ابتدا میں محض حکمرانوں اور امرا کے لیے ایک لطیف سی تفریح تھا۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اسے روسی عوام نے اپنے فطری مذاق سلیم اور زکی ستائش سے سینچا۔ شعرا نے رومان لکھے، موسیقاروں نے اس پر دھنیں بٹھائیں، فن کار نے اس کے مناظر میں رنگ بھرے۔ اب یہ رقص پیچیدگی اختیار کرتے کرتے ایک انتہائی مشکل آرٹ بن چکا ہے۔ جس میں سالہا سال کی شبانہ روز مسلسل محنت کے بعد جا کر کہیں انسان کسی درجے تک پہنچتا ہے۔ یہ ایک جان لیوا اور ظالم فن ہے، لیکن جو لوگ ایک دفعہ اس میں کمال حاصل کر لیتے ہیں وہ سٹیج پر اس طرح تیرتے ہوئے جاتے ہیں، جیسے مچھلیاں اپنے مانوس پانیوں میں۔

(**سات سمندر پار** از اختر ریاض الدین احمد)

یادگارِ انیسؔ

مبصر: ڈاکٹر سلیم اختر

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں۔ بحر مواج فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں، ذرے کو انجم کر دوں گنگ کو ماہرِ اندازِ تکلم کر دوں

درد سر ہوتا ہے، بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

جس طرح ہم زندگی کلیشوں کے سہارے بسر کر دیتے ہیں اس امر کا ادراک کیے بغیر کہ کلیشے بے رنگ و بو پھولوں جیسے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ادب و نقد میں بھی متعدد کلیشوں کا سکہ چلتا ہے اس امر کا تعین کیے بغیر کہ یہ کھوٹے سکے کس ٹکسال سے برآمد ہوئے۔ ادھر ادھر کی مثالیں پیش کرنے سے احتراز کرتے ہوئے اور اپنے موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے صرف ایک کلیشے کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو بن جاتا ہے، جس کی تردید میں حالی کے الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے:

یہ کہہ دو دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا

مرثیہ اردو شاعری کی ایسی ہمہ جہت صنف ہے جس میں واقعات کا بیان Epic کا رنگ بھر دیتا ہے۔ افراد کی کشمکش، جو حق و باطل کی کشمکش ہے، اسے ڈرامے کی سطح تک لے آتی ہے۔ کردار نگاری افسانہ کی تخلیقی فضا کے مماثل ہے۔ فطرت کی تصویر کشی محاکات کی اعلیٰ مثال پیش کرتی ہے، اسلوب مثنوی کی یاد دلاتا ہے، سوز و گداز اسے غزل نما بنا دیتا ہے تو المیہ کیتھارسس کا موجب بنتا ہے۔ اسی لیے مرثیہ سامعین سے آنسوؤں کا نذرانہ وصول کرتا ہے اور بجا کرتا ہے۔ بلاشبہ مرثیہ واحد ایسی صنف ہے جس میں بیشتر اصناف کا ذائقہ، رنگ اور خوشبو شامل ہے۔ ایسی ہمہ جہت صنف کے فنی تقاضوں سے عہدہ برا ہی کے لیے میر انیسؔ جیسے شاعر ہی کی ضرورت تھی جنہوں نے صرف ایک مصرع میں اپنی شاعری کی اساس بننے والے عناصر کی نشان دہی کر دی۔ یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال!

اگرچہ انیس یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں:

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ میں باندھوں

لیکن اس کے ساتھ عجز ہنر کا احساس تعلّی سے باز بھی رکھتا ہے:

خاموش زباں، دعویٰ بے جا نہیں اچھا ہو جس میں تکبر سخن ایسا نہیں اچھا
بس بس یہ غرور اور یہ دعویٰ نہیں اچھا آپ اپنی ثناء واہ یہ شیوہ نہیں اچھا
کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہے اکثر
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے اکثر

میر انیس نے درست کہا تھا۔ انہیں تعلّی کی ضرورت نہ تھی، وہ خالی برتن نہ تھے اس لیے عظمت فن کی گواہی زمانے نے دی۔ تنقید کی میزان میں تول کر، تحقیق کے تفت خواں طے کر کے اور پھر بھی یہ احساس باقی ..... حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا! مولانا شبلی نعمانی کی ''موازنہ انیس و دبیر'' سے چلیں تو ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ''تجزیہ: یادگار انیس'' تک، اردو تحقیق و تنقید کی اہم ترین شخصیات نے انیس کے شاعرانہ محاسن اجاگر کرنے میں اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اس لیے اقبالیات اور غالبیات کی مانند اب ''انیسیات'' کی اصطلاح استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے۔

محققین کے بموجب اگرچہ میر انیس کی تاریخ پیدائش متنازعہ ہے لیکن اکثریت اسے تسلیم کرتی ہے کہ ۱۸۰۳ء میں فیض آباد کے محلّہ گلاب باڑی میں پیدا ہوئے، گویا انیس کی پیدائش کو دو صدیاں بیت چکی ہیں اور اس مناسبت سے ۲۰۰۳ء میر انیس کا سال قرار دیا جا سکتا ہے۔ سرکاری طور پر نہ سہی ادبی لحاظ سے ہی، اہل علم، دانش وروں اور انیس شناسوں کا یہ اجتماع گویا سال انیس کی افتتاحی تقریب کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ اس موقع پر اگر یہ تجویز پیش کر دی جائے کہ اکادمی ادبیات پاکستان انیس کے نام کے ایک ایوارڈ کا اجراء کر دے تو اسے بے محل نہ سمجھا جائے۔

یہ امر بھی خوش آئند ہے کہ سال انیس کا افتتاح کینیڈا میں مقیم ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ''تجزیہ: یادگار انیس'' سے ہو رہا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر تقی میڈیکل ڈاکٹر ہیں لیکن یہ کتاب انہیں محنت طلب، مشکل پسند بلکہ مشقت پسند محقق کے طور پر سامنے لاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انیس پر ناقدین کے مقالات جمع کر کے مرتب بن کر مصنف کی عزت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کتاب انیس کے اس معروف مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' کا ژرف نگاہی پر مبنی تحقیقی مطالعہ، تنقیدی محاکمہ اور شماریات پر مبنی تجزیاتی جائزہ ہے۔

مراثی انیس میں اس مرثیہ کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ ناقدین کی اکثریت نے کسی نہ کسی لحاظ سے اس مرثیہ کے شاعرانہ محاسن اجاگر کیے ہیں۔ نامور محقق مسعود حسن رضوی ادیب نے ''شاہ کار انیس'' کے نام سے ۱۹۴۳ء میں اس مرثیہ کا دیدہ زیب مصور ایڈیشن لکھنؤ سے شائع کیا تھا، لندن سے مبسوط مقدمہ کے ساتھ ڈیوڈ میتھیوز نے اس کا انگریزی ترجمہ "The Battle of Karbala" کے نام سے شائع کیا جبکہ حسن علی خاں ٹالپر نے منظوم سندھی کے قالب میں اسے ڈھالا۔

سائن جیسے آرٹ پیپر پر دیدہ زیب انداز میں مطبوعہ پونے ۸ سو صفحات کی یہ کتاب میر انیسؔ کے احوال و آثار کے بارے میں محققین کے مستند حوالوں کی حامل ہے چنانچہ انیس اور خاندان انیس کے بارے میں ضروری معلومات اور کوائف حاصل ہو جاتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا اصل کام ..... ایسا کام جس پر ڈاکٹر صاحب نے یقیناً نصف شب کے چراغ جلائے ہوں گے ..... اس مرثیہ کے ایک ایک بند کا تجزیاتی مطالعہ ہے ایسا مطالعہ جو فرہنگ و شرح سے لے کر صنائع معنوی اور فصاحت و بلاغت سے وابستہ جملہ امور سخن کا حامل ہے۔ اور جس کے مطالعہ سے میر انیس کے اسلوب کی جمالیات کی متنوع جہات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی نے سب سے پہلے اس طرف توجہ دلائی تھی کہ میر انیس نے اردو شعرا میں سب سے زیادہ تعداد میں الفاظ استعمال کیے۔ اور اسے تسلیم بھی کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن ڈاکٹر تقی نے جس محنت سے الفاظ شماری کی وہ حیرت زدہ کرنے کے ساتھ حالی کے دعویٰ کی شماریاتی تصدیق بھی کرا لیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بموجب ''میر انیس نے دو سو کے قریب مرثیے، سو سے زیادہ سلام، چھ سو کے قریب رباعیات'' کہیں۔ مراثی کے سیکڑوں بند اور ہزاروں الفاظ، میر انیس کی پرگوئی کی واضح دلیل ہیں۔

منفرد صوتی آہنگ اور نفسی تلازمات رکھتا ہے۔ چنانچہ اسلوب کی جمالیات کا انحصار مناسب اور موزوں ترین الفاظ کے انتخاب پر ہوتا ہے یا ہونا چاہیے، اس لیے شعروں کے انتخاب کی مانند الفاظ بھی رسوائی کا سبب بن سکتے ہیں یہ تو ہوئی عام شاعری کی بات لیکن مرثیہ میں الفاظ اور ان کا انتخاب اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ یہ امام عالی مرتبت کی شہادت کے بیان کے لیے وقف ہے۔ اس لیے جوش وغلو کے باوصف عقیدت واحترام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنا چاہیے۔ اور یہی کام بطریق احسن میر انیس نے کیا۔

ڈاکٹر تقی ہمیں بتاتے ہیں کہ ''۱۹۶ بند کے مرثیے میں کل الفاظ، جن میں تکرار شامل ہے، ان کی تعداد ۹۴۹۳ ہے۔ عربی الفاظ کی تعداد ۱۷۶۹، فارسی الفاظ کی تعداد ۱۹۴۸ اور اردو الفاظ کی تعداد ۵۷۷۶ ہے..... اس مرثیہ میں ۶۱ فیصد الفاظ اردو، بیس فی صد الفاظ فارسی اور انیس فی صد الفاظ عربی زبان کے ہیں''۔ (ص: ۹۸)

اس لسانی تجزیہ کے بعد اسماء کا شماریاتی مطالعہ بھی کیا گیا ہے جس کے بموجب ''اس ۱۹۶ بند کے مرثیہ میں امام حسین کا نام، القاب اور کنیت وغیرہ ۱۴۳ سے زیادہ بار استعمال ہوئے ہیں، حسین ۳۱ بار اور شبیر صرف چار بار نظر آتا ہے اس کے علاوہ چونسٹھ سے زیادہ القاب اور کنیات سے امام حسین کو خطاب کیا گیا ہے۔ حضرت محمدؐ کا نام لقب یا کنیت ۴۹ بار نظر آتا ہے۔ حضرت زینب کا نام ۲۱ بار، حضرت فاطمہ ۱۷ بار، حضرت علی اکبر ۱۳ بار، حضرت عباس ۱۲ بار، حضرت سکینہ حضرت بانو پانچ پانچ بار، حضرت جعفر طیار چار بار، حضرت علی اصغر تین بار، روح الامین تین بار، امام حسن، امام باقر، حضرت قاسم، حضرت یوسف دو دو بار، حضرت خلیل، حضرت سلیمان، حضرت یعقوب، حضرت داؤد کے علاوہ حضرت عقیل، حضرت مسلم، مالک اشتر، شہزادی کلثوم، ام البنین اور فضہ کے نام ایک ایک بار اس مرثیہ میں لیے گئے ہیں''۔ (ص، ۱۱۰)

''صرف اس ایک مرثیہ میں کل اضافات ۵۸۷ سے بھی زیادہ ہیں'' (ص، ۱۸۲)

یہ مرعوب کن شماریاتی مطالعہ کمپیوٹر کی مدد سے مدون ہوا یا دیدہ ریزی سے ہم اس بحث میں نہیں پڑتے۔ تاہم ڈاکٹر تقی کی لگن اور محنت سے یہ توقع بندھتی ہے کہ اس انداز پر وہ میر انیس کے دیگر مراثی کا بھی تجزیاتی رشماریاتی مطالعہ کر ڈالیں گے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بھی ''اسلوبیات انیس'' میں میر انیس کے بعض مرثیوں کا اسلوبیاتی مطالعہ کر کے ان کے ذخیرہ الفاظ کے بارے میں دلچسپ نتائج پیش کیے ہیں۔

اس سے اساسی اہمیت کا یہ سوال جنم لیتا ہے کہ کیا شعر صرف لفظوں کا کھیل ہے؟ یہ درست کہ شعری تخلیقات کی اساس لفظ ہی پر استوار ہوتی ہے، یہ نطق وتکلم اور تخلیق وسخن بازیچۂ الفاظ ہی تو ہیں لیکن محض لفظ کے استعمال اور لفظ کے تخلیقی استعمال میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لفظ کے تخلیقی استعمال کا انحصار لفظ کی مزاج شناسی پر ہے۔ لفظ کی مزاج شناسی ہی اسلوب کے جلال وجمال کے انداز متعین کرتی ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں ہر بڑے شاعر کا نام بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے لیکن میر انیس کی گواہی بھی خاصی معتبر ہے۔ ایسی گواہی جسے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا شماریاتی مطالعہ مزید معتبر بنا دیتا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ نے کلاسیک پر بحث کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ کسی بھی زبان رادب رصنف میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر لینے والا شاعر اس زبان رادب رصنف کے تمام تخلیقی امکانات کو یوں بروئے کار لاتا ہے کہ آنے والے شعراء کے لیے اس کے انداز واسلوب میں اس سے بہتر بات کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اگر اس معیار پر میر انیس کو پرکھیں تو وہ ''کم عیار'' نہیں ثابت ہوتا۔ کم عیار کیا وہ تو ایلیٹ کے ساختہ کلاسیک کے معیار پر ہر لحاظ سے پورا اترتا ہے اور مرثیہ میں کلاسیک کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ انیس نے مرثیہ میں اسلوب سازی سے جو تخلیقی جدتیں کیں، ان کی بنا پر معاصرین میں ممتاز ہونے کے ساتھ ساتھ انیس آج بھی اپنی مثال آپ ہے اور ڈاکٹر سید تقی عابدی کی ''تجزیہ بادگار انیس'' دعویٰ میں دلیل کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔

مثنوی گلشن عشق

(تنقیدی جائزہ)

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی

یہ مختصر سی مگر بہت دلچسپ مثنوی عنایت اللہ روشن بدایونی نے ۱۳۰۲ھ/۴-۱۸۸۳ء میں لکھی تھی۔ روشن کا تعلق بدایوں کے ایک مردم خیز علاقے محلہ قاضی ٹولہ سے بتایا جاتا ہے۔ وہ اپنے دور کا ایک خوشگو شاعر اور مشہور نعت گو صوفی شاعر دلدار علی مذاق کا ہم عصر تھا۔ روشن کا خیال تھا کہ ایک طویل مثنوی لکھی جائے، لیکن وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اس کا سبب اس کے بقول یہ تھا:

لیکن فرصت نہ پائی اتنی — اتنا ہی سخن، زبان جتنی
اتنا بھی ہے یادگار کافی — صحبت باقی و یار باقی
چھوٹی سی ہے مثنوی یہ ہر طور — لکھوں گا بشرط زندگی اور
دنیا ہے غرض سرائے فانی — کچھ نام کو چاہیے نشانی

روشن نے اگرچہ اپنی مثنوی میں اس بات کا اقرار نہیں کیا کہ اس نے ''گلشن عشق'' لکھتے وقت دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزار نسیم'' کو پیش نظر رکھا ہے، تاہم قرائن سے صاف پتا چلتا ہے کہ مذکورہ مثنوی اس کے سامنے رہی ہے۔ نسیم ۱۸۴۳ء میں فوت ہوا اور گلشن عشق ۸۴-۱۸۸۳ء کے لگ بھگ لکھی گئی۔ ظاہر ہے اس عرصہ تک گلزار نسیم کی خاصی شہرت پھیل چکی تھی، جس سے ہمارے شاعر کو بھی اس قسم کی مثنوی لکھنے کا خیال پیدا ہوا ہوگا۔ اس ضمن میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

سب سے پہلے دونوں مثنویوں کے ناموں میں ''گلزار'' اور ''گلشن'' کی رعایت ہے۔ اس مثنوی کی بحر بھی گلزار نسیم کی بحر ہے۔ گلزار نسیم کی ہیروئن، ہیرو کے فراق میں، جس زمین میں غزل پڑھتی ہے، گلشن عشق کا ہیرو بھی اسی زمین میں غزل پڑھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

گلزار نسیم: عالم کا ترے جہاں بیاں ہے — بیتابی دل جہاں جہاں ہے
گلشن عشق: واں غیر کا ذکر درمیاں ہے — یاں رنج والم جہاں جہاں ہے

اب چند ایک ہی موقع کے اور تقریباً ہم الفاظ مصرعے دیکھیے:

گلزار: تو برق وہاں میں خرمن خار
گلشن: وے برق برائے خرمن جاں
گلزار: اے دلبر دلبراں وغاباز
گلشن: وے دلبر دلبران عالم

گلشن عشق میں جو داستان بیان ہوئی ہے، اس میں بھی مافوق الفطرت عناصر کارفرما ہیں۔ کہانی مختصراً یوں ہے:

ہند کے ایک بے اولاد راجا بلوان مل کے ہاں بڑی ہی عاجزانہ دعاؤں کے بعد ایک خوبرو بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ اس کی بڑی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ جب وہ لڑکا (چترسین) جوان ہوتا ہے تو ایک دن سیر گلشن کے لیے باہر نکل جاتا ہے۔ وہاں اچانک سنگلدیپ کی ایک پری سے اس کا سامنا ہو جاتا ہے اور حضرت عشق اپنا کام کر جاتے ہیں۔ وہ پری بھی اسے دیکھتے ہی اس پر والہ و شیدا ہو جاتی ہے اور یوں فوراً ہی وصل کے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ دونوں کچھ عرصہ حظ وصل اٹھاتے ہیں۔ جب پری واپس اپنے وطن پہنچتی ہے تو اس کے والدین اسے مقید کر دیتے ہیں۔ ادھر کچھ دنوں بعد چترسین صدمہ ہجر سے بیکل ہو کر اسے خط لکھتا ہے۔ جس کے جواب میں وہ اسے اپنے پاس بلا لیتی ہے، اور اپنی ایک ہمدرد دایہ کی وساطت سے اپنے والدین کو شادی کے لیے کہلواتی ہے۔ وہ مجبور ہو کر دونوں کی شادی کر دیتے ہیں اور بدھو میاں دلہن کو لے کر گھر پہنچ جاتے ہیں۔ گویا ہیرو کو سوائے ہجر کے اور کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

جہاں تک پلاٹ وغیرہ کا تعلق ہے، اس میں کئی ایک خامیاں ہیں، تاہم روشن نے سادہ سے الفاظ اور عام فہم تشبیہات استعمال کر کے مثنوی میں ایک عجیب حسن و لطف پیدا کر دیا ہے۔ چند مثالیں:

خامہ سے ہو کیا ثنائے باری — زخم اس کی زبان پر ہے کاری
مضمون وہ بولتے نکالوں — تصویر کو باتوں میں لگا لوں

چترسین کی ولادت:

بنجر میں اگا نہال بے خار — آتش میں ہوا شگفتہ گلزار
مستانہ نسیم جھومتی تھی — غنچے کے دہن کو چومتی تھی

پری کا مقید ہونا:

پا بوسی مہر کی تھی امید — چومے بیڑی نے پائے خورشید
صدمے، سختی، ستم سہا کی — تصویر سی دم بخود رہا کی

نسیم کی طرح روشن نے بھی بیشتر اشعار میں الفاظ کی تکرار اور الف پھیر سے کام لیا ہے، جس سے ان اشعار میں ایک خاص موسیقی، رنگینی اور جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔

نعتیہ اشعار:

محبوب خدا، حبیب معبود — مقصود جہاں، جہان مقصود
روشن دل و جسم نور و جاں نور — عالم عالم جہاں جہاں نور

راجا کے ذکر میں:

رکھتا تھا وہ راجا بیکراں فوج — لشکر لشکر، جہاں جہاں فوج

پری:

معشوق صنم، حبیب محبوب — آشوب جہاں، جہان آشوب
لب غنچہ، برنگ گل بدن ہے — آپ آئیں تو گھر چمن چمن ہے
وہ عیش کہاں؟ کہاں یہ افتاد — فریاد و فغاں، فغاں و فریاد

رنگت گل تر کی تھی بدن میں — تھا سرو رواں، رواں چمن میں

ع — اک باغ سخن چمن چمن گل

نشہ لطف کو تیز کرنے کے لیے شاعر نے کہیں کہیں بادہ شیراز سے بھی کام لیا ہے۔ مثلاً راجا کے بے اولاد ہونے کے ذکر میں ایک جگہ کہتا ہے:

ہر خانہ کہ بے چراغ باشد — زنداں بودار چہ باغ باشد
(جو گھر بھی بے چراغ ہے وہ اگر چہ باغ ہی کیوں نہ ہو، محض قید خانہ ہے)

برگل زمژہ گلاب می ریخت — مہتاب بر آفتاب می ریخت
(وہ گل پر اپنی پلکوں سے عطر گل ٹپکاتی تھی، یعنی آنسو بہاتی تھی اور آفتاب پر مہتاب گراتی تھی)

چترسین کی بیقراری:

اے وائے بایں جنوں چہ سازم — با طالع واژگوں چہ سازم
(ہائے وائے یا افسوس کہ میں اپنی اس دیوانگی سے کیونکر نباہ کروں اور اپنے الٹے نصیبے یعنی بدنصیبی سے کیونکر موافقت کروں)

اگرچہ بحیثیت مجموعی مثنوی گلزار نسیم سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، پھر بھی روشن نے جہاں جہاں محاکات و مناظر کی تصویر کشی کی ہے، وہاں نسیم کی طرح، قاری کے لیے پورے پورے لطف کا سامان کیا ہے۔ اس دعوے کی دلیل میں چند امثال حسب ذیل ہیں:

گلشن کی تصویر:

کچھ اور ہی اس کی گل زمیں تھی — سبزہ سے زمیں زمردیں تھی
ہر رنگ کے گل مہک رہے تھے — مرغان چمن چہک رہے تھے
مستانہ نسیم جھومتی تھی — غنچے کے دہن کو چومتی تھی
بل کھاتی تھی کیا برنگ کاکل — لہرا لہرا کے زلف سنبل
سبزہ وہ ہرا ہرا لب جُو — چرتے تھے لپک لپک کے آہو
پرتو جو شفق کا تھا رخ گل — تھی سایہ لیل زلف سنبل

چترسین کی گلگشت کا منظر:

وہ غنچہ دہن غرض ہر اک سو — پھرتا تھا گلوں میں صورت بو
چہرہ سے عیاں بہار گلشن — رخ صورت ماہ جلوہ افگن
رنگت گل تر کی تھی بدن میں — تھا سرو رواں، رواں چمن میں
گل گشت میں صورت صبا وہ — ہر پھول کو سونگھتا پھرا وہ

پری کا حلیہ اور اس کی سیر گلشن:

تھی گلشن حسن کی گل تر — لالہ رخ و غنچہ لب، سمن بر

سرمایہ ناز، سروقامت — پامال خرام تھی قیامت
غارت گر مرداں، نظر تھی — نازک رگ گل سے وہ کمر تھی

(الف ونشر مرتب):

انداز و ادا، کرشمہ و ناز — آشوب و بلا و سحر و اعجاز
دزدیدہ نگاہ اس کی رہزن — دنیا کی عدو تو دیں کی دشمن
پھرنے لگی وہ گل وسمن میں — چکر میں تھا اک چمن، چمن میں
وہ ناز قدم قدم پہ، وہ چال — دل خلق کا ٹھوکروں سے پامال
ہر سمت ادھر، ادھر گئی وہ — خوشبو تھی وہیں، جدھر گئی وہ

چترسین سے نظریں چار ہونے کے بعد:

شرمائی وہ گل، بدن چرا کے — الٹے پاؤں پھری لجا کے

روشن کے جذبات نگاری میں بھی وہی تسلیم کی جذبات نگاری کی گونج سنائی دیتی ہے۔ مثلاً گلزار نسیم کی ہیروئن جب خود ہیرو پر فریفتہ ہو جاتی ہے تو بظاہر اپنی اس کیفیت کو چھپانے کے لیے وہ اس پر عتاب کرتی ہے، لیکن اس عتاب میں بھی ایک خاص لگاوٹ ہوتی ہے، جس سے اس کے جذبات کے مدوجذر کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر گلزار نسیم کے یہ تین اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بولی وہ پری بصد تامل — کیوں جی! تمہی لے گئے تھے وہ گل
کیا کہتی ہوں میں ادھر تو دیکھو — میری طرف اک نظر تو دیکھو
ہے یا نہیں یہ خطا تمہاری — فرمایئے کیا سزا تمہاری

گلشن عشق میں بھی اس موقع پر اسی قسم کے الفاظ لا کر اور کہیں ہیرو کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کر کے ہیروئن کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مثلاً نظریں چار ہونے کے بعد جب چترسین پری سے اظہار محبت کرتا ہے تو وہ پہلے اسے روکھے انداز میں جواب دیتی ہے:

بولی وہ پری کہ ہوش میں آؤ — یہ اور کو سبز باغ دکھلاؤ

لیکن پھر فوراً ہی اس کا اندرونی تغیر ان الفاظ میں رونما ہوتا ہے۔

بولی وہ ''ہم کو دم نہ دیجے — باتیں کسی اور سے یہ کیجے''
بولی وہ ''مجھے ہوں کیوں عزیز آپ — نزدیک ہیں اپنے کوئی چیز آپ''

اور جب ہیرو پھر لجاجت سے کام لیتا ہے تو ''نوبت بایں جا رسد'' کہ:

یہ سن کے پری وہ مسکرائی — شرما کے، لجا کے پاس آئی
پائے جو وصال کے قرینے — چھاتی سے لگا لیا پری نے
تھی مست نگاہ داخل چشم — حاصل ہمہ تن تھا حاصل چشم

پری جب حظ وصل اٹھا کر گھر پہنچتی ہے تو ماں کے پوچھنے پر اسے بتاتی ہے کہ میں چچا کے گھر سے آئی ہوں۔ اس پر:

جھنجھلائی یہ سن کے مادر اس کی — کھینچی سر پر سے چادر اس کی
چلا کے کہا کہ ''بے حیا ہے — مردار تو قابل سزا ہے
زندان جفا تجھے دکھاؤں — صورت تیری خاک میں ملاؤں''

اب دلچسپی کی خاطر مختلف مواقع کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:

چترسین کا خط پری کے نام:

اے رشک ''پری رخان'' عالم — وے دلبر دلبراں عالم
اے مہر جمال و ماہ خوبی — وے مردمک نگاہ خوبی
اے باعث بیقراری دل — وے مرہم صد ہزار بسمل
اے شمع سرائے جاں گدازاں — وے چشم و چراغ عشق بازاں
تو سیم تنوں کی صف شکن ہے — تو عشق کی رہ میں راہزن ہے
بیتاب ہوں، سر کو دھن رہا ہوں — اک عمر سے تنکے چن رہا ہوں
فرقت میں ہے اضطراب، آؤ — آؤ پیاری شتاب آؤ

پری کا جواب:

اے عاشق زار رشک فرہاد — اے صورت قیس خانہ برباد
اے مثل ہزار دل شکستہ — وے صورت گل بخوں نشستہ
اے ماہی بحر آشنائی — وے غرقۂ ورطۂ جدائی

=====

ہے دام بلا میں مثل طائر — تو میرے لیے میں تیری خاطر
تو مجھ پہ فدا، میں تیرے واری — تو میرا محب، میں تیری پیاری
حسرت ہے کہ تیرے پاس آتی — بوسے لیتی گلے لگاتی
صدقے واری نثار ہوتی — امید سے ہمکنار ہوتی

پری کی دایہ جب اس کے والدین کو اس کی حالت سے آگاہ اور چترسین سے اس کی شادی کے لیے مجبور کرتی ہے تو:

ماں باپ نے سن کے حال دختر — دایہ سے کہا کہ ''خیر بہتر''
سن کر وہ انھی مراد پائی — آئی، بیٹھی، خبر سنائی

روشن نے جگہ محاوروں کے استعمال سے بھی اشعار میں حسن پیدا کیا ہے۔ اس کی بعض مثالیں اوپر گزر چکی ہیں، چند ایک اور ملاحظہ ہوں:

یعنی تھی وہ گل تو تھا یہ بلبل — بلبل رہی اور ہوا ہوا گل
جب نام خدا وہ ماہ پیکر — گھر پہنچی تو منتظر تھی مادر
دل داغوں سے صورت چمن تھا — ہوش اس کو رہا نہ تن بدن کا

صحرا میں اڑا رہا تھا وہ خاک دامان دل تھا مثل گل چاک

مثنوی کے خاتمے پر روشن نے اپنے حاسدوں، دشمنوں اور ان کے حسد کا ذکر کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ہم عصروں سے اس کی خاصی چشمک تھی۔ اس موقع پر جہاں اس نے اپنے حساد کو پیدا کیا ہے وہاں اپنے بارے میں خوب تعلّی سے کام لیا ہے۔ استاد کی توصیف کرنے کے بعد کہتا ہے

روشنؔ تا چند وصف اجداد کیسا بھائی کہاں کا استاد
ناخوش بود آں عروس در بر کو ناز کند بحسن مادر
(ایسی دلہن پہلو میں اچھی نہیں ہوتی جو اپنی ماں کے حسن پر ناز کرے)

ہاں، ہنر یاں جو ہوں تو میں ہوں گویائے جہاں جو ہوں تو میں ہوں
ارباب حسد پہ کیوں نہ در ہوں میں مردم دیدۂ ہنر ہوں
بدشکل جمال کیا دکھائے کم مایہ کمال کیا دکھائے
جب حال کھلے کہ ہوں میں کیا شے دشمن کیا چیز دوست کیا ہے؟
کیا شکوہ اگر عدو ہے دشمن بدگوئی ہے شیوہ اس کا روشنؔ
احمدؐ کہ سر آمد عرب بود ہم خستۂ خار بولہب بود
حاسد دشمن ہے بدچلن ہے نامردی سے اپنی طعنہ زن ہے
گر بابصر است بے بصر باد ورکور شد است کور تر باد
(اگر وہ یعنی حاسد بینا ہے تو خدا کرے نابینا ہو جائے، اور اگر وہ اندھا ہو گیا ہے تو خدا کرے وہ زیادہ اندھا ہو جائے)

ناشاد رہیں مرے مخالف برباد رہیں مرے مخالف

جیسا کہ ملاحظہ ہوا، روشن کو فارسی زبان پر خاصی گرفت ہے۔ فارسی اشعار اور مصرعوں کے علاوہ فارسی تراکیب سے بھی اس نے اپنے اشعار کو آراستہ کیا اور یوں ان میں دلچسپی پیدا کی ہے۔

پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا

مبصر: محمد سعید

اردو کی سب سے مقبول اور محبوب صنف، غزل، ایک تہذیب اور تہذیبی ورثے کی حیثیت اور درجہ رکھتی ہے۔ تقسیم کے بعد یہ تہذیبی وراثت پاکستان کے حصے میں بھی آئی ہے۔ پاکستانی شعرا نے اس تہذیب کو پاکستان میں زندہ رکھنے اور فروغ دینے کی بساط بھر کوششیں کی ہیں۔ تحقیقی اور تنقیدی حوالے سے دیکھا جائے تو پاکستان میں اردو غزل یا اسی موضوع کو جدید اردو غزل کے عنوان سے کلی یا جزوی طور پر زیر بحث لایا جاتا رہا ہے۔ چند ایک باقاعدہ کتب اور متعدد مقالات اس موضوع پر سامنے آ چکے ہیں۔ جن میں پاکستانی غزل کے تعارف، تنقید، تحسین اور تجزیے وغیرہ کی بھرپور کوششیں ہوئی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مثبت جائزے پاکستان میں اردو غزل کے فروغ اور بہتر مستقبل کی نوید اور وعید سناتے ہیں۔ یہاں اس موضوع پر ایک تازہ کتاب ''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا'' کا تعارف اور تجزیہ مقصود ہے۔

''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا'' کے موضوع پر ڈاکٹر انور صابر کو ۱۹۹۵ء میں شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور نے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ انور صابر نے ''۱۹۸۸ء میں اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور کی طرف سے موضوع کی توثیق کے بعد کام کا ڈول ڈالا''۔ یہ ضخیم مقالہ، اردو اکیڈمی، لاہور نے ۲۰۰۲ء میں شائع کیا ہے جو ۸۴۰ صفحات گھیرے ہوئے ہے۔ کوائف طباعت اور فہرست ابواب کے بعد مصنف کا تین صفحات پر مشتمل ''پیش لفظ'' ہے جس پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ مندرجہ ذیل نو (۹) ابواب میں اس مقالے کو تقسیم کیا گیا ہے۔

باب اول:	اردو غزل ..... قیام پاکستان تک	صفحہ ۱۵ تا ۱۷۲
باب دوم:	تشکیل پاکستان اور اردو غزل	۱۷۳ تا ۲۱۲
باب سوم:	پاکستان میں غزل کو متاثر کرنے والے محرکات و عوامل	۲۱۳ تا ۲۴۸
باب چہارم:	پنجاب میں اردو غزل	۲۴۹ تا ۴۳۲
باب پنجم:	سندھ میں اردو غزل	۴۳۳ تا ۵۶۵
باب ششم:	سرحد میں اردو غزل	۵۶۶ تا ۶۵۷
باب ہفتم:	بلوچستان میں اردو غزل	۶۵۹ تا ۷۱۸
باب ہشتم:	مشرقی پاکستان میں اردو غزل	۷۱۹ تا ۷۸۸
باب نہم:	پاکستان میں اردو غزل کا مستقبل	۷۸۹ تا ۸۱۷

آخر میں صفحہ ۸۱۹ تا ۸۴۰ تک ''کتابیات'' ہے۔ دوسرے، تیسرے اور آخری باب کے سوا تمام ابواب علاقائی اور صوبائی نسبت کے لحاظ سے شعرا کے سرسری تذکرے پر مشتمل ہیں۔ ہر باب کے آخر میں حوالے درج کرنے کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔

پہلے باب میں غزل کی تعریف اور اردو غزل کی ابتدا سے لے کر قیام پاکستان سے پہلے تک کے شعرا کا تذکرہ نما تعارف پیش کیا گیا ہے۔ تذکروں کے انداز میں شعرا کے ناموں کے ذیلی عنوانات بنا کر مختصر حالات اور کلام پر تبصرہ کے بعد کچھ نمونہ کلام درج کیا ہے۔

دوسرے اور تیسرے باب میں تقسیم، ہجرت، فسادات، مارشل لا، سقوط ڈھاکہ، ادبی، مذہبی اور علاقائی تعصبات جیسے مسائل کے پس منظر میں پاکستان میں اردو غزل کا مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر نوع کے حالات و تغیرات کے تذکرے کے بعد ان سے متعلقہ اشعار کی مثالیں دی ہیں۔ چوتھے سے آٹھویں باب تک علاقائی تقسیم سے پاکستان کے معروف اور کم معروف شعرا کا تذکرہ آیا ہے۔ ہر باب کے شروع کے تین چار تمہیدی صفحات کے بعد ذیلی عنوانات دے کر شعرا کی تاریخ ولادت کی زمانی ترتیب سے، اجمالی تعارف، کلام پر مختصر تبصرہ اور نمونہ کلام شامل ہے۔ ان میں سے ہر باب کے آخر میں ''مقالے کی تنگ دامانی'' کے سبب ''متفرق شعرا'' کے ذیلی عنوان سے کچھ مزید معروف اور کم معروف شعرا کے ایک ایک دو دو شعر بغیر کسی تعارف اور تبصرے یا حوالے کے درج کر دیے ہیں۔ گویا مذکورہ پانچ ابواب میں سے ہر ایک کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ تمہید، شعرا کا باقاعدہ تذکرہ اور متفرق شعرا۔ تعداد کے لحاظ سے ان میں بالترتیب پنجاب کے ۵۹ شعرا باقاعدہ تذکرے کے مستحق اور مکمل ٹھہرے اور ۵۸ متفرق شعرا کی ذیل میں آئے۔ اسی طرح سندھ کے ۵۷ متذکرہ اور ۲۶ متفرق، سرحد کے ۴۵ متذکرہ اور ۱۵ متفرق، بلوچستان کے ۲۹ متذکرہ اور ۲۶ متفرق اور مشرقی پاکستان کے ۳۶ متذکرہ اور ۱۷ متفرق شعرا کی ذیل اور زد میں آئے ہیں۔ آخری باب میں ''پاکستان میں اردو غزل کا مستقبل'' تلاشنے کی کوشش کی گئی ہے۔

زیر نظر کتاب ''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا'' کے تعارف کے بعد ذیل میں اس کے مطالعے کے نتیجے میں سامنے آنے والے چند سامنے کے مشاہدات اور معروضات پیش خدمت ہیں:۔

☆ کتاب کے عنوان میں ''ارتقا'' کا لفظ اضافی اور غیر ضروری ہے۔ یہ صرف ''پاکستان میں اردو غزل'' یا ''پاکستان میں اردو غزل کا فروغ'' ہونا چاہیے تھا۔ اردو غزل کی پوری تاریخ کا جائزہ مقصود ہو تو اس میں ارتقا بنایا اور دکھایا جا سکتا ہے۔ ارتقا دبستانوں کا متقاضی ہوتا ہے۔ مختلف رویوں یا رجحانات کا دبستانوں کی صورت اختیار کرنا، صدیوں، قرنوں کا محتاج ہوتا ہے۔ پاکستان میں لکھی جانے والی غزل میں مختلف رجحانات یا اپنے عہد کے حالات و واقعات کی ترجمانی کرنے والے موضوعات تو ہیں لیکن غزل کی پچھلی روایت سے ہٹ کر کوئی نئی اور بڑی تبدیلی شاید نہیں ہوئی۔ تقسیم، ہجرت، فسادات، حسن و عشق، تصوف یا دیگر موضوعات اگر پاکستانی غزل میں ہیں تو اپنے اپنے عہد کے مطابق یہ موضوعات پہلے کی غزل میں بھی موجود ہیں اور غزل کا یہی کمال ہے کہ اپنی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس نے ہر عہد میں بھرپور زندگی کا ثبوت دیا ہے اور ہر عہد اس میں سانس لے رہا ہے۔ اردو غزل کے اس وسیع سمندر میں پاکستان کے پچاس پچپن سال محض ایک لہر کی مانند موجزن ہیں۔

پاکستانی غزل اپنی شناخت اور پہچان رکھتی ہے اور انفرادیت کی حامل ہے لیکن اسے شاید ایک دبستان کا درجہ حاصل کرنے کے لیے ابھی اسے طویل سفر درکار ہے۔ اس کے ارتقا کا جائزہ اس وقت پر موقوف ہے، جب اس کے مختلف رجحانات الگ الگ دبستانوں کا درجہ حاصل کر لیں۔ پھر یہ کہ زیر نظر کتاب سے قطعاً واضح نہیں ہوتا کہ پاکستانی غزل نے کوئی نئی منزل سر یا طے کی ہے جسے پچھلی روایت پر فوقیت یا اس میں ترقی کہا جا سکے۔

☆ شعرا کی علاقائی یا صوبائی تقسیم کر لینے سے، پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا، اگر ہے بھی تو قطعاً نمایاں نہیں ہو پایا۔ لہٰذا ابواب کی موجودہ تقسیم غیر مناسب اور بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ ان شعرا کے موضوعات تو کم و بیش ایک ہی جیسے رہے ہیں۔ اب اگر ان کو پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان وغیرہ میں تقسیم کر دیا جائے تو موضوعات تو ہزار بار دہرائیں جائیں گے (اور یہاں ایسا ہی ہوا ہے) پھر یہ کہ ہر باب میں نئے سرے سے آغاز و ارتقا کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس سے پاکستانی غزل کی انفرادیت یا مرکزیت واضح نہیں ہو سکی یا نہیں کی جا سکی۔ ابواب کی اس تقسیم کی بنیاد مقالہ نگار نے، پنجاب یونیورسٹی میں پیش کیے گئے پی ایچ۔ڈی کے ایک خاکے پر رکھی ہے۔

''.....جس کا عنوان 'پاکستان میں جدید غزل' تھا۔ اس میں بھی صوبوں کے حوالے سے ابواب بنائے گئے تھے۔ یہ بات میرے لائحہ عمل کی ایک طرح سے توثیق اور..... نیک فال کے مترادف تھی''۔ (ص ۱۱۔۱۲)

مذکورہ خاکہ ''توثیق'' اور ''نیک فال'' کیسے ہو سکتا ہے کہ جس پر کبھی کام نہ ہو سکا۔

☆ پہلا باب جو ڈیڑھ سو سے زیادہ صفحات گھیرے ہوئے ہے، غیر ضروری ہے۔ آغاز سے لے کر ۱۹۴۷ء تک کے غزل گو شعرا کا اجمالی تعارف، تبصرہ کلام اور نمونہ کلام درج کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور مصنف کوئی نئی بات بھی نہیں کر پائے۔ یہ ادبی پس منظر اگر بہت ہی ضروری تھا تو اسے زیادہ سے زیادہ پچاس صفحات میں سمیٹنا چاہیے تھا۔ وہ بھی اس طرح کہ اس دور کی اردو غزل کے نمایاں رجحانات اور تبدیلیوں کا فکری جائزہ لیا جاتا۔ الگ الگ شعرا کی سوانح کی ضرورت تھی نہ تبصرہ کلام اور نمونہ کلام کی۔

☆ دوسرا اور تیسرا باب جن کو مقالے کے اصل موضوع سے کچھ تعلق ہے یہ ایک ہی باب کے مباحث ہیں بلکہ مقالے کے مندرجات کی موجودہ صورت میں زیادہ بہتر یہ تھا کہ تیسرے باب میں، پاکستانی غزل کو متاثر کرنے والے جن محرکات و عوامل کی نشاندہی کی گئی ہے، ان کو آخری باب میں شامل کیا جاتا جہاں پاکستان میں اردو غزل کے مستقبل کے امکانات کا جائزہ مقصود تھا تاکہ واضح کیا جا سکتا کہ متاثر کن عوامل کے باوجود غزل اپنی بھرپور زندگی بتا رہی ہے اور پروان چڑھ رہی ہے۔

آخری باب کا ذکر آیا تو اسے بھی دیکھتے چلیے جس کا عنوان ہے: ''پاکستان میں اردو غزل کا مستقبل''۔ صرف ۳۴ صفحات پر مشتمل اس مختصر باب میں غزل کی تعریف، ہیئت، ردیف و قوافی کی پابندیاں اور مشکلات، تجرباتی غزل اور کلیم الدین احمد تک غزل کے معترضین کے تذکرے اور جائزے کے بعد، اس باب کے موضوع سے متعلق، سب سے آخر میں صرف یہ چند سطریں لکھی ہیں:

''یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ غزل ماضی کے بھی تلخ و شیریں حوالوں کے پل صراط سے گزر کر عہد حاضر کی جولانگاہ تک پہنچی ہے تو عہد موجود کے جہنم زار سے بھی کامیابی و کامرانی کے ساتھ گزرتی ہوئی مستقبل کا ساتواں در کھولنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرے گی''۔ (ص: ۸۱۳)

ان چند سطروں کے سوا، اس پورے باب کا، پاکستان میں اردو غزل کے مستقبل سے کیا تعلق بنتا ہے یہ مصنف ہی بتا سکتے ہیں۔ اسی طرح ''تلخ و شیریں حوالوں کے پل صراط''، ''عہد حاضر کی جولانگاہ''، ''عہد موجود کے جہنم زار'' اور ''مستقبل کا ساتواں در کھولنا'' کس تحقیقی اسلوب کی ذیل میں آتے ہیں۔

☆ چوتھے باب سے صوبائی لحاظ سے، پاکستان کے شعرا کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ فہرست میں ہر باب کے تحت متذکرہ

شعرا کے نام، زمانی ترتیب سے درج کیے ہیں۔ ان میں سے چند ایک متن کی ترتیب کے مطابق نہیں۔ چند ایک فہرست میں موجود ہیں لیکن متن میں ان کا تذکرہ کسی دوسرے شاعر کے معاصرین کے طور پر کر دیا ہے یا سرے سے ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ متن میں کچھ شعرا کے سال ولادت و وفات دیے ہیں کچھ کے نہیں دیے۔ جو شعرا بقید حیات ہیں ان میں بھی اکثر کی تاریخ ولادت درج نہیں کی گئی۔ اگر یہ تواریخ تلاش کر لی جائیں تو شعرا کی موجودہ ترتیب میں ممکن ہے بڑی حد تک تبدیلی کرنا پڑے۔

☆ صوبائی لحاظ سے بنائے گئے ہر باب کے شروع میں، شعرا کے تذکرے سے پہلے ''پنجاب میں غزل کی روایت''، ''سندھ میں اردو غزل کی روایت''، ''سرحد میں اردو کی روایت اور اردو غزل کی ابتدا'' جیسے ذیلی عنوانات بنا کر ''تمہیدیں'' باندھی گئی ہیں۔ گویا پاکستان کیا ہر صوبے میں غزل کے ارتقا کا جائزہ پیش کر دیا گیا ہے۔ پنجاب کے علاوہ تمام صوبوں کے شعرا کے تذکرے میں، شروع میں ایسے شعرا بھی آ گئے ہیں جو قیام پاکستان سے پہلے انتقال فرما چکے ہیں۔ مثلاً سندھ کے پہلے ۱۳ شعرا ایسے ہیں۔ سرحد کے ۲۲، بلوچستان کے ۶ اور مشرقی پاکستان کے ۱۱۵ ایسے شعرا کا تذکرہ آیا ہے۔ (یہ تعداد صرف وہ ہے جن کی تاریخ وفات کا اندازہ اس مقالے سے ہوا) ان شعرا کا پاکستانی غزل سے کیا تعلق اور یہاں ان کے تذکرے کا کیا جواز ہے؟ کیا انہیں پہلے باب کا حصہ نہیں ہونا چاہیے تھا اور اگر وہاں نہیں ہوا تو کیوں؟

☆ شعرا کے تذکرے کا مصنف نے جو طریقہ کار وضع کیا ہے وہ یہ کہ شاعر کا نام جلی عنوان سے، اس کے بعد مختصر تعارف یا سوانح، کلام پر مختصر تبصرہ اور نمونہ کلام۔ لیکن اکثر شعرا تعارف یا سوانحی کوائف سے محروم رہے ہیں۔ جن کا تعارف دیا ہے اس میں بھی کوئی تحقیقی انداز اور استناد برقرار نہیں رکھا۔

☆ مقالہ لکھتے وقت مصنف نے اہم، کم اہم یا غیر اہم شعرا کی کوئی تخصیص یا معیار پیش نظر نہیں رکھا۔ ان کے ''پیش لفظ'' سے ایک اقتباس پڑھنے کی زحمت گوارا کیجیے:

> ''آغاز کار میں شعرا کی کثیر تعداد کے پیش نظر طے کیا گیا تھا کہ اس مقالے میں انہی شعرا کا جائزہ شامل کیا جائے جو قومی اور صوبائی سطح پر غزل کے فروغ میں کوئی مثبت کردار ادا کر چکے یا ادا کر رہے ہوں اور ان کا کم از کم ایک مجموعہ کلام زیور طباعت سے آراستہ ہو چکا ہو۔ پنجاب اور سندھ کی حد تک تو اس اصول کو پیش نظر رکھنا ممکن ہو سکا مگر سرحد اور بلوچستان کے ان شعرا کا اجمالی جائزہ بھی ناگزیر ہو گیا جو اپنے مبلغ شعری کو زیور طباعت سے آراستہ نہ کر سکے''۔ (ص ۱۲)

اس اقتباس میں مصنف شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ پہلے انہوں نے ایسے شعرا کو شامل کرنے کا سوچا جن کا کم از کم ایک مجموعہ کلام چھپ چکا ہے۔ لیکن سرحد اور بلوچستان میں ایسے شعرا زیادہ تعداد میں نہ مل سکنے کی وجہ سے مجبوراً ان کو بھی شامل کرنا پڑا جن کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے کوئی اصول بھی طے کرنا چاہا یا کیا لیکن مقالے میں اس سے یکسر صرف نظر کیا ہے۔ مثلاً: پنجاب کی حد تک ایسے متذکرہ شعرا بھی ہیں جن کا کوئی مجموعہ کلام نہیں چھپا (حالانکہ ان کے بارے میں مصنف خود کفیل تھے کہ کثیر تعداد میں ہونے کی وجہ سے انہیں مجموعہ کلام کے مطبوعہ ہونے کی شرط لگانا پڑی) اور اس باب کے آخر میں ''متفرق شعرا'' کے تحت ایسے بھی ہیں جن کے ایک سے زیادہ مجموعہ ہائے غزل یا نظم و غزل ۱۹۹۵ء سے پہلے چھپ چکے تھے (بعض کے ایک سے زیادہ ایڈیشن بھی طبع ہو چکے تھے)۔

چوتھے باب ''پنجاب میں اردو غزل'' کے تحت آنے والے ''متفرق شعرا'' میں سے صرف چند مثالیں:

۱۔ ہجاب باقر رضوی: ''تیشۂ لفظ'' (طبع اول، مارچ ۱۹۶۸ء)

۲۔ شہرت بخاری: ''غزلیں''، ''طاق ابرو''

۳۔ امجد اسلام امجد: ''ساتواں در (۱۹۷۸ء)''، ''فشار'' (۱۹۸۲ء)، ذرا پھر سے کہنا (۱۹۸۸ء)
(۱۹۹۱ء میں امجد اسلام امجد کی شعری کلیات بھی چھپ چکی تھی)

۴۔ تنویر سپرا: ''لفظ کھر درے'' (طبع اول ۱۹۸۵ء، طبع سوم ۱۹۹۴ء)

۵۔ جمیل یوسف: ''غزل'' (طبع اول: ۱۹۸۵ء، طبع دوم ۱۹۹۱ء)

۶۔ عباس تابش: ''تمہید'' (طبع اول، جولائی ۱۹۸۶ء)

۷۔ اسرار زیدی: ''خط غبار'' (اشاعت اول ۱۹۸۷ء)

۸۔ خالد احمد: ''ہتھیلیوں پہ چراغ''، ''دراز پلکوں کے سائے سائے''، ''پہلی صدا پرندے کی''

۹۔ بیدل حیدری: ''پشت پہ گھر''

۱۰۔ رشید قیصرانی: ''فصیل لب''

ان کے علاوہ، انور محمود خالد، ساقی فاروقی، سبط علی صبا، انور مسعود، جمیل ملک، ارشد ملتانی، عدیم ہاشمی، (عدیم ہاشمی کو مصنف نے پنجاب اور سرحد دونوں جگہ ''متفرق شعرا'' میں رکھا ہے) جاوید شاہین، افتخار نسیم اور خالد اقبال یاسر کو ''متفرق شعرا'' میں شامل کر کے غیر اہم قرار دینا بھی انصاف سے بعید ہے۔

یہ تو وہ صورت رہی کہ کسی نہ کسی طرح ان شعرا کا ذکر مقالے میں آ گیا۔ کچھ ایسے شعرا بھی ہیں جو باقاعدہ تذکرے میں جگہ پا سکے نہ متفرق شعرا کی صف میں شامل ہیں۔ اس نوع کی بھی چند مثالیں:

۱۔ اکبر حمیدی: ''لہو کی آگ'' (۱۹۷۰ء)، ''آشوب صدا'' (۱۹۷۷ء)، ''تلوار اس کے ہاتھ'' (۱۹۸۶ء)، ''شہر بدر'' (۱۹۹۱ء)

۲۔ سحر انصاری: ''نمود'' (۱۹۷۶ء)

۳۔ واصف علی واصف: ''شب چراغ'' (۱۹۷۸ء)، ''شب زاد'' (۱۹۹۴ء)

۴۔ جوہر نظامی: ''لوح محفوظ'' (۱۹۷۸ء)، ''وہم رسا'' (۱۹۸۸ء)

۵۔ حسن اکبر کمال: ''خزاں میرا موسم'' (اشاعت اول: ۱۹۸۰ء، دوم ۱۹۹۰ء، آدم جی انعام یافتہ)

۶۔ سید حسن عباس زیدی: ''خلش دل'' (۱۹۸۶ء)

۷۔ فرحت عباس شاہ: ''شام کے بعد'' (بار اول، جون ۱۹۸۹ء)

۸۔ قیصر بارہوری: ''امتزاج'' (۱۹۹۰ء)

۹۔ اختر شمار: ''کسی کی آنکھ ہوئے ہم'' (۱۹۹۱ء)

۱۰۔ دل نواز دل: ''داغ داغ دل'' (۱۹۹۳ء)

۱۱۔ نوشی گیلانی: ''محبتیں جب شمار کرنا'' (فروری ۱۹۹۳ء)

۱۲۔ غلام حسین ساجد: ''عناصر'' (۱۹۹۳ء)

۱۳۔ عالم تاب تشنہ: ''موج موج تشنگی''، ''آئینے کے اس طرف''

مزید تحقیق وتلاش سے مذکورہ ہر نوع کی مثالوں کی ایک لمبی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔

☆ پہلے ذکر ہوا کہ مقالہ نگار نے اہم اور کم اہم شعرا کی تخصیص نہیں رکھی اور نہ مجموعہ کلام کے چھپنے کی شرط یا اصول کو اپنایا گیا ہے۔ ممکن ہے انہوں نے اپنے ذہن کی حد تک (جس کا اظہار نہ ہو سکا) یہ بات سوچ رکھی ہو کہ اہم شعرا کا تذکرہ لکھنا ہے۔ لیکن یہاں ایسی بھی شتر گربگی نظر آتی ہے کہ بہت سے غیر معروف یا کم اہم شعرا کو تو باقاعدہ تذکرے میں جگہ ''نصیب'' ہوئی اور بہت سے اہم اور معروف شعرا اپنے دامن میں ایک سے زیادہ مجموعہ ہائے غزل یا نظم وغزل رکھنے کے باوجود اپنا نام بھی اس میں نہ لکھوا سکے۔ اگر مصنف دانی ہوں کہ انہوں نے اپنے معیار نقد کے لحاظ سے اہم اور غیر اہم شعرا کی تخصیص پیش نظر رکھی ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تخصیص غزل گو شعراء کے لحاظ سے کیوں نہیں رکھی۔ کیونکہ مقالے میں یہ صورت رہی ہے کہ اگر ایک شاعر بنیادی طور پر نظم گو ہے اور اس نے غزل محض ''انگلی کٹوا کر شہیدوں میں نام لکھوانے کے لیے'' لکھی ہے لیکن قدرے معروف ہونے کی وجہ سے اسے باقاعدہ تذکرے میں جگہ ملی ہے۔ دوسری طرف یہ کہ ایک شاعر بنیادی طور پر غزل گو ہے اور اس کے ایک سے زیادہ مجموعہ ہائے غزل چھپ بھی چکے ہیں لیکن وہ معروف نہ ہونے کے سبب کم اہم یا غیر اہم قرار دے دیا گیا ہے۔

☆ جن شعرا کا باقاعدہ تذکرہ کیا گیا ہے ان کے سوانحی حصے کو چھوڑ بھی دیں تو ان کے کلام پر کیے گئے تبصرے بھی پایہ اعتبار کو نہیں پہنچتے کیونکہ اکثر شعرا کے کلام کو زیر بحث لاتے ہوئے ان کے تمام مجموعہ ہائے کلام کو سامنے نہیں رکھا گیا۔ (کسی شاعر کے نمائندہ مجموعے پیش نظر رکھنے کا اصول بھی نہیں اپنایا) اس سلسلے کی صرف ایک مثال کہ عارف عبدالمتین کے تذکرے میں ان کے دو مجموعہ ہائے غزل کو نظر انداز کیا گیا اور یہ دونوں مقالہ لکھنے سے بہت پہلے چھپ چکے تھے۔

۱۔ ''چراغ کا گھاؤ'' ۱۹۸۷ء (اس میں ۶۳ غزلیں ہیں)

۲۔ ''حرف دعا'' ۱۹۸۸ء (اس میں ۹۰ غزلیں ہیں)

ایسی مثالوں کی فہرست بھی طویل ہے لیکن اس ایک ہی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ شعرا کی غزلوں کے مجموعوں کو نظر انداز کر کے ان کی نظموں کی بنیاد پر ''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا'' کیسے اور کیسا بتایا گیا ہوگا۔

☆ زیر نظر مقالے کے مطالعے سے ایک اور احساس شدت سے ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے کئی اہم پاکستانی غزل گو شعرا کی غزلیات کا براہ راست مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس سلسلے کی دو مثالیں درج کرنا ضروری ہے کہ ایک کو سہو کاتب نہ قرار دے لیا جائے۔

۱۔ یوسف ظفر کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے مجموعہ کلام ''صدا بصحرا'' پر عابد علی عابد کے تبصرے سے اقتباس درج کرنے کے بعد اور نمونہ کلام درج کرنے سے پہلے لکھتے ہیں کہ:

''درج ذیل نمونہ کلام ان (یوسف ظفر) کے مجموعے ''صدا بصحرا'' سے لیا گیا ہے''۔ (ص:۲۹۴)

''صدا بصحرا'' یوسف ظفر کی نظموں کا مجموعہ ہے جو پہلی بار جون ۱۹۶۱ء میں گلڈ پبلشنگ ہاؤس لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں غزل تو کیا غزل کا کوئی ایک شعر بھی شامل نہیں۔

۲۔ عارف عبدالمتین کا نمونہ کلام درج کرنے سے پہلے لکھتے ہیں:

''عارف کی غزل کی چند جھلکیاں درج ذیل ہیں: (۱۱۰)'' (ص:۳۲۰)

اس چوتھے باب کے حوالہ جات میں مذکورہ حوالہ نمبر ۱۱۰ پر یہ حاشیہ ملتا ہے:

''عارف عبدالمتین کے پانچ مجموعہ ہائے کلام، امکانات، آتش سیال، دیدہ ودل، موج در موج، صلیب غم، شائع ہو چکے ہیں''۔ (ص:۴۲۶)

عارف کی کتاب ''امکانات'' کو انہوں نے مقالے کی کتابیات کے آخری حصے ''دواین ومجموعہ ہائے کلام'' میں بھی شامل رکھا ہے۔ (ص:۸۳۸) جبکہ ''امکانات'' عارف کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ جس کا دوسرا ایڈیشن ٹیکنیکل پبلشرز لاہور سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔

☆ مصنف نے شعرا کے اس تذکرے کا جو طریقہ کار اپنایا ہے وہ ایم۔ اے اور بی۔ اے کے طالب علموں کے نصابی مشقیں (Assinments) لکھنے کے مترادف ہے۔ کسی نقاد کا اقتباس درج کرنے سے پہلے یا بعد میں اس اقتباس کا خلاصہ یا تشریح لکھ دی ہے، پھر کسی دوسرے نقاد کا اقتباس اور اس کی تشریح۔ غرض پورے مقالے میں، فال نکالنے کے انداز میں کوئی سا بھی صفحہ دیکھ لیجیے، اس طرز اور روش کو مقالہ نگار نے بڑے اہتمام کے ساتھ اپنایا اور نبھایا ہے۔ اس طرز نگارش سے مقالے کے تحقیقی یا تنقیدی معیار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

☆ مقالے کی تحقیقی یا تنقیدی اہمیت کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے، مصنف کی خوش نیتی اور نیک صفتی نے خود ہی ایک اہتمام کر دیا ہے۔ انہوں نے حوالہ جات میں یہ نشاندہی کر دی ہے کہ کون سا اقتباس کس مجموعۂ کلام کے دیباچے یا فلیپ سے لیا گیا ہے۔ صرف چوتھے باب ''پنجاب میں اردو غزل'' کو دیکھتے ہیں جس میں کل ۲۲۰ حوالہ جات آئے ہیں ان میں سے ۱۶ اقتباسات شعرا کے مجموعہ ہائے کلام پر کیے گئے تبصروں سے لیے گئے ہیں۔ (اس میں وہ تبصرے شامل نہیں جو کسی ایک کتاب پر تبصرہ ہی ہوتے ہیں لیکن انہیں کوئی عنوان دے کر مضمون بنا لیا جاتا ہے) ۲۹ فلیپس (Phalaps) سے اور ۳۶ دیباچے، مقدمے، تقاریظ یا پیش لفظ وغیرہ سے لیے گئے اقتباسات ہیں۔ ''کرائے'' پر یا فرمائشی طور پر، مجموعہ ہائے کلام کی تقریب رونمائی یا پذیرائی میں پڑھے گئے مقالات، یا ان پر لکھے گئے فلیپس، تبصروں یا دیباچوں کی جو تنقیدی اہمیت ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ جس پی ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے کی بنیاد یا ماخذ اس نوعیت اور سطح کے حوالے بنے اور رہے ہوں، اس کی اہمیت کے بارے میں دو آرا کیا ہو سکتی ہیں۔

☆ اقتباسات تحقیق کی جان ہوتے ہیں۔ انہی کے ذریعے اور سہارے تحقیق آگے بڑھتی ہے اور دریافت یا بازیافت کے نئے در وا ہوتے ہیں۔ لیکن ''کوٹ کرنے'' کے فن سے آگاہی لازمی شرط ہے۔ اسکالر کو پتا ہونا چاہیے کہ کون سا اقتباس درج کرنا ہے اور کون سا نہیں کرنا۔ جب تک ہر اقتباس کوئی نئی گرہ نہ کھولتا ہو درج نہیں کرنا چاہیے۔ عام اور سامنے کے مشاہدات ومطالعات کو ''کوٹ کرنا'' غیر ضروری ہوتا ہے۔ زیر نظر مقالے میں اس غیر ضروری بات کا اہتمام بھی بڑی فراخ دلی سے کیا گیا ہے۔ کسی شاعر کے کلام میں اگر شدت جذبات ہے، وارفتگی ہے، غم دوراں یا غم جاناں کے سلسلے ہیں تو ان کے لیے استدلال اور اقتباسات کی کیا ضرورت؟ یہ سامنے کی باتیں تو غزل کے لوازم میں سے ہیں۔ اس مقالے میں موجود اقتباسات کا مزید شماریاتی مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

- مقالہ ۲۵ سطری مسطر میں کمپوز ہوا ہے۔
- تقریباً ہر شاعر کا تذکرہ دو تین یا چار صفحات پر مشتمل ہے۔

- ہر شاعر کے تذکرے میں کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ یا سات اقتباسات آئے ہیں۔
- چند ایک کو چھوڑ کر یہاں مندرج اقتباسات کم از کم تین، چار اور زیادہ سے زیادہ چودہ پندرہ سطری مسطر کے ہیں جن میں سے کثیر تعداد چھے سے آٹھ سطری مسطر کی ہے۔
- پورے مقالے میں نظیر صدیقی کی کتاب ''جدید اردو غزل۔ایک مطالعہ'' کے ۵۸ اقتباسات آئے ہیں۔
- چھٹے باب میں ۸۰ حوالہ جات میں سے ۳۵، فارغ بخاری کی کتاب ''ادبیات سرحد'' سے لیے ہیں۔
- ساتویں باب میں ۴۲ میں سے ۱۵، انعام الحق کوثر کی ''بلوچستان میں اردو'' کے ہیں۔
- آٹھویں باب میں ۸۱ میں سے ۲۳، وفا راشدی کی ''بنگال میں اردو'' سے لیے ہیں۔
- چوتھے باب میں سعادت سعید کے صرف ایک مضمون ''پاکستانی اردو غزل۔ایک اجمالی تعارف'' سے لیے گئے ۱۵ اقتباسات شامل ہیں۔
- حوالہ جات کے مطابق ۸۴۰ صفحات کے اس مقالے میں تقریباً ایک ہزار اقتباسات درج ہوئے ہیں۔

اس تحقیقی مقالے کے پچاس فیصد ماخذ تو دیباچوں اور تبصروں کی تنقید پر اور باقی، تعارفی یا تشریحی نوعیت کی علاقائی تواریخ ادب پر مبنی ہیں۔ غیر ضروری اقتباسات کی بھرمار اس پر مستزاد ہے۔

☆ ہر شاعر کے تذکرے کے بعد اس کا نمونہ کلام بھی درج کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار ''پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں کہ شعرا کے:

''کلام کے انتخاب میں ممکن حد تک اختصار سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے''۔ (ص:۱۳)

جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ باقاعدہ شمار کے مطابق پورے مقالے میں تین ہزار سے زیادہ اشعار درج اور شامل ہیں۔ کسی تذکرے میں بھی شاید ہی اس قدر شعرا کا نمونہ کلام درج ہوا ہو جتنا اس پی ایچ۔ڈی کے تحقیقی مقالے میں آیا ہے۔ مقالہ نگار کو اس بات کا احساس ضرور رہا لیکن وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ لکھتے ہیں کہ مقالے میں:

''مختلف شعرا کی غزلیات کے اشعار ممکن ہے کچھ زیادہ نظر آئیں..... مگر کسی بھی غزل گو کے مقام و مرتبے کے تعین کے لیے امکانی کسوٹی کلام شاعر ہی ٹھہرتا ہے''۔ (ص:۱۳)

ممکن ہے یہ جواز ان کے نزدیک درست ہو لیکن دیکھنا یہ ہے کہ شعرا کے مقام و مرتبے کا تعین، ان کے کلام کے مطالعے سے اگر خود قاری نے ہی کرنا ہے تو پھر آپ نے یہ زحمت کیوں کی۔

☆ مندرجہ بالا تین چار پہلوؤں سے کیے جانے والے شماریاتی مطالعے سے یہ مثبت نتیجہ نکلتا ہے کہ مقالے کی بے جا طوالت اور ضخامت کو کیسے کم کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً پہلے باب کے ڈیڑھ سو سے زیادہ صفحات میں سے کم از کم سو صفحات غیر ضروری ہیں۔ اوسطاً آٹھ سطری ایک ہزار اقتباسات نے تقریباً تین سو صفحات گھیرے ہیں جن میں سے دو سو صفحات گھیر لینے والے اقتباسات کو ختم کیا جا سکتا تھا۔ اس مقالے کے ایک صفحے پر ۱۲ شعر آ سکتے ہیں۔ اس طرح تین ہزار اشعار نے تقریباً دو سو پچاس صفحات سمیٹ لیے ہیں۔ ان اشعار سے بھی کم از کم ایک سو صفحات کو بچایا جا سکتا تھا۔ اس وقت نظر اور دیدہ ریزی سے تقریباً چار سو صفحات تک، مقالے کی ضخامت کم کی جا سکتی تھی۔ (یہ تجویز صرف مقالے میں موجود اور حاضر مواد کی حد تک درست ہے۔ اگر نظری رہ جانے والے شعرا کو شامل کرنا مقصود ہو تو یہ معیار انتخاب مزید سخت اور کڑا کرنا پڑے گا۔)

☆ مصنف لکھتے ہیں کہ تقریباً دو سو شعرا کو انہوں نے سوالنامہ بھیجا تھا ''جن میں سے ساٹھ کے قریب حضرات گرامی نے جوابات سے نوازا''۔ (ص:۱۲)

مقالے کی ''کتابیات'' میں ان ساٹھ انٹرویوز کا اندراج نہیں ہو سکا۔ دوسری بات یہ کہ مختلف ابواب کے حوالہ جات میں، صرف تین حضرات کے انٹرویوز کو ماخذ قرار دیا ہے۔ باقی ستاون کن کے ہیں اور انہیں کہاں کھپایا گیا، کہیں وضاحت نہیں ملتی۔

☆ پیش لفظ میں درج ہے کہ مقالے کی:

''کتابیات میں حوالہ جات کی کتب اور رسائل و اخبارات کے مکمل کوائف درج کیے گئے ہیں''۔ (ص:۱۲)

حوالہ یا کتابیات کے اندراج کا جو مروجہ تحقیقی طریقہ کار ہے اس میں سے کسی ایک کو بھی نہیں اپنایا گیا سوائے اس کے کہ ''کتابیات'' مصنفین کی الفبائی ترتیب سے درج ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی کتاب ''ادبی تحقیق کے اصول'' ۱۹۹۲ء میں شائع ہو چکی تھی جس کے آخری باب ''حوالہ نگاری کا فن'' (ص:۲۳۱ تا ۲۴۸) میں تمام ناقدین اصول تحقیق سے زیادہ تفصیل کے ساتھ حوالے اور کتابیات کے اندراج کا تحقیقی طریقہ کار بتایا گیا ہے۔ اس کتاب سے یا کسی بھی دوسری کتاب سے اس سلسلے میں رہنمائی نہیں لی گئی۔ حوالہ یا کتابیات کے غلط اندراج کی مثالیں دینے سے صرف نظر کرتے ہوئے اس سلسلے کی صرف دو تین قابل ذکر باتیں:۔

- کتابیات کے پہلے حصے میں حوالہ جاتی کتب ہیں اور آخری حصے کو ''دواوین و مجموعہ ہائے کلام'' کا نام دیا ہے۔ لیکن بیشتر مجموعہ ہائے کلام اور شعری کلیات وغیرہ دونوں جگہ درج کر دیے ہیں۔
- ''رسائل و جرائد'' کے تحت ۲۵ رسائل کے نام درج ہیں جن میں سے ۱۰ رسائل کے ''مکمل فائل'' دیکھنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ ممکن ہے مصنف کا یہ دعویٰ درست ہو لیکن انہوں نے، سہ ماہی ''اردو'' ماہنامہ ''نگار'' اور ماہنامہ ''ماہ نو'' کے آگے بالترتیب، کراچی، کراچی اور لاہور لکھ کر ''مکمل کوائف'' درج کرنے کی بجائے ''مکمل فائل'' لکھ دیا ہے۔ یہ تینوں رسائل مختلف اوقات میں مختلف شہروں سے نکلتے رہے۔ یہاں ایک ہی شہر کا ذکر کرنے سے ''مکمل فائل'' دیکھنے کا دعویٰ مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔
- کتابیات کے پہلے حصے کی کچھ کتب کے مکمل حوالے نہیں درج کیے گئے۔ ''دواوین و مجموعہ ہائے کلام'' میں سے کسی ایک کا بھی مکمل حوالہ نہیں صرف شاعر کا نام اور اس کے مجموعہ کلام کا نام اور بس۔ کتب حوالہ کا نامکمل اندراج اور رسائل کے آگے ''مکمل فائل'' یا ''متعدد شمارے'' لکھ دینے کو ''مکمل کوائف درج کیے ہیں'' کیسے مان لیا جائے۔

مختلف نوعیت کے مندرجہ بالا شواہد کے علاوہ ''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا'' کے بارے میں ابھی کچھ ''مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں''، جنہیں اجمالاً درج گزٹ کیا جاتا ہے۔

- ابواب کی تقسیم میں آزاد کشمیر اور فیڈرل ایریا کے شعرا کو الگ سے نمائندگی نہیں دی گئی۔
- شعرا کے اندراج کے تین ممکنہ طریقے ہو سکتے ہیں۔ ولادت کس شہر یا صوبے میں ہوئی۔ زندگی کا زیادہ حصہ جہاں گزارا یا گزار رہا ہے اور تیسری صورت یہ کہ زندگی کے آخری دن کہاں گزارے یا گزار رہا ہے۔ ان تین طریقوں میں سے کسی ایک کو اپنانا چاہیے تھا لیکن یہاں ایسا نہیں ہو سکا۔
- ایک شاعر کے بارے میں صیغہ واحد استعمال کیا ہے تو دوسرے کے بارے میں جمع اور بعض اوقات یہ دونوں صیغے ایک ہی شاعر کے بارے میں استعمال ہوئے ہیں۔

- اقتباس درج کرتے وقت، غیر متعلق عبارت کو درمیان میں سے حذف کیا ہے تو علامت حذف (.....) نہیں لگائی گئی۔
- کسی کتاب سے اگر کسی دوسری کتاب کا اقتباس درج کیا ہے یعنی Indirect Refrence تو اس کا اعتراف متن میں کرنے کے بجائے، اسے صرف حوالہ جات میں درج کیا ہے۔ حالانکہ حوالے اور کتابیات میں اس کی نشاندہی غیر ضروری اور متن میں ضروری ہوتی ہے۔
- شعرا کا نمونہ کلام جانے کس ترتیب سے درج کیا ہے کہ اگر ایک غزل کے دو شعر لیے ہیں تو اس کے درمیان کا کوئی شعر پہلے اور مطلع قوراً بعد یا بہت بعد میں آیا ہے۔
- ہر باب کے آخر میں مندرج حوالہ جات کو ''حواشی'' کا عنوان دیا ہے جبکہ ان میں حاشیہ کوئی شاذ ہی آیا ہے۔
- صفحہ ۶۸۷ سے ۶۹۶، ۷۲۳ سے ۷۲۸ اور ۷۸۹ سے ۷۹۵ تک، صفحات کی ترتیب غلط ہو گئی ہے۔

پی۔ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات حوالے کی کتاب (Refrence Book) کا درجہ رکھتے ہیں یا ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ انہیں کتاب رہنما ہونا چاہیے۔ زیر نظر مقالہ ''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا'' اس ذیل میں نہیں آتا۔ اس میں کسی ایک بھی تحقیقی اصول کی پاسداری کا ہلکا سا مظاہرہ بھی نہیں کیا گیا۔ اس تحقیق کے ذریعے پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا ثابت کرنا تو دور از کار بات ہے، ہر غزل گو کے جملہ موضوعات اور رجحانات کا اجمالی تعارف بھی نہیں ہو پاتا۔

اظہار تشکر کے طور پر مصنف ''پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں:۔

''جناب مشفق خواجہ اور پروفیسر سید سعید احمد (کا شکریہ) جن کے کتب خانوں سے استفادہ کرنے کا اعزاز مجھے حاصل رہا.....''۔

ان بزرگ حضرات کے کتب خانوں سے استفادے کے ساتھ ساتھ اگر مصنف خود ان سے بھی استفادہ کر لیتے تو شاید مقالے کی کوئی بہتر شکل بن جاتی۔

''پاکستان میں اردو غزل کا ارتقا'' کے بارے میں مندرجہ بالا مشاہدات و معروضات کے باوجود ایک بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ بے شک مصنف کی صلاحیت و قابلیت نے یہاں اپنا اثر نہیں دکھایا لیکن اس کے مطالعے سے قاری کو مصنف کی نیک نیتی پر شبہ نہیں ہوتا۔ محنت، ریاضت اور جانکاہی جو تحقیق کا لازمہ ہے نہ سہی، حسن ترتیب یا خوش سلیقگی نہ سہی لیکن مصنف نے خوش نیتی کا مظاہرہ ضرور کیا ہے۔ سرقہ یا تواردوالی بات اس پر صادق نہیں آتی۔ حوالے ہر جگہ موجود ہیں۔ مقالہ جیسا بھی ہے اب اس کی ذمہ داری بہر حال مصنف پر آتی ہے۔ خود مقالہ نگار یا ان کا کوئی رہنما اگر موضوع کے انتخاب اور محدودات پر توجہ فرما لیتے اور اتنا وسیع موضوع منتخب نہ کرتے تو یقیناً مقالہ موجودہ صورت سے مختلف ہوتا۔

مختصر تبصرے

اقبال: مشرق و مغرب کی نظر میں

مبصر: محمد نعیم

ترجمہ نگاری ایسا عمل ہے جو قومی حیات میں سانس لینے کے عمل کو آسان بناتا ہے اس وسیلے سے جہاں ہم عالمی دانش و فکر سے آگاہ ہوتے ہیں تو وہاں فکر و نظر، اسالیب ہیت اور فن کے کئی نئے دریچے کھلتے جاتے ہیں۔ ترجمہ نگاری کا فن جہاں ہمیں نئے امکانات سے روشناس کراتا ہے تو وہاں یہ ہمیں آگہی کا درس بھی دیتا ہے کہ ہم دیگر اقوام کے مقابلے میں کہاں کھڑے ہیں اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ترجمہ نگاری قومی، تہذیبی اور فکری سطح پر باثمر ثابت ہوتی ہے۔

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی قیام پاکستان سے پہلے کی چند قدیم علمی و ادبی مجالس میں سے ایک ہے۔ پطرس بخاری، سید امتیاز علی تاج، مظفر علی سید، شاہد حمید، شہزاد احمد، محمد حنیف رامے، صدیق کلیم، ظہور الحق شیخ وغیرہ نے اس سوسائٹی کی فکری بنت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

گزشتہ چند برس سے سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی کا احیاء اس صورت میں کیا گیا ہے کہ ہر سال ایک وقیع منصوبے پر تراجم طلباء و طالبات سے کروا کر انہیں کتابی صورت میں لایا جاتا ہے۔

سوسائٹی نے سال اقبال (۲۰۰۲) کی مناسبت سے اپنی تازہ کتاب ''اقبال: مشرق و مغرب کی نظر میں'' شائع کی ہے۔ یہ کتاب ۵۰۰ صفحات پر محیط ہے اور بڑے سائز میں خوبصورت انداز میں شائع کی گئی ہے۔

کتاب میں علامہ اقبال کے فکر و فن اور شخصی حوالوں سے عربی، فارسی، جرمن، فرانسیسی، اطالوی، روسی، انگریزی زبانوں میں لکھے گئے اہم مقالات کا اردو ترجمہ اور بعض اہم اردو مقالات کا انگریزی ترجمہ شامل کیا گیا ہے۔ اسی اعتبار سے یہ کتاب دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔

مقالات کے تراجم کے علاوہ منظومات کے تراجم کا ایک بڑا حصہ کتاب میں نمایاں ہے۔ علامہ اقبال کی طویل نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کو تین زبانوں، فارسی، انگریزی اور پنجابی میں ڈھالا گیا ہے۔ علامہ اقبال پر لکھی جانے والی نظموں کے تراجم کا حصہ بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ ان میں عبدالوہاب عزام، ملک الشعرا بہار، سعید نفیسی، فاطمہ، اکبی اور اسلم انصاری کی نظموں کا اردو ترجمہ جبکہ فیض احمد فیض، حفیظ جالندھری، خورشید رضوی اور مسعود کی نظموں کا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔

اہم مقالات میں الیسنڈرو بوسانی (Alessendro Bausani)، ہرمن ہیسے (Hermann Hessey)، ژاں ماریک (Jan Marek) آنا ماری شمل (Annamari Schimmel) قابل ذکر ہیں۔ ان اقبال شناسوں نے گہرائی میں جا کر فکر اقبال تک رسائی حاصل کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس نوع کے موضوعات اردو زبان میں

بہت محدود ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

مقالات سے کچھ نئے انکشافات بھی سامنے آئے ہیں۔ مثال کے طور پر ہرمن ہیسے کے بارے میں زیادہ تر اردو دانوں کو معلوم نہ تھا کہ اس نے اقبال پر بھی کچھ لکھا ہے۔ اسی طرح فرانسیسی زبان کے تین مقالات پہلی بار ترجمہ کی صورت میں سامنے آئے ہیں۔ امید ہے یہ کتاب اقبال شناسی کی روایت میں بعض نئے مباحث کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

ان خوبیوں کے علاوہ بعض فروگزاشتوں کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی ضروری ہے۔ کہیں کہیں تراجم نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ کچھ فارسی اشعار کی پروف خوانی بھی تسلی بخش نہیں۔ امید ہے کتاب کے اگلے ایڈیشن میں اس کی تلافی ہو جائے گی۔

اٹکھیلیاں

مبصر: محمد ایوب

ذوالفقار علی احسن اورینٹل کالج جامعہ پنجاب کے مصنفین کی روایت سے تعلق رکھنے والے مزاح نگار ہیں۔ ان سے کچھ عرصہ پہلے اشفاق احمد ورک نے مزاح پر قلم اٹھایا اور بہت تھوڑے عرصے میں اپنی شناخت کروائی۔ ''اٹکھیلیاں'' ان کا پہلا مجموعہ مضامین ہے۔ اس سے قبل ان کی تحریریں مختلف رسائل و جرائد کی زینت بنتی رہی ہیں۔ اس کتاب میں سترہ مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کے اندر تنوع ہے اور انہوں نے اپنے موضوعات میں نہ صرف دیہات کی سادہ زندگی کو پیش کیا ہے بلکہ شہری زندگی اور اس کی مصروفیات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ قوت مشاہدہ ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی عام چیزوں کو بھی اس انداز سے پیش کرتی ہے کہ یہ معمولی چیزیں بھی ہمیں اپنی جانب نہ صرف متوجہ کرتی ہیں بلکہ چیزوں کو پرکھنے کا ایک نیا اور منفرد زاویہ نگاہ بھی دیتی ہیں۔

''اورینٹل نامہ'' ایک ایسا مضمون ہے جس میں اورینٹل کالج کی فضا اور ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ طلبا کی تعلیمی استعداد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کالج کے طالب علم اتنے غیرت مند ہیں کہ اگر استاد دوران لیکچر ''سوال'' کرنے کو کہیں تو کوئی بھی دست سوال دراز نہیں کرتا۔ ان میں پڑھائی کا شوق اتنا زیادہ ہے کہ ہر کوئی ایک دوسرے کو الٹی پٹی پڑھاتا رہتا ہے''۔

اسی مضمون میں آگے چل کر اکیسویں صدی کے حسینوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> ''خوبصورتی کے حوالے سے اکیسویں صدی کے دھوکہ بازوں کا کیا ذکر دور سے دیکھو تو دل میں اتر جاتے ہیں اور قریب سے دیکھو تو دل سے اتر جاتے ہیں''۔

''ہسپتال'' میں ہسپتالوں کی اندرونی فضا کو پیش کیا گیا ہے۔ مریضوں کی اقسام اور ڈاکٹروں کی حلیہ نگاری کو اس چابک دستی سے قلم بند کیا ہے کہ بے اختیار ڈاکٹروں پر ترس آنے لگتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مریض اس ہسپتال میں پہنچ کر ان منکر نکیر نما مسیحاؤں کو دیکھ کر کیوں مرنے سے گریز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کا حلیہ ملاحظہ کریں:

> ''سر کی آخری سرحدوں پر آثار زلف ہویدا ہوتے ہیں چنانچہ دور سے دیکھنے والے شخص کو فرنٹ ویو کا دھوکہ ہوتا ہے''۔

ڈاکٹروں کی عادات کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> ''ڈاکٹروں کی ایک اور عادت بھولنا بھی ہوتی ہے جیسے گھر سے گھبرائے ہوئے نکلتے وقت وہ بعض اوقات فرسٹ ایڈ بکس کے بجائے بیگم کا بیوٹی بکس ہی اٹھا لاتے ہیں''۔ نسخوں کی تجویز کے بارے میں ایک جملہ جسے حاصل مضمون قرار دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے:

> ''ایک قسم مذہبی ڈاکٹر حضرات کی بھی ہوتی ہے۔ ہر بے پردہ عورت کے لیے یہ ایک ہی نسخہ تجویز کرتے ہیں یعنی 'حیا' تین کی کمی''۔

''برات عاشقاں'' میں عاشقوں کی اقسام بیان کی گئی ہیں اور معشوقوں کا ذکر بھی کچھ ایسے انداز سے کیا گیا ہے کہ عاشق و معشوق لازم و ملزوم کے بجائے ظالم و مظلوم نظر آتے ہیں: ''ان معشوقوں کا بھی کیا کہنا کہ درجن بھر بچے پیدا کر کے بھی اپنے خاوند سے شکوہ کناں رہتی ہیں کہ ہمیں ابھی تک سچا پیار نہیں ملا۔ کچھ عاشق عاشقی کو قید شریعت میں لے آتے ہیں اور پھر عاشقی بعد میں اور ہی جلوے دکھا جاتی ہے۔ یعنی

عاشقی قید شریعت میں جب آ جاتی ہے
جلوۂ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

''شادی خانہ بربادی'' ہر ذی عقل آدمی کو ''قبول ہے'' کہنے سے قبل ضرور پڑھنا چاہیے۔ اس میں شادی کے داخلی و خارجی مسائل کو بہت انوکھے انداز سے پیش کیا گیا ہے:

> ''منگنی کے بعد اکثر خواب میں دو شیزائیں نظر آتی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ساس کا ''بھرپور'' چہرہ بھی نظر آتا ہے۔ ساس انسان کی بربادی کی ''اساس'' ہوا کرتی ہے''۔

وہ آگے لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک بزرگ فرما رہے تھے کہ شادی کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے حالانکہ اگر سوچا جائے تو شادی ہے ہی بچوں کا کھیل اور شاید یہ کھیل کھیلا ہی بچوں کے لیے جاتا ہے۔ حسین رفاقتوں کی غلطیاں جب سامنے آتی ہیں تو انسان کو خواہ مخواہ شرمندگی محسوس ہوتی ہے''۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ذوالفقار علی احسن اپنے موضوعات خود منتخب کرتا ہے اور اس کا اپنا زاویہ نگاہ ہے اور کسی دوسرے کی چھاپ اس کے فن پر نظر نہیں آتی۔ امید کی جا سکتی ہے کہ اگر انہوں نے اپنی ریاضت جاری رکھی تو ان کا شمار اچھے مزاح نگاروں میں ہوگا۔

پروف ریڈر کی غلطیوں سے اغماض برتتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتاب کی پیش کش خوبصورت ہے۔ ۹۹ روپے قیمت اور ۱۲۷ صفحات پر مشتمل کتاب کو پولیمر پبلی کیشنز نے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔

صوفی تبسم۔احوال و آثار

مبصر: صابر آفاقی

کشمیری نژاد شعرا میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا نام بہت نمایاں ہے۔ جناب تبسم اردو اور پنجابی کے شاعر تو تھے ہی فارسی میں بھی ان کا کلام فصیح و بلیغ ہے۔ ان کی تینوں زبانوں کی شاعری ''انجمن'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ صوفی تبسم اپنے عہد کے اہل قلم میں بہت معروف رہے ہیں۔ لاہور میں سالہا سال تک ان کا طوطی بولتا رہا ہے۔ انہوں نے بعض فارسی غزلوں کا پنجابی میں ترجمہ ایسی مہارت سے کیا ہے کہ اصل پر گمان ہوتا ہے۔ صوفی صاحب کی ایک خصوصیت و انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے بچوں کے بارے میں نظمیں لکھیں اور جو روایت مولوی اسماعیل میرٹھی اور اقبال نے شروع کی تھی اس کو کمال تک پہنچایا۔ صوفی صاحب واقعی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے جن کی خدمات کا اعتراف اور افکار کی تشہیر و تبلیغ کرنا ضروری تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ اس اہم فرض کو پورا کرنے اور قرض اتارنے کے لیے ڈاکٹر نثار احمد قریشی آگے آئے اور صوفی مرحوم کے احوال و آثار پر تحقیق کر کے ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دے دیا۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی صوفی تبسم کی طرح ہی تعلیم و تدریس سے وابستہ ہیں۔ آپ پاکستان اور مصر میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے ہیں اور آج بھی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو و اقبالیات ہیں۔

ڈاکٹر قریشی نہ صرف خود استاد اور محقق ہیں بلکہ ان کے حلقہ تحقیق میں درجنوں تشنگان علم و ادب زیر تربیت ہیں۔ آپ کی مشفقانہ سرپرستی اور عالمانہ رہنمائی میں نئی نسل تحقیق و تدقیق کے اسرار و رموز سیکھ کر ایک علمی شعور اور تحقیقی لگن سے آشنا ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ''صوفی تبسم۔احوال و آثار'' کے عنوان سے تیار کیا اور پنجاب یونیورسٹی سے ۱۹۸۶ء میں ڈگری لی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ اہم اور مستند مقالہ پاکستان کے اہل علم و تحقیق کے ہاتھوں میں اور تعلیمی اداروں کی لائبریریوں میں پہنچتا۔ سو یہ تاریخی کام ملک کی معروف علمی و سماجی شخصیت جناب آغا امیر حسین نے کر دکھایا ہے۔

آغا امیر حسین کا ماہنامہ سیپ تک آج تک درجنوں نمبر چھاپ چکا ہے جو شخصیات پر تھے اور موضوعات پر بھی۔

میں جناب نثار احمد قریشی کو صوفی تبسم جیسے عظیم شاعر پر وقیع مقالہ تحریر کرنے پر اور جناب آغا امیر حسین کو یہ مقالہ شائع کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ بقول شاعر

ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اپنا گریباں چاک

مبصر: ڈاکٹر انور محمود خالد

جسٹس (ریٹائرڈ) جاوید اقبال اپنی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' کے ''پیش لفظ'' میں لکھتے ہیں

''میرے والد علامہ محمد اقبال، ایک عظیم شاعر، فلسفی اور تصور پاکستان کے خالق سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے فرزند ہونے کی حیثیت سے زندگی کے مختلف ادوار میں میرا ردعمل مختلف رہا ہے۔ بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں منایا۔ کیونکہ مجھے علم ہی نہ تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ جوان ہوا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا، تو مجھے بہت برا لگا۔ یہ میری ''انا'' کی نشوونما میں مداخلت تھی۔ اب بوڑھا ہو چکا ہوں، تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے، میرے والد کے پرستاروں نے مجھے بڑا ہونے نہیں دیا۔ ہمیشہ چھوٹا سا بچہ ہی سمجھا گیا۔ یعنی تن آور درخت کے سائے تلے ایک ننھا سا پودہ پروان چڑھتا ہے۔ وہ دراز قد ہو جائے، اپنی صورت نکال لے، تب بھی پودہ ہی رہتا ہے اور بڑے درخت کے حوالے ہی سے پہچانا جاتا ہے۔

بہرحال میں نے کن حیلوں سے ایک بہت بڑے درخت کے سائے سے نکل کر اپنا مقام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تگ و دو کے اس عالم میں کیا میں اس سائے سے نکل کر اپنا سایہ بنا سکا؟ میں کس حد تک کامیاب ہوا اور کس حد تک ناکام؟ فقط یہی میری داستانِ حیات ہے''۔

اپنی خودنوشت سوانح حیات پر، ڈاکٹر جاوید اقبال کے یہ تعارفی جملے ''اپنا گریباں چاک'' پر بہترین تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرزند اقبال۔۔۔ جاوید اقبال کا نفسیاتی المیہ یہ ہے کہ انہوں نے قدم قدم پر اپنا موازنہ اپنے والد گرامی سے کیا ہے اور ہر جگہ خود کو ان کے مقابلے میں چھوٹا محسوس کیا ہے حالانکہ جس طرح کسی باپ کے لیے یہ حقیقت باعث شرم نہیں ہوتی کہ اس کا بیٹا زندگی کی دوڑ میں اس سے آگے نکل گیا ہے، اسی طرح کسی بیٹے کو بھی یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ اس کا باپ علمی و ادبی دنیا میں اتنا بلند مقام ہے کہ وہ چاہے بھی تو ان بلندیوں کو نہیں چھو سکتا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے دنیاوی اعتبار سے وہ سب کچھ بڑی آسانی سے حاصل کیا ہے جو ان کے نامور والد نے قدرے طویل جدوجہد کے نتیجہ میں اور نامساعد حالات کے باوجود حاصل کیا اور وہ کچھ بھی جو ان کے فقیر منش والد گرامی، خواہش و حسرت کے باوجود حاصل نہیں کر سکے۔ باپ ہی کی طرح جاوید اقبال نے فلسفہ میں ایم۔اے کیا۔ بار ایٹ لا کیا۔ پی۔ایچ ڈی کی۔ پروفیسر بنے۔ وکیل بنے۔ کتابیں لکھیں۔ مقالے لکھے۔ سیاست میں حصہ لیا۔ قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور اپنے علمی خطبات کے ذریعے سے اپنی قابلیت کا سکہ بٹھایا۔ شہرت کمائی، عزت کمائی، دولت کمائی اور رزق حلال کے ذریعے سے قابل اطمینان، آبرومندانہ، آسودہ زندگی گزاری۔ بلکہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے دنیاوی ترقی میں باپ سے کئی قدم آگے بھی بڑھائے کیونکہ علامہ اقبال نہ جج بن سکے تھے اور نہ چیف جسٹس، لیکن ڈاکٹر جاوید اقبال پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدۂ جلیلہ پر بھی فائز ہوئے اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے واجب الاحترام جج بھی بنے۔ سرخاب کے یہ دو پر واقعی بیٹے کی ٹوپی میں زاید ہیں جب کہ باپ کا طرہ دستار ان سے محروم رہا۔ جاوید اقبال چاہیں تو اس امتیاز پر فخر کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں (صرف یہاں) ان کا سایہ، باپ کے سائے سے آگے نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ موازنہ پدر و پسر درست ہے؟۔۔۔ غالباً نہیں۔۔۔ کیونکہ علامہ اقبال، اس لیے علامہ اقبال نہیں بنے کہ وہ ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی اور بار ایٹ لا تھے یا اس وجہ سے کہ وہ ایک قابل وکیل تھے۔ یا اس وجہ سے کہ وہ ملکی سیاست میں حصہ لے کر مصور پاکستان بنے۔ علامہ اقبال کو امت مسلمہ نے اس شہرہ آفاق شاعری کی وجہ سے سر آنکھوں پر بٹھایا جو حیات و کائنات کے اسرار کی نقاب کشائی کرتی ہے اور جس نے ایک نازک موڑ پر ہندی مسلمانوں کی کشتی کو بے یقینی کے گرداب سے نکال کر ساحل مراد سے ہمکنار کیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب کے ''پیش لفظ'' میں علامہ اقبال کے ایک خط کا اقتباس بھی درج کیا ہے جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ان کی زندگی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں جو دوسروں کے لیے سبق آموز ہو سکے۔ البتہ خیالات کے تدریجی انقلاب کے بارے میں وہ اپنے دل و دماغ کی سرگزشت خود قلم بند کرنا چاہتے تھے جس کی انہیں فرصت نہ ملی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ انہیں عمر کے اس حصے میں اپنی گزشتہ زندگی پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی فرصت حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں، حسرتوں اور تمناؤں، کردہ اور ناکردہ لغزشوں کا پورا ریکارڈ، اپنے زمانے کے سامنے رکھ دیا ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے مصنف نے اپنی سرگزشت حیات سناتے وقت کہیں بھی لاف زنی، دروغ گوئی، خبط عظمت کی نمایش اور اخفا سے کام نہیں لیا۔ ہمارے راہرو راہ محبت (جاوید اقبال) کے راستے میں بھی دو چار نہیں، کئی سخت مقامات آئے لیکن ان پر آفرین ہے کہ اظہار صداقت میں ان کے قدم کہیں نہیں لڑکھڑائے اور وہ ایک باوقار، صاف گو اور مضبوط اعصاب کے مالک انسان کی طرح ان مراحل کو مردانہ وار طے کر گئے۔

کتاب کے سب سے اہم مقامات وہ ہیں جہاں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے خاندانی حالات بیان کیے ہیں۔ یہاں انہیں یہ بتاتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ ان کے ددھیال اور ننھیال، دونوں کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنی والدہ اور اپنے والد کی جو لفظی تصویریں کھینچی ہیں، وہ سچی اور حقیقی ہونے کی وجہ سے بڑی دلکش ہیں، حالانکہ جب ان کی والدہ نے وفات پائی تو ان (جاوید اقبال) کی عمر گیارہ برس تھی اور جب ان کے والد فوت ہوئے تو وہ چودہ برس کے کم سن نوجوان تھے۔ یوں انہیں عالم ہوش و حواس میں اپنی والدہ کے ساتھ صرف چھ سال اور والد کے ساتھ صرف نو سال گزارنے کا موقع ملا۔۔۔ لیکن جاوید اقبال کے حافظے کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہیں کم سنی اور طفلانہ لاپروائی کے باوجود اس زمانے کی زندگی کی تمام جزئیات یاد ہیں اور وہ انہوں نے مزے لے لے کر سنائی ہیں۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے گارڈین چوہدری محمد حسین اور اپنی اتالیقہ (گورنس) مسز ڈورس احمد کا ذکر بھی بڑی عقیدت، احترام اور محبت سے کیا ہے۔ دونوں نے علامہ اقبال کی وفات کے بعد نوجوان جاوید اقبال اور ان کی کم سن بہن منیرہ کی پرورش، نگہداشت، تعلیم اور شادی وغیرہ کے مراحل طے کرنے میں، جس شفقت، خلوص اور احساس ذمے داری کا ثبوت دیا اور جس طرح ان کے مالی معاملات کی دیانت دارانہ حفاظت کی اور دونوں بہن بھائیوں کو زندگی میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے میں قدم قدم پر سہارا دیا، اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال نے بے مثال صاف گوئی، احسان شناسی، شرافت اور انسان دوستی کا مظاہرہ کیا ہے۔

''اپنا گریباں چاک'' اس اعتبار سے بھی دور حاضر کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ایک اعلیٰ مقام کی حامل قرار پائے گی کہ یہ ایک بڑے باپ کے نامور بیٹے کے دل و دماغ کی انتہائی دلچسپ سرگزشت ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی ۷۷ سالہ بظاہر کامیاب زندگی کے ان تمام گوشوں کو منور کیا ہے جن کا تعلق عدالت، سیاست اور ادب سے تھا اور جن میں ان کی عطا، کہیں کم ہے اور کہیں زیادہ لیکن غیر اہم کوئی بھی نہیں۔ پہلے ''زندہ رود'' کے نام سے انہوں نے اپنے والد، علامہ اقبال کی ضخیم سوانح عمری لکھی تھی اور وہ اپنے موضوع پر اہم کتاب تھی۔ اب ''اپنا گریباں چاک'' کے عنوان سے انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات لکھی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ''اپنا گریباں چاک'' نہ لکھی جاتی تو ہم ڈاکٹر جاوید اقبال کی شخصیت و کردار کے کئی دلآویز پہلوؤں سے بے خبر رہتے۔

آبدوز: (غزلیں)

مبصر: عرفان احمد خان

''آبدوز'' بظاہر تو جنگ سے متعلق نام ہے، شاعری سے اس کا تعلق کیسے جڑ گیا؟ اس کا جواب ہمیں افتخار نسیم کی کتاب پڑھ لینے کے بعد بین السطور ملتا ہے۔ آبدوز علامت ہے خاموشی سے حفاظتی تدابیر اختیار کرنے کی۔ یہ آبدوز نثری اور بے معنی شاعری کے خلاف جہاد کے لیے نکلی نظر آتی ہے۔ دوسری بات اس کتاب کا غزلیہ مجموعہ ہونا ہے، وہ بھی ۱۹۲ صفحات کی ضخامت کا۔ اکثر شعری مجموعوں میں عمدہ غزلیں خال خال ملتی ہیں۔ صفحات بھرنے کا کام عموماً ایک شعر، آدھا شعر، نومولود شعر، ست ماہیہ شعر جیسی فضولیات سے کیا جاتا ہے۔ کتاب بمشکل سو صفحات پھلانگتی ہے کہ شاعر صاحب نڈھال ہو جاتے ہیں۔ جبکہ افتخار نسیم کی شاعری میں وہ تازگی برقرار ہے جو کتاب کے پہلے صفحے سے آخری صفحے تک قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے۔ ۱۰۸ غزلوں پر مشتمل اس مجموعے کا ابتدائیہ جواز جعفری نے تحریر کیا ہے۔ بقول ان کے: ''میں نے کتاب کا مسودہ جیسے ہی کھولا، پہلی غزل کے مطلع پر نظر پڑتے ہی میری آنکھیں خوشگوار حیرت سے پھیل گئیں کیونکہ میرے سامنے وہی خوبصورت شعر تھا جس کے خالق کو میں پچھلے دس بارہ سالوں سے تلاش کر رہا تھا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

اس قدر بھی تو نہ جذبات پہ قابو رکھو
تھک گئے ہو تو مرے کاندھے پہ بازو رکھو

اب ہم کتاب کے عنوان یعنی ''آبدوز'' کے حوالے سے ایک خوبصورت شعر دیکھتے ہیں:

کٹی ہے عمر کسی آبدوز کشتی میں
سفر تمام ہوا اور کچھ نہیں دیکھا

بعض لوگوں کی زندگی بھی اسی شعر کی تفسیر ہوا کرتی ہے۔ زندگی کو کلائمکس تک پہنچتا دیکھ کر جب وہ اپنی تمام عمر کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے لبوں پر بے ساختہ مذکورہ شعر مچل جاتا ہے۔ بامقصد زندگی گزارنے کے لیے کسی مشن یا بلند نصب العین کا ہونا از حد ضروری ہے۔ زندگی کے بعض مشن ایسے ہوتے ہیں جن میں ناکام رہ کر بھی انسان ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے والوں سے کہیں آگے رہتا ہے اور لوگ اس کے جذبے کو سراہتے ہوئے آنے والے وقتوں میں اس کے مشن کی تکمیل کرتے ہیں۔ سائنسی میدان میں بہت سے سائنسدانوں کی مثالیں اس ضمن میں موجود ہیں، جن کے مشن کی تکمیل کسی دوسرے کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اگر سائنسدان بے لوث خدمت کے جذبے کے تحت اپنی ایجادات عوام کے لیے عام نہ کرتے اور شاہی حکیموں، گویوں کی طرح اپنے نسخے اور راگ اپنے ساتھ ہی لے کر مر جاتے تو آج انسان کی زندگی اس قدر آسان نہ ہوتی۔ ہر آدمی کو دوبارہ زیرو سے کام شروع کرنا پڑتا۔ آج کے مشینی دور میں ایسی حساس شاعری کرنا ہر شاعر کے بس کا کام نہیں:

طاق پر جزدان میں لپٹی دعائیں رہ گئیں — چل دیے بیٹے سفر پر گھر میں مائیں رہ گئیں
پیٹ کی بھوک تو قسمت نے مٹا دی لیکن — کتنا ترسا کے دیا ایک نوالا اس نے

وطن کی یاد میں لپٹا ہوا یہ شعر ملاحظہ ہو:

ایک خوشبو سی اڑے شبنم سے بھیگے جسم سے
باغ میں پیلا بھی ہو اور رات کی رانی بھی ہو

غزل کے درج ذیل اشعار نئے خیالات کا افق قاری پر عیاں کرتے ہیں:

اک نئے دور کی بنیاد کو رکھا جائے　　دور ماں باپ سے اولاد کو رکھا جائے
یا تو پہنے وہ انہیں، جیسے ہیں میرے کپڑے　　یا برہنہ مرے ہم زاد کو رکھا جائے
میں کون ہوں یہ اسے یاد ہی نہیں رہتا　　وہ میرے سامنے میری مثال دیتا ہے

اچھی شاعری کا قحط ضرور ہے لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی یہ چراغ جلائے رکھتا ہے۔ مشرق میں بیٹھ کر مغربی شاعری یا تنقید کی نقالی کرنے والے افتخار نسیم کی مثال کو سامنے رکھیں جس کے پیش نظر نا صرف امریکی بلکہ پورے یورپ کا لٹریچر ہے لیکن پھر بھی اس کی تخلیقات میں مشرق اور مغرب شانہ بہ شانہ، پہلو بہ پہلو توازن کے ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔

افتخار نسیم کی یہ تخلیقی کوشش نثری شاعری کے جوہڑ میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے بہت سے شاعروں کو کسی چشمے کی راہ دکھائے گی۔ ان شاعروں کو بھی اس کتاب سے انسپائریشن ملے گی جو تخلیقی امکانات سے مایوس ہو کر، اپنی طرف سے شاعری کے قتل پڑھ چکے ہیں۔ ''آبدوز'' کا ٹائٹل پاکستان میں طبع ہونے والی شاعری کی کتابوں سے میل نہیں کھاتا اور خاصا روایت شکن ہے۔ کتاب کی قیمت 150 روپے ہے اور اسے لاہور سے ٹی اینڈ ٹی پبلشرز نے شائع کیا ہے۔

خاندان لوہارو

مبصر: ڈاکٹر وحید قریشی

طاہرہ بانو حجاب نواب سر امیر الدین احمد خاں آف لوہارو کی دختر ہیں۔ انہوں نے اپنے خاندان کے بارے میں یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں خاندان لوہارو کے حالات اور دوسرے میں اس خاندان کے اہل قلم کے تراجم اور نمونہ کلام دیا ہے۔ پہلے حصے کا مواد عصر حاضر کی بعض مستند کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس لیے قاری کے لیے دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی۔ اس حصے میں ایک چیز کھٹکتی ہے اگر خاندان کا شجرہ بھی دے دیا جاتا تو مختلف افراد کے رشتے آسانی سے سمجھ میں آ جاتے۔ اس سیکشن میں کوئی نیا مواد تو نہیں البتہ بعض نادر و نایاب تصاویر اہم ہیں۔ دوسرا حصہ البتہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جس میں لوہارو خاندان کے دامادوں اور اولاد و بنات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ خاندان لوہارو کی ہی ایک فرد محترمہ حمیدہ سلطان احمد نے اس سے پہلے ''لوہارو کے شعرا'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی اس کتاب میں اس سے بھی استفادہ کیا گیا ہے لیکن اضافہ یہ ہے کہ نثر نگار بھی شامل ہیں اور بعض شعرا کے سلسلے میں کچھ نئی معلومات بھی شریک اشاعت ہیں۔ اس اعتبار سے یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔

کتاب میں تین معمولی اضافے ممکن ہیں۔ 'یادگار بابا' کے نام سے اس خاندان کے ایک فرد کے مفصل حالات اور اس کا کلام نظم و نثر فیروز پور سے شائع ہوا تھا۔ اسی طرح سید ہاشمی فرید آبادی اس خاندان کے اہم شاعر تھے اور چھوٹی تقطیع پر ان کا مجموعہ کلام بھی شائع ہو چکا ہے۔ جدید شعرا میں انہیں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کے حالات تو درج کتاب ہیں، اگر کلام کا نمونہ بھی شامل کر لیا جاتا تو اچھا تھا۔ اسی طرح نواب اعتزاز الدین ہمایوں نے ایک کتاب مغل شہزادی نور جہاں پر شائع کی تھی اس کا حوالہ بھی اگر شریک اشاعت ہو جائے تو اگلے ایڈیشن میں قارئین کو یہ اطلاعات بھی میسر آ سکتی ہیں۔

کتاب مجموعی طور پر ایک اچھی پیشکش ہے جس کا اسلوب سادہ لیکن زبان کے اعتبار سے اہم ہے۔ یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ جمیل الدین عالی ہی اچھے نثر نگار نہیں ان کی ہمشیرہ نوابزادی طاہرہ بانو بھی اگر لکھتی رہیں تو بہت سے لکھنے والوں کو پیچھے چھوڑ جائیں گی۔

۱۴۲ صفحات پر مشتمل فیروز سنز (لمیٹڈ) راولپنڈی کی شائع کردہ اس کتاب کی قیمت -/۲۵۰ روپے ہے۔

'مشعل' لاہور کی دو کتابوں کا جائزہ

محمد ہارون عثمانی

'مشعل' جو ۱۹۸۸ء میں رجسٹرڈ سوسائٹی کے طور پر معرض وجود میں آیا، ایک غیر سرکاری تنظیم ہے۔ اسے پاکستان میں ایک امریکن بین الاقوامی ادارہ برائے کتب 'اوبز' کے تحت قائم کیا گیا۔ 'مشعل' ایک رضا کارانہ انتظامی کمیٹی پر مشتمل ہے۔ جو اس کی تنظیم اور لاہور میں ترجمے کے عمل کی نگرانی کرنے والے دفتر کو چلاتی ہے۔ انتظامی کمیٹی کے صدر نشین پرویز ہود بھائی، نائب صدر شریف المجاہد اور خازن درثین احمد ہیں۔ اراکین میں پرویز قریشی، راشد علی خاں، خالد احمد اور قاسم جعفری کے اسما شامل ہیں جبکہ فضہ توفیق، منیجر اور مسعود اشعر، ایڈیٹر کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔

'مشعل' ایک غیر تجارتی اور غیر نفع مند ادارہ ہے جو معاشرتی، معاشی اور ثقافتی امور اور عہد حاضر سے متعلق ترقیاتی موضوع پر اردو میں کتابیں شائع کرتا ہے۔ جدید فکری رجحانات، انسانی حقوق، ترقی میں خواتین کے کردار، منشیات اور قومی و عالمی تخلیقی ادب اس کی خصوصی توجہ کا مرکز ہیں۔ مشعل کی مطبوعات میں زیادہ تر اجم شامل ہیں۔ یوں تو 'مشعل' کی مطبوعات کی تعداد سو سے زائد ہے لیکن اس وقت ہمارے پیش نظر معروف مسلم سکالر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی درج ذیل دو کتابیں ہیں جن کا تعارف و تذکرہ مقصود ہے۔

۱۔ فضل الرحمٰن۔ اسلام اور جدیدیت / مترجمہ محمد کاظم، لاہور: مشعل، ۱۹۹۸ء، ص.....، قیمت -/210 روپے
۲۔ فضل الرحمٰن۔ قرآن کے بنیادی موضوعات / مترجمہ محمد کاظم، لاہور: مشعل، ۲۰۰۱ء، ص ۲۳۸، قیمت -/200 روپے

(۱)

ڈاکٹر فضل الرحمٰن (۱۹۱۹۔۱۹۸۸) کا شمار بین الاقوامی سطح کے مسلم سکالرز میں ہوتا ہے۔ وہ امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی میں ۱۹ برس تک اسلامی فکر کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس سے قبل کچھ عرصہ وہ اسلام آباد کے مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر کے فرائض بھی سرانجام دے چکے تھے لیکن اسلام کے بارے میں اپنے بعض نظریات کی وجہ سے علما کی تنقید کا نشانہ بنے اور ملک چھوڑ کر چلے گئے۔ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ان میں سے درج ذیل تین مقابلتاً زیادہ اہم ہیں۔

۱۔ Islam
۲۔ Major Themes of Quran

۳۔ Islam & Modernity

زیر تبصرہ کتاب 'اسلام اور جدیدیت' ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی انگریزی کتاب "Islam & Modernity" (1982) کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم محمد کاظم ہیں۔ یہ کتاب شکاگو یونیورسٹی کے ایک تحقیقی منصوبے کے ضمن میں لکھی گئی تھی جس میں فاضل مصنف نے قرون وسطیٰ میں موجود اسلامی نظام تعلیم کا جائزہ پیش کرتے ہوئے پچھلی ایک ڈیڑھ صدی کے دوران میں اس کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے مسلم ممالک میں ہونے والی کوششوں اور ان کے نتائج پر روشنی ڈالی ہے اور مستقبل میں اس میں بہتری کے لیے چند تجاویز بھی پیش کی ہیں۔

مصنف کے تمہیدی نوٹ، تعارف اور مترجم کے پیش لفظ کے علاوہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب 'ورثہ' میں مصنف نے عہد نبوی سے متصل زمانے میں قرآن کی بنیادی تعلیمات، ان کی تفسیر کے صحیح طریقے اور ان سے قوانین اخذ کرنے کے مسائل پر کھل کر بات کی ہے۔ انہوں نے اسلام میں مختلف علوم کے شعبوں کے معرض وجود میں آنے، ان میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافوں اور تبدیلیوں، مدرسے کے آغاز اور قرون وسطیٰ میں اسلامی تعلیم کی تفاصیل دیتے ہوئے یہ بتایا کہ مدارس کی تنظیم کے بعد ان میں پڑھائے جانے والے علوم میں امتیازات قائم ہو گئے اور یوں علوم شرعی (نقلی) اور غیر شرعی (عقلی) حصوں میں تقسیم ہو گئے جس کی وجہ سے اسلامی نظام تعلیم میں فلسفہ اور سائنس کی تدریس بری طرح متاثر ہوئی۔ دوسری طرف مضامین کی شرحوں اور شرحوں کی شرحیں پڑھانے سے اسلامی تعلیم کا سارا سلسلہ بے حد گنجلک ہو گیا۔ یہ باب کیونکہ ایک طویل عرصے کو محیط ہے اس لیے مصنف اسلامی نظام تعلیم کے سلسلے میں تمام مواد مہیا نہیں کر سکے جس کا اعتراف خود انہوں نے بھی کیا ہے۔

دوسرا باب 'کلاسیکی اسلامی تجدید پسندی' کے حوالے سے ہے۔ جس کا آغاز انیسویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں مسلم ممالک مغرب کے سیاسی اثر کے نیچے آ گئے تھے۔ یوں مغربی نظام تعلیم کے رواج نے ان ملکوں میں رفتہ رفتہ تعلیم کے دو علیحدہ اور متوازی نظام قائم کر دیے۔ انگریزی تعلیم اور روایتی مدارس کی تعلیم کے نظام۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر ہمدردانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے ترکی، مصر، ایران، برصغیر اور انڈونیشیا میں اسلامی تعلیم کے احوال کا جائزہ لیا ہے اور ان بڑی عملی تبدیلیوں کا خاکہ پیش کیا ہے جو بیسویں صدی کے وسط سے پہلے اس میدان میں واقع ہوئیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں منظر پر نمودار ہونے والے پانچ نمایاں مسلم تجدید پسندوں سرسید، امیر علی، جمال الدین افغانی، ترکی کے نامق کمال اور مصر کے محمد عبدہ کی اصلاحی کوششوں کا علمی انداز میں تجزیہ بھی کیا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب 'معاصر تجدید پسندی' سے متعلق ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے بعد کے زمانے کا احاطہ کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بیشتر مسلم ممالک استعماری غلبے سے آزاد ہو چکے تھے لیکن قومی اور ملکی امور میں خود مختار ہونے کے باوجود عملاً تعلیم کے شعبے میں کوئی قابل ذکر اصلاح نہ کر سکے، مصنف نے اس کی دو وجوہات بیان کی ہیں۔

۱۔ ان ملکوں نے ایک غلامانہ اور بے تکے طریقے سے نوآبادیاتی تعلیمی نظام کو بغیر کسی تبدیلی کے جاری رکھا۔

۲۔ ان میں ترقی کے جو بھی چار یا پانچ سالہ منصوبے بنائے گئے ان میں صرف مادی ترقی کو اہمیت دی گئی اور تعلیم کی ترقی اور تجدید کے لیے کوئی وسائل نہ رکھے گئے۔

آخری باب 'امکانات اور کچھ تجاویز' میں مصنف نے پھر اپنی بات دہرائی ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو مختلف نظام (روایتی اور جدید) رائج ہیں ان کو یکجا کیا جائے۔ مصنف کے خیال میں اس میں دو رکاوٹیں حائل ہیں۔

۱۔ ایک تو وہ نو بنیاد پرست جو ہر اس چیز کے خلاف ہیں جس کا تعلق مغرب سے ہو۔

۲۔ تعلیم کے قدیم اور جدید نظاموں کے ادغام میں معاون تعلیم یافتہ لوگوں اور دانشور اساتذہ کی کمی۔

یہ باب کافی بھرپور اور جامع ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان امور کی طرف حکومتی سطح پر توجہ کی جائے اور اسلامی نظام تعلیم کے روایتی ڈھانچے کو جدید تعلیمی تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔

ڈاکٹر فضل الرحمٰن اپنے عالمانہ، تحقیقی اور فلسفیانہ طرز تحریر کے سبب بعض جگہوں پر سلاست اور روانی میں ناکام رہے ہیں۔ جملہ معترضہ کا استعمال بھی جا بجا کیا گیا ہے لیکن موضوع کے اعتبار سے کتاب ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتی ہے اور اس سلسلے میں مترجم کا کردار بنیادی اور قابل تعریف ہے۔

(۲)

'قرآن کے بنیادی موضوعات' ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی ایک اور اہم کتاب Major Themes of the Quran ہے جو ۱۹۷۹ء میں شکاگو یونیورسٹی سے شائع ہوئی، یہ اس کا اردو ترجمہ ہے۔ اسے محمد کاظم نے نہایت مہارت سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

قرآن کے بارے میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ اس کتاب کو ہمیشہ جزوی طور پر پڑھا اور سمجھا گیا، کسی نے اسے بطور اکائی پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں خدا، انسان، معاشرے اور یوم آخرت وغیرہ کے بارے میں قرآن کا مجموعی نقطہ نظر سامنے نہ آ سکا۔ اسی بنیادی نظریے کو پیش نظر رکھ کر مصنف نے یہ کتاب تحریر کی ہے۔

مترجم کے پیش لفظ اور مصنف کے تعارف کے علاوہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ دو ضمیمے اس کے علاوہ ہیں۔ تعارف میں مصنف نے مقصد تصنیف بیان کرتے ہوئے قرآن کے موضوع پر جدید مغربی تحریروں کا احاطہ کیا ہے۔

پہلے باب کا موضوع 'خدا' ہے جس میں مصنف نے اختصار کے ساتھ ان سوالوں پر بحث کی ہے کہ خدا کی اور صرف ایک خدا کی ضرورت کیوں ہے؟ اور قرآن کے نقطہ نظر سے ان سوالات کا منشا کیا ہے؟ مصنف کے مطابق قرآن خدا کے وجود کا ثبوت نہیں ہے بلکہ یہ کائنات میں موجود نظم اور حکمت کا مشاہدہ کرا کے 'خدا کے وجود' کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

دوسرا اور تیسرا باب 'انسان' کے موضوع سے متعلق ہے۔ جن میں قرآن کی روشنی میں انسان کو بطور ایک فرد اور بطور معاشرے کا رکن زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے قرآن کے جن موضوعات پر علیحدہ علیحدہ ابواب میں بات کی ہے ان میں نیچر، رسالت اور وحی، معادیات، شیطان اور شر، مسلم امت کا ظہور، مکہ میں مسلم امت کی مذہبی صورت حال، اہل کتاب اور مذاہب کا تنوع شامل ہیں۔ ان کی بعض آرا سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن انہوں نے کوشش کی ہے کہ اپنے ہر خیال کے لیے مکمل جواز مہیا کریں۔ یہ کتاب ان مستشرقین کے جواب میں بھی پیش کی جا سکتی ہے جو اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مطالعے میں اپنی عمریں بتا کر بھی قرآن کا صحیح فہم پیدا نہیں کر پاتے اور دنیا میں غلط فہمیوں کی اشاعت کرتے ہیں۔

سودیشی ریل

شوکت تھانوی

دن بھر کے تھکے ماندے بھی اور رات کو سفر بھی درپیش تھا۔ مگر ''بندے ماترم'' کے نعروں پر کان کھڑے کر لینا ہماری ہمیشہ کی عادت ہے اور ان نعروں کی بھی ضد ہے کہ ہمارا چاہے جو حال بھی ہو، بیمار ہوں، کسی ضروری کام سے باہر جا رہے ہوں اور کوئی مجبوری ہو مگر یہ کچھ نہیں دیکھتے اور اپنی طرف ہم کو کشاں کشاں کھینچ کر چھوڑتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی یہی ہوا کہ حقہ کا نیچا اور صراحیاں ایک دکان پر یہ کہہ کر رکھ دیں کہ بھائی ابھی آتے ہیں اور سیدھے پنڈال میں گھس گئے جہاں ایک صاحب جو صورت سے لیڈر معلوم ہوتے تھے یعنی سر پر گاڑھے کی گاندھی کیپ داڑھی مونچھ سے فارغ البال، ایک لمبا سا کھدر کا کرتہ، ٹانگوں میں وہی کھدر کی دھوتی اور چپل پہنے تھے، ایک ہاتھ کو اپنی پشت پر رکھے ہوئے اور دوسرے ہاتھ کو مجمع کی طرف اٹھائے ہوئے اس طرح حرکت دے رہے تھے جیسے بینڈ ماسٹر اپنے بید کو حرکت دیتا ہے۔ وہ کچھ کہہ بھی رہے تھے مگر معلوم نہیں کیا، اس لیے کہ کبھی تو کہتے کہتے مشرق کی طرف گھوم جاتے تھے کبھی مغرب کی طرف اور کبھی کبھی ایک دم سے پیچھے بھی مڑ جاتے تھے۔ بہرحال یہ فیصلہ کرنا کہ ہم ان کی پشت کی طرف ہیں یا سامنے کی طرف کبھی کسی کی طرف منہ کبھی کسی کی طرف پشت ہو جانے کا سلسلہ جاری تھا اور اسی طرح ان کے الفاظ کبھی نہایت صاف کبھی دور کی آواز کی طرح بالکل نہیں، ہمارے کانوں میں پہنچ رہے تھے۔ ہاں ایک بات یہ تھی کہ ہماری طرف کے لوگ غل مچانے میں اتر دکھن اور پچھم کے لوگوں سے زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے ہم تقریر سننے کے معاملے میں ذرا گھاٹے میں تھے پھر بھی جو کچھ سنا وہ بہت کافی تھا۔ اس لیے کہ شروع سے آخر تک الفاظ بدل بدل کر کبھی انگریزی میں کبھی اردو میں کبھی نثر میں کبھی نظم میں، کبھی ہنس کر، کبھی چیخ کر کبھی ادھر مڑ کر کبھی ادھر گھوم کر وہی الفاظ کہے جا رہے تھے جو ہم نے سن لیے تھے۔

''بھائیو! اب وہ وقت نہیں ہے کہ ریزولیوشن پاس ہوں اور رہ جائیں ..... تجاویز منظور ہوں اور شرمندۂ عمل نہ بنیں ..... سرگرمیاں ..... اب تیار ہو جاؤ ..... ہوشیار رہو ..... کہ تم کو ..... ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد اپنا کام اپنے ہاتھوں سے انجام دینا ہے اپنے ..... اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے ..... (دوسری طرف گھوم گئے) خواب غفلت سے بیداری کا وقت ..... یہ ہے ..... اور وہاں تم ..... برٹش گورنمنٹ سوراج سودیشی ..... چرخہ ..... کھدر ..... ''(چیئرز کے بعد تقریر ختم)

دو گھنٹے ہم نے صرف یہی سنا اور سمجھ لیا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کے بعد سوراج ضرور مل جائے گا۔ غالباً اس سے زیادہ انہوں نے کچھ کہا بھی نہیں ہوگا اور اگر کہا بھی تو ہم کیا کریں ہمارے لیے یہی بہت تھا کہ ۳۱ دسمبر کو سوراج ملے گا۔ ہم اسی خیال میں غرق مجمع کو دھکیلتے خود دھکے کھاتے کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے۔ دکان پر سے حقہ کا نیچا لیا صراحیاں اکے پر لادیں اور گھر پہنچ گئے۔ اسباب باندھا، کھانا کھایا، حقہ بھرا، آرام کرسی پر لیٹ کر شوق فرمانے لگے۔ گاڑی کے وقت میں ابھی پورے دو گھنٹے تھے اس لیے اطمینان بھی نصیب تھا مگر احتیاط شیروانی نہیں اتاری تھی کہ جیسے ہی ڈیڑھ گھنٹہ باقی رہ جائے گا اسٹیشن روانہ ہو جائیں گے۔

لیکچر کا خیال اور ۳۱ دسمبر کے بعد سوراج کا مل جانا دماغ میں چکر لگا رہا تھا مگر ہماری سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہیں آتی تھی کہ آخر سوراج کے لیے ۳۱ دسمبر کیوں مقرر کی گئی ہے۔ اگر آج ۳۱ دسمبر ہوتی تو ہم اپنی ریل پر سفر کرتے، نہ بدیشی گارڈ، نہ فارن ڈرائیور، نہ اینگلو انڈین کا علیحدہ درجہ ہوتا۔ ہم خود ہی ریل کے مالک ہوتے۔ چاہے تھرڈ میں بیٹھتے چاہے فرسٹ میں۔ ہم سے کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا ہم خود فرسٹ میں بیٹھتے اور انگریزوں کو تھرڈ میں بٹھا کر خوش ہوتے ہوئے سفر کرتے۔ ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ایک دم سے کان میں پھر وہی ''بندے ماترم'' کی آواز آئی اور ہم ایک دم سے کھڑے ہو گئے۔ گھر سے باہر نکلے دیکھتے کیا ہیں کہ ایک بڑا جلوس جھنڈوں جھنڈیوں اور گیسوں سے سجا ہوا 'بندے ماترم' کے نعروں سے آسمان اور زمین کو لرزاتا ہوا ہمارے مکان کے سامنے سے گزر رہا ہے۔ ہم نے لوگوں سے پوچھا کہ ''بھائی یہ کیا ہے'' جواب ملا کہ ''کیا سور ہے تھے؟ خبر نہیں کہ سوراج مل گیا؟'' ہم نے پھر بڑا سا منہ کھول کر کہا ''سوراج؟'' جواب ملا ''ہاں سوراج، سوراج'' ہم نے اپنے دل میں کہا کہ واہ بھئی واہ دعا تو قبول ہوئی ہماری اور سوراج مل گیا ان لوگوں کو۔ ارے ہم کو ملتا تو ایک بات بھی تھی۔ پھر سوچا کہ ہم اور یہ لوگ کچھ غیر تھوڑے ہیں۔ ان کو ملا یا ہم کو ایک ہی بات ہے مگر واللہ کمال ہوا کہ سوراج مل گیا دل کو کسی طرح یقین ہی نہیں آتا تھا کہ سوراج مل گیا ہوگا۔ حالانکہ ابھی تک جلوس نظر سے اوجھل نہیں ہوا تھا جب جلوس کی طرف نظریں جاتیں تو یقین ہو جاتا کہ سوراج مل گیا اور جب سوراج ملنے پر غور کرنا شروع کرتے تو دل کہتا کہ ابھی نہیں ملا ہے لیکن آخر جب ہر شخص نے سوراج ملنے کی خوش خبری سنائی تو شک دور ہوا اور ایک آزادانہ خود مختارانہ سانس لے کر ہم نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو آزاد سمجھا۔ ابھی ہم اپنے آپ کو آزاد سمجھ ہی رہے تھے کہ گھنٹہ نے ٹن ٹن بجا دیے یعنی ہم کو اسٹیشن چلے جانے کا حکم دیا۔

ہمارے ایسے آدمی کے لیے سفر شروع کرنے کا یقین لوگوں کو اس وقت ہوتا ہے جب ہم ٹکٹ خرید لیں اور ہم نے بھی اپنی یہ عادت ڈال رکھی ہے کہ سفر کرنے سے پہلے ٹکٹ ضرور خرید لیتے ہیں چنانچہ ہم کو جو سب سے پہلا مرحلہ اسٹیشن پر پہنچ کر درپیش ہوتا ہے وہ بکنگ آفس کی کھڑکی میں جھانک کر ٹکٹ خریدنے کی درخواست پیش کرنا ہے۔ آج بھی ہم نے بالکل اسی پروگرام پر عمل کیا اور بکنگ آفس کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر کہا:

''بابو جی! کانپور کا سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دے دیجیے''

بابو جی نے بجائے اس کے کہ ٹکٹ دے دیتے پہلے تو ہم کو گھورا پھر اطمینان سے فرمانے لگے ''ایک بات کہہ دیں یا مول تول؟''

میں سمجھا بابو جی مذاق کر رہے ہیں اور میں ہنس دیا۔ میرے ہنسنے پر بابو جی نے پھر کہا ''جناب سنیے تین روپے ہوئے، لائیے روپے اور ٹکٹ لے لیجیے''۔

اب تو مجھے اور زیادہ تعجب ہوا اور میں نے کہا:

''جناب تین روپے کیسے ہوئے ایک روپیہ تیرہ آنہ تو کرایہ ہے، آپ کہتے ہیں تین روپے۔ مجھے کانپور کا ٹکٹ چاہیے ہے کانپور کا سیکنڈ کلاس''۔

بابو جی نے ذرا ترش رو ہو کر جواب دیا:

''جناب والا! میں بہرہ نہیں ہوں، سن لیا ہے کہ آپ کو کانپور کا سیکنڈ کلاس ٹکٹ چاہیے۔ مگر اسی کے تین روپے کوڑی کم نہ لوں گا۔ جی چاہے لیجیے ورنہ جانے دیجیے''

میں:۔ مگر بابو صاحب ابھی پرسوں تک تو ایک روپیہ تیرہ آنہ کرایہ تھا آج کیا ہو گیا کہ ایک دم بڑھ گیا۔

بابو: کل کی بات کل کے ساتھ، آج دیش ہمارا ہے، ہم کو سوراج مل گیا ہے۔

میں: یہ کہیے کہ سوراج ریل کو بھی ملا۔ اچھا خیر ٹکٹ دیجیے نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔

بابو: لائیے روپے، اچھا نہ آپ کی بات نہ ہماری بات ڈھائی روپے دے دیجیے اور ٹکٹ لے لیجیے۔

بابو صاحب کی ان تمام باتوں پر کچھ تو ہنسی آ رہی تھی اور کچھ غصہ آ رہا تھا کہ فضول ان باتوں میں وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اگر گاڑی چھوٹ گئی تو اور مصیبت آئے گی ٹکٹ وکٹ سب دھرا رہ جائے گا آخر کار میں نے طے کر لیا کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کروں گا اور یہ سوچ کر میں بکنگ آفس سے چلنے لگا مجھ کو جاتا ہوا دیکھ کر بابو صاحب نے پھر آواز دی۔

''سنیے تو جناب، ٹھہریے تو جناب، دیکھیے تو جناب، اچھا دو روپے دے دیجیے آیئے وہی ایک روپیہ تیرہ آنے دے دیجیے۔ اب وہ بھی نہ دیجیے گا؟ اچھا آپ بھی کیا کہیں گے، لائیے ڈیڑھ روپیہ۔ اب اس سے زیادہ ہم کم نہیں کریں گے ہمارا نقصان ہو رہا ہے۔

جب ہم نے ٹکٹ کے بازار کا بھاؤ اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو اور اکڑ گئے اور ناک بھوں چڑھا کر ذرا ترچھی کر کے وہیں سے کہہ دیا ''ایک روپیہ دیں گے، ایک روپیہ کو دینا ہے تو دے دو''۔

ہم سمجھے تھے کہ بابو صاحب اس پر راضی نہ ہوں گے مگر واللہ کمال کیا۔ وہ کہ گردن لٹکا کر ذرا دھیمی آواز میں کہنے لگے۔ لائیے صاحب لائیے، بوہنی کا وقت ہے آپ ہی کے ہاتھوں بوہنی کرنی ہے۔

ٹکٹ تو ہم نے لے لیا لیکن وہ ٹکٹ ریل کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس پر تاریخ پڑی ہوئی تھی اور نہ اس پر کرایہ درج تھا۔ بابو صاحب نے ایک کاغذ کے ٹکڑے پر ''درجہ دوم کانپور'' لکھ کر ایک ٹیڑھی سی لکیر کھینچ دی تھی ہم نے ٹکٹ کو ادھر سے دیکھا ادھر سے دیکھا اور دو تین مرتبہ غور سے الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد بابو صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔ بابو صاحب بھی ذرا قیافہ شناس تھے ہماری اس حرکت سے وہ ہمارا مطلب سمجھ گئے اور متبسم ہو کر کہنے لگے:

''جناب والا رات کو سوراجیہ ملی ہے ابھی نئے ٹکٹ نہیں چھپے ہیں وہ دو تین دن میں چھپ جائیں گے۔ آپ کو ٹکٹ سے کیا مطلب، آپ تو سفر کیجیے اب آپ سے کوئی کچھ نہ پوچھے گا۔ آپ اطمینان رکھیے''۔

بابو صاحب نے تسلی تو دے دی مگر دیکھ رہے تھے کہ ٹکٹ پر نہ تاریخ ہے نہ کرایہ نہ فاصلہ اور فاصلہ ہوتا تو کہاں سے انہوں نے تو یہ بھی نہ لکھا کہ ہم سفر آخر کہاں سے کر رہے ہیں۔ بہر حال یہ سمجھ کر یا تو روپیہ گیا یا ہم تیرہ آنہ کے نہیں رہے اسٹیشن میں داخل ہو گئے۔

اسٹیشن میں حالانکہ سب کچھ وہی تھا جو آج سے قبل ہم دیکھ چکے تھے مگر اس سب کچھ کے باوجود بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی نے اسٹیشن کو قلابازی کھلا دی ہے یا الٹا باندھ کر ٹانک دیا گیا ہے، وہی گھڑی تھی وہی گھڑیال مگر دس بجنے میں ہنوز بیس منٹ باقی تھے حالانکہ اب گیارہ کا وقت تھا اسباب کے ٹھیلے پر پان والا اپنی دکان لگائے بیٹھا تھا، قلیوں کا کہیں نام نہ تھا ہماری سمجھ نہ آتا تھا کہ اسباب کس طرح ریل میں پہنچائیں، بمشکل ایک قلی ملا لیکن جیسے ہی اس سے ہم نے اسباب لانے کو کہا اس نے چین بہ جبیں ہو کر جواب دیا:

''اندھے ہو گئے ہو دکھائی نہیں دیتا کہ قلی ہیں یا اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر؟''

''ہم معاف کیجیے گا غلطی ہوئی'' کہہ کر پورے ایک گز پیچھے ہٹ گئے۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کو سر سے پیر تک بغور دیکھ کر سوچنے لگے کہ یا اللہ یہ کیا انقلاب ہے، پہلے تو اس صورت کے قلی ہوا کرتے تھے اب اگر اس صورت کے اسسٹنٹ ماسٹر ہونے لگے ہیں تو قلی کس صورت کا ہوگا۔ مجبوراً ہم نے اپنا اسباب خود اٹھایا اور دو مرتبہ کر کے سیکنڈ کلاس کے ڈبہ میں رکھا جہاں پہلے سے ایک جنٹلمین بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ اسباب قرینہ سے رکھ کر جب ذرا اطمینان ہوا تو ہم نے سوچا کہ یہ تحقیقات کر لینا چاہیے کہ یہی گاڑی کانپور جائے گی یا کوئی اور؟ سب سے پہلے تو ہم نے انہی حضرت سے پوچھا جو ہمارے ڈبہ میں تشریف فرما تھے لیکن انہوں نے صرف یہ جواب دیا کہ ''بابی بھیا ہم کا نا ہیں مالوم'' یہ خالص سودیشی ریل کے سیکنڈ کلاس کے معزز ممبر تھے۔ ان سے بھلا کیا معلوم ہو سکتا تھا مجبوراً ہم پلیٹ فارم پر آئے اور دو ایک آدمیوں سے پوچھنے کے بعد معلوم ہوا کہ ''اگر مسافر کانپور کے زیادہ ہوئے تو وہاں جائے گی ورنہ جہاں کے مسافروں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں چلی جائے گی۔ اسی لیے اب تک انجن نہیں لگایا گیا ہے کہ خدا معلوم ٹرین کو مشرق کی طرف جانا پڑے یا مغرب کی طرف''۔ ہم نے گھبرا کر پوچھا:

''لیکن یہ فیصلہ کب ہوگا؟''

جواب ملا کہ ''جب گاڑی بھر جائے گی اس وقت فیصلہ ہو سکتا ہے''۔

ہم نے پھر پوچھا ''لیکن گاڑی کا وقت تو ہو چکا''۔

جواب ملا ہو جایا کرے جب تک ریل نہ بھر جائے کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے کہ خالی ریل چھوڑ دی جائے؟

اب ہم بالکل راضی بارضا ہو کر خاموش ہو گئے۔ اس انتظام کو برا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہماری ہی دو ساتھی، اچھا اس لیے نہیں کہہ سکتے تھے کہ آج ہی کانپور پہنچنا تھا جس کی اب کوئی امید بظاہر نہیں معلوم ہوتی تھی غرض کہ کبھی اپنے ڈبے میں بیٹھ کر، کبھی لوٹے میں پانی لا کر، کبھی انجن کو مشرق اور مغرب کی سمت حد نظر تک ڈھونڈ کر، کبھی مسافروں کی تعداد کا اندازہ لگا کر وقت کاٹنے لگے۔ گیارہ سے بارہ، بارہ سے ایک، ایک سے دو بجے مگر نہ گھڑی کی سوئی ہلی نہ ٹرین اپنی جگہ سے ہلی، صرف ہم ٹہلتے رہے۔ خدا خدا کر کے ایک آدمی نے بہ آواز بلند چیخنا شروع کیا، بیٹھنے والے مسافر بیٹھو گاڑی چھوٹتی ہے''۔

ہم نے جلدی سے پہلے مشرق کی طرف انجن کو ڈھونڈا پھر مغرب کی طرف مگر دونوں طرف انجن غائب تھا اور ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ بغیر انجن کے گاڑی کس طرح چھوٹ سکتی ہے اور ان الفاظ پر شک کرنا اس لیے کفر سمجھتے تھے کہ ان کا کہنے والا کوئی شخص نہ تھا بلکہ وہی اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر تھے جن کو ہم قلی سمجھتے تھے۔ بہر حال بغیر سوچے سمجھے ہم اپنے ڈبے میں بیٹھ گئے ہمارے بیٹھتے ہی دو تین درجن لٹھ بند گنوار ہمارے درجے میں گھس آئے، ان سے ہم نے لاکھ کہا ''ارے سیکنڈ کلاس ہے سیکنڈ کلاس ہے بھائی سیکنڈ کلاس ہے، مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور یہی کہتے رہے ''ہم ہو جانت ہے ڈیوڑھا ہے، ہم ٹیکس لیا ہے''۔ خیر صاحب ہم چپ ہو رہے اور پلیٹ فارم پر اس غرض سے آئے کہ کسی سے کہہ دیں مگر گارڈ وارڈ نظر نہ آیا مجبوراً اسی اسٹیشن ماسٹر سے عرض کر دیا جس کا جواب انہوں نے اپنی سودیشی شان سے صرف یہ دیا ''بیٹھیے جناب سب ہندوستانی بھائی بھائی ہیں سب بھارت ماتا کے سپوت ہیں کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے۔ اب سیکنڈ کلاس کے ڈبہ کو بھول جایئے سب کو برابر کا سمجھیے جایئے تشریف رکھیے نہیں تو تھرڈ کلاس میں بھی جگہ نہ ملے گی''۔ ہم یہ کھرا جواب سن کر منہ لٹکائے ہوئے اپنے درجے میں آ گئے۔ ہماری جگہ پر قبضہ ہو چکا تھا اور ہم کو یہ طے کرنا پڑا کہ کھڑے کھڑے سفر ہوگا یا فسٹل خانے میں جگہ ملے گی۔ مجبوراً اپنا ٹرنک کھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

ہم کو بیٹھے بیٹھے ایک گھنٹہ کے قریب ہو گیا گاڑی بدستور کھڑی رہی۔ گھبرا کر ہم پلیٹ فارم پر آئے تو دیکھا کہ انجن گاڑی میں لگایا جا رہا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کانپور ہی کی طرف لگایا جا رہا ہے لیکن انجن لگنے کے بعد بھی گاڑی جب دیر تک نہ چھوٹی تو ہم نے اس تاخیر کا سبب دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی کا انتظار ہے وہ کانپور ہی جائیں گے۔ انہوں نے کہلا بھیجا تھا کہ بارہ بجے آ جائیں گے لیکن ابھی تک نہیں آئے۔ آدمی لانے کے لیے گیا ہوا ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہم کانپور جائیں یا ایک روپیہ سے صبر کر کے ارادہ ملتوی کر دیں۔ کام اشد ضروری تھا اس لیے جانا ضروری تھا، گاڑی چھوٹی نہ تھی اس لیے سفر ملتوی کرنے کا ارادہ تھا۔ عجیب کشمکش میں جان تھی معلوم نہیں وہ کون سا وقت تھا جب ہمارے منہ سے یہ دعا نکلی تھی، اب تو اس کو واپس کرنا بھی مشکل تھا، اس لیے کہ کفران نعمت کا فتویٰ بھی تو ہم پر لگا دیا جاتا۔ ہم اسی غور و فکر میں اپنے ٹرنک پر گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ ایک دم سے بندے ماترم کے فلک شگاف نعروں سے اچھل پڑے۔ معلوم ہوا کہ سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگرس کمیٹی تشریف لے آئے۔ ہم نے بھی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو ایک مجمع میں وہی لیڈر صاحب دکھائی دیئے جنہوں نے رات کو تقریر کر کے سوراج دلوایا تھا اور اب ہم کو معلوم ہوا کہ یہی سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی ہیں۔ غرض ان کے تشریف لانے کے بعد ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور انجن بھی سُن سُن کرنے لگا ایک کونے سے زیر پا بزرگوار لال اور سبز گاڑھے کی جھنڈیاں لیے ہوئے بھی نمودار ہوئے اور ہم نے اپنی جگہ پر سمجھ لیا کہ یہ گارڈ ہیں۔ ان گارڈ صاحب نے کرتے کی جیب سے ایک سیٹی نکال کر بجائی اور پہلے سرخ پھر جلدی سے سبز جھنڈی اس طرح ہلانے لگے گویا پہلے غلطی سے سرخ ہلا دی تھی۔ دو تین مرتبہ سیٹی بجا کر اور جھنڈی ہلا کر آخر غصہ میں انجن کی طرف جھپٹے اور ڈرائیور کو ڈانٹنا شروع کر دیا ''گھنٹہ بھر سے سیٹی دے رہا ہوں مگر تمہارے کان میں آواز ہی نہیں آتی اور آنکھیں بھی پھوٹ گئی ہیں کہ جھنڈی بھی نہیں دیکھتے''۔

ڈرائیور نے بھی ان کے لیے بے جا غصہ کا جواب کڑک کر دیا: جناب آپ آنکھیں مجھ پر کیوں نکال رہے ہیں میرا کیا قصور ہے گھنٹہ سے للو فائر مین کوئلہ لینے گیا ہوا ہے کہہ دیا تھا کہ لپک کر جلدی سے لے آ۔ ابھی تک غائب ہے معلوم نہیں کہاں گیا۔ پتہ بتا دیا تھا کہ رکاب گنج کے چوراہے سے یا عیش باغ کے پھاٹک سے لے آنا دو چار پیسے کم یا زیادہ کا خیال نہ کرنا مگر وہ جا کر مڑا نہیں اب بتایئے میرا کیا قصور ہے۔

گارڈ صاحب بھی ڈرائیور کو بے قصور سمجھ کر چپ ہو گئے اور کوئلہ کے انتظار میں گاڑی روکنے پر مجبور ہو گئے۔ انجن میں یہ بڑی بات ہے کہ وہ بغیر کوئلہ کے چل ہی نہیں سکتا جس طرح گھوڑے کے لیے دانہ گھاس ضروری ہے بالکل اسی طرح جب تک کوئلہ بھر نہ دیا جائے انجن چلنے کا نام نہیں لیتا۔ گھوڑا بے چارہ تو تھوڑی دیر بھوکا بھی چل سکتا ہے مگر یہ اتنا کام بھی نہیں دے سکتا۔ اب چاہیے کہ ریل بھی تھی، انجن بھی، مسافر بھی تھے، گارڈ بھی، سیکرٹری صاحب ٹاؤن کانگریس کمیٹی بھی آ گئے تھے اور ڈرائیور بھی تھا مگر ایک کے نہ ہونے سے سب کا ہونا نہ ہونا یکساں تھا۔ کامل ڈیڑھ گھنٹہ بعد للو فائر مین کوئلہ کی گٹھڑی لیے یہ کہتا ہوا آ پہنچا:

> ''آدھی رات کو کوئلہ منگانے چلے ہیں۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں ایک دکان پر اتنا سا کوئلہ تھا وہ بھی بمشکل تمام ایک روپیہ میں ملا ہے۔ بھاگتا ہوا آ رہا ہوں۔ راستہ میں گر بھی پڑا تھا۔ تمام گھٹنے چھل گئے کوئلہ وغیرہ دن سے منگا لیا کرو''۔

ڈرائیور نے جلدی سے کوئلہ ڈالا اور سیٹی بجا کر گاڑی چھوڑ دی۔ گاڑی چلی ہی تھی کہ شور مچ گیا ''روکو، روکو، گارڈ صاحب رہ گئے''۔ گاڑی رکی اور گارڈ صاحب کو سوار کر کے چلی۔ ابھی دو فرلانگ بھی مشکل سے چلی ہو گی کہ گاڑی پھر رکی اور گارڈ صاحب نے چلا چلا کر پوچھنا شروع کر دیا ''ارے لائن کلیر بھی لے لیا تھا..... لائن کلیر''۔ ڈرائیور نے بھی چلا کر جواب دیا ''لے لیا۔ لے لیا تھا ..... گارڈ صاحب نے جب اس طرف سے بھی اطمینان کر لیا تو پھر فرمایا ''اچھا تو چھوڑو میں سیٹی بجاتا ہوں'' گاڑی پھر چلی اب گاڑی کی رفتار کے متعلق ہم نے سوچنا شروع کیا کہ یہ میل ہے یا ایکسپریس، اس لیے کہ اس سے زیادہ تیز شاید ہم خود دوڑ سکتے، اگر ابھی شرط بد کر دوڑیں تو اس گاڑی سے پہلے کانپور پہنچنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ ہم سے آخر رہا نہ گیا اور اپنے ایک ہم سفر سے پوچھا: ''کیوں صاحب یہ میل ہے یا ایکسپریس'' وہ پہلے ہی کچھ خفا بیٹھے تھے۔ غالباً گاڑی پر ہوں گے، غصہ ہم پر اتارا۔ بھڑک کر فرمانے لگے: ''میاں خدا کا شکر کرو کہ یہ گاڑی ہی ہے تم میل ایکسپریس لیے پھر رہے ہو''۔ ان کا جواب سن کر ہم نے کھڑکی میں گردن ڈال کر جنگل کی سیر کرنا شروع کر دی مگر میر سے زیادہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ راستہ کے نئے مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوتے تھے اور گاڑی چھک چھک چل رہی تھی اسی رفتار سے چل کر گاڑی اموسی کے اسٹیشن پر رکی۔ اب وہاں ایک نیا جھگڑا یہ شروع ہوا کہ اسٹیشن ماسٹر اموسی نے ڈرائیور پر خفا ہونا شروع کیا کہ:

> ''جب تک میں نے سگنل نہیں دیا تم کو اسٹیشن میں گاڑی لانے کا حق کون سا تھا!''
>
> ''جب آپ نے گاڑی آتے دیکھ لی تھی تو سگنل کیوں نہیں دیا؟''

اسٹیشن ماسٹر: ''ایک تو گاڑی لے آیا اوپر سے زبان لڑاتا ہے۔ ابھی نکلوا دوں گا دوسرا ڈرائیور رکھ لوں گا جو مجھ سے گستاخی کی۔ اگر گاڑی لڑ جاتی تو تمہارا کیا جاتا، آئی گئی سب ہم پر ہوتی''۔

''دیکھیے زبان سنبھال کر کسی شریف آدمی سے باتیں کیا کیجیے۔ نوکری کی ہے عزت نہیں بیچی ہے۔ بڑے آئے وہاں سے نکالنے والے، جیسے ہم ان ہی کے تو نوکر ہیں۔ اچھا کیا گاڑی لائے، خوب کیا گاڑی لائے۔ اب اس ضد پر تو ہزار مرتبہ لائیں گے، دیکھیں ہمارا کوئی کیا کرتا ہے''۔

اسٹیشن ماسٹر: ''دیکھیے گارڈ صاحب منع کر لیجیے اس کو، کیسی کمینہ پن کی باتیں کر رہا ہے۔ افسری ماتحتی کا کچھ خیال نہیں۔ میں چھاتی چڑھ کر خون پی لیتا ہوں''۔

گارڈ: ''جانے بھی دو، اماں جانے بھی دو، ہائیں ہائیں یہ کیا کرتے ہو۔ اماں تم ہی ہٹ جاؤ۔ ارے چھوڑو بھی، ہٹو بھی، سنو تو سہی، ارے یار سنو تو''۔

اسٹیشن ماسٹر نے ڈرائیور کو اور ڈرائیور نے اسٹیشن ماسٹر کو گھونسے، لاتیں، تھپڑ، جوتے رسید کرنا شروع کر دیے۔ تمام مسافر یہ جھگڑا دیکھنے کھڑے ہو گئے بمشکل تمام گارڈ نے بیچ بچاؤ کیا اور سمجھا بجھا کر دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ ابھی بے چارہ سمجھا ہی رہا تھا کہ کسی نے آ کر نہایت گھبرائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا:

''گارڈ صاحب ارے گارڈ صاحب! اجی وہ مال گاڑی سامنے سے آ رہی ہے اور اسی پٹڑی پر آ رہی ہے غضب ہو گیا''۔ گارڈ بھی یہ سنتے ہی بدحواس ہو گیا اور چیخنا شروع کر دیا:

''مسافرو جلدی اترو، گاڑی لڑتی ہے، گاڑی لڑتی ہے جلدی اترو''۔

سب مسافر گڑبڑا کر اپنا اسباب کچھ لے کر کچھ چھوڑ کر گاڑی سے نکل آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے مال گاڑی جس کا ڈرائیور سو گیا تھا اس گاڑی سے اس بری طرح ٹکرائی کہ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر میرے منہ پر آ پڑا میں ایک دم سے چونک پڑتا ہوں۔ نئے میرے منہ پر آ کر گری تھی، حقہ جل چکا تھا، آرام کرسی بھی شبنم سے تر ہو گئی تھی اور گھڑی میں بھی دو بجنے کے قریب تھے۔ میں کرسی سے اٹھ کر چارپائی پر لیٹ گیا اس لیے کہ اب گاڑی تو سونے کی وجہ سے چھوٹ چکی تھی۔ اب ہو ہی کیا سکتا تھا سوائے آرام سے سونے کے۔

طُوسی کا طوطا

کرنل محمد خاں

مسٹر ایف اے طوسی ہمارے محلے کے سب سے سینئر مکین ہیں۔ آج سے کچھ عرصے پہلے بہت بڑے افسر تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ مگر وہی دیرینہ اکڑ باقی ہے۔ دراصل آپ کا تعلق ایسے محکمے سے تھا جس میں اکڑ اور پھکڑ کا ملکہ اہلیت کے خانے میں درج کیا جاتا ہے۔ آج کل محلے کے دوسرے لوگوں سے نہ صرف جسمانی بلکہ زبانی فاصلے پر بھی رہے ہیں۔ اگر کبھی زبان کا استعمال کرنا بھی پڑے تو بڑے سرپرستانہ لہجے میں بات کرتے ہیں جیسے کسی فرعون کو غریب پروری کا دورہ پڑ گیا ہو اور اگر کبھی سچ مچ جلال پر آ جائیں تو پھر وہ مذکورہ بالا خداداد اہلیتوں کا کچھ اس انداز سے مظاہرہ کرتے ہیں جیسے سارے محلے کو اندر کر دیں گے۔ شنید ہے کہ اپنے گھر میں نوکروں کے علاوہ بے چاری بیگم کو بھی مستقل طور پر اندر کیا ہوا ہے۔

میں ایک سکول ٹیچر ہوں تعلیم کے لحاظ سے تو طوسی صاحب مجھ سے خاصے پیچھے ہیں۔ لیکن عہدے میں میلوں آگے ہیں یا تھے۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں بہت حلیم اور میٹھی طبیعت کا مالک ہوں لیکن میں فرعون بھی نہیں ہوں۔ ہاں فرعونوں سے ٹکر لینے میں مزا آتا ہے اور حتی المقدور لے لیتا ہوں۔

محلے داری کی وجہ سے طوسی صاحب اور میں ایک دوسرے کو جانتے ضرور ہیں لیکن کبھی ان کے ساتھ خندہ پیشانی بلکہ سادہ پیشانی سے بھی ہم کلامی کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر پچھلے دنوں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ طوسی صاحب سے سچ مچ ٹکر ہو گئی، جسمانی نہیں قلمی! اور ٹکر کا باعث تھا ایک طوطا یا یوں کہہ لیں کہ طوسی کا طوطا۔

یہ ایک پیلے رنگ کا باتونی سا طوطا تھا جو خدا جانے کن حالات میں اپنے مالک کے گھر سے نکلا اور اڑتا اڑتا میرے ہاں مہمان ٹھہرا۔ اس پر میں نے طوسی صاحب کو خط لکھا:

محترم طوسی صاحب! السلام علیکم!

اس خط کا مدعا آپ سے ایک سوال پوچھنا ہے۔ کیا آپ کا کوئی طوطا گم ہو گیا ہے؟ سوال پوچھنے کی وجہ یہ ہے کہ آج دوپہر کو طوطے کی نسل کا ایک پرندہ میری خواب گاہ کی کھلی کھڑکی سے اچانک میرے گھر میں داخل ہو گیا، بالکل برضا و رغبت۔ کیونکہ ہم لوگوں نے اسے کوئی دعوت دی تھی نہ ترغیب۔ اور اب وہ کمرے کی انگیٹھی پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہے جیسے یہ گھر اسی کا ہو۔ مسلسل باتیں کیے جا رہا ہے۔ جو ابھی پورے طور ہمارے پلے نہیں پڑتیں۔ مجھے شک سا ہے کہ یہ طوطا آپ کا ہے لیکن ظاہر ہے کہ محض شک کی بنا پر میں اسے آپ کے حوالے نہیں کر سکتا۔ سو اگر آپ نے واقعی کوئی طوطا کھویا ہے تو براہ کرم اس کے حلیے سے آگاہ کریں۔ میں انشاء اللہ پوری احتیاط سے حلیے کا طوطے سے مقابلہ کروں گا۔ اگر حلیہ سو فیصدی درست نکلا تو اپنی پہلی فرصت میں طوطا آپ کو لوٹا دوں گا۔ ہاں اگر طوطے نے اختلافی وجوہ کی بنا پر واپس جانے میں مزاحمت کی تو اس صورت میں آپ کو طوطے کے جذبات و اعتراضات سے آگاہ کر دوں گا۔

مخلص خادم حسین

طوسی صاحب نے فوراً جواب دیا:

ماسٹر خادم حسین!

تمہارے احمقانہ خط کے جواب میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا طوطا فی الواقع گم ہو گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ خط لکھتے وقت تمہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ طوطا میرا ہی ہے۔ یہ بچہ تھا کہ میرے گھر میں آیا اور تین سال سے میرا ساتھی ہے۔ ان حالات میں شرافت کا تقاضا یہ تھا کہ تم اسے غیر مشروط طور پر میرے حوالے کر دیتے اور معاملہ ختم ہو جاتا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم ماسٹر لوگوں کو شرافت کے تقاضوں سے بہت شناسائی نہیں۔ غالباً تم بڑے آدمیوں کو فضول خط لکھ کر اپنی اہمیت جتانے کا موقع ڈھونڈتے رہتے ہو۔ یہ گھٹیا حرکت ہے۔ اب تمہارے لیے ایک ہی صحیح راستہ ہے کہ حامل ہذا کو فی الفور طوطا دے دو اور آئندہ مجھے خط لکھنے کی کوشش نہ کرو۔

نوٹ: تم نے طوطے کا حلیہ پوچھا ہے۔ طوطے کا حلیہ کیا ہوتا ہے؟ بس طوطا ہے اور پیلے رنگ کا ہے۔

ایف۔ اے طوسی

قارئین! ملاحظہ فرمایا آپ نے مسٹر طوسی کا طرز تخاطب اور ان کی جھنجھلاہٹ۔ اب میں ہزار خاکسار سہی لیکن عرض کیا ہے نا کہ فرعونوں سے ٹکر لینے میں مزا آتا ہے۔ مگر کسی جھنجھلاہٹ کے بغیر۔ سو عرض کیا:

جناب طوسی صاحب! السلام علیکم!

آپ کا نامہ ملا جس کے ابتدائی الفاظ نے تو مجھے آپ کی شرافت اور شائستگی کے گرویدہ کر لیا ہے۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے لیکن اگر مجھے تبصرے کی اجازت دیں تو عرض کروں گا کہ ہر چند کہ آپ کی تکنیک بے عیب ہے اور آپ کے سابقہ محکمے کی روایات کی آئینہ دار ہے۔ تاہم میرے خط کے جواب کے طور پر آپ کا گرامی نامہ ذرا بے کار ہے۔ موضوع زیر بحث کے پیش نظر ضرورت اس بات کی تھی کہ شرافت پر لیکچر دینے کی بجائے (یا علاوہ، اپنے گم گشتہ طوطے کا مفصل حلیہ بیان فرماتے) طوطے کا محض بیرونی رنگ بتا دینا کافی نہیں۔ فطرت نے یہ رنگ آپ کے طوطے کے علاوہ بے شمار دوسرے طوطوں کو بھی عطا کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر آپ اپنے طوطے کی عادات پر روشنی ڈالتے۔ اس کے کمالات کا ذکر کرتے اور اس کے پروں کے رنگ کی بجائے اس کی گفتار کا ڈھنگ بیان فرماتے۔

پھر آپ نے طوطے کا حلیہ بیان کرنے میں بھی بڑی کفایت بلکہ گستاخی معاف قبض سے کام لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی تنگ شہادت کی بنا پر میں طوطا واپس کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب نہیں سمجھتا۔ بے شک طوطے کا رنگ پیلا ہی ہے لیکن میں نے محلے کے دوسرے لوگوں سے تا حال دریافت نہیں کیا ورنہ بالکل ممکن ہے کسی اور کا طوطا بھی گم ہو گیا ہو اور اتفاق سے اس کا رنگ بھی پیلا ہو۔ سو امید ہے کہ مفصل حلیے کی ضرورت حضور کی سمجھ میں آ گئی ہو گی۔ چنانچہ اگر اس خط کا جواب دینا پسند فرمائیں تو شرافت کی بقیہ فلاسفی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ طوطے کے کوائف پر بھی مفصل روشنی ڈالیں۔

مخلص خادم حسین

اس خط سے طوسی صاحب ذرا سیخ پا ہو گئے۔ جواب آیا:

ماسٹر خادم حسین

خدا تمہیں غارت کرے۔ تم جانتے ہو کہ طوطا بلاشبہ میرا ہے مگر تم نے خواہ مخواہ حلیے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بتا تو دیا ہے کہ

اس کا رنگ پیلا ہے کم گو ہے اور جیسا کہ اس نسل کے طوطوں کا دستور ہے اپنے سر کو ایک طرف لٹکا کر رکھتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سے زیادہ حلیہ کیا ہوتا ہے۔

بہر حال اب حلیہ بھول جاؤ اور طوطا فی الفور واپس کرو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو میں قانونی کارروائی پر مجبور ہو جاؤں گا۔ شاید تمہیں علم نہیں کہ کسی دوسرے کے مال پر قبضہ کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔ یہ علم تمہیں جلد ہی ہو جائے گا۔ شاید تم بھول رہے ہو کہ میرا نام طوسی ہے۔ نوابزادہ فخر عالم طوسی!

الف۔ اے طوسی

میرا جواب تھا:

جناب طوسی صاحب! السلام علیکم!

جناب والا کا الٹی میٹم ملا۔ وہ اپنی جگہ پر۔ مگر مجھے مکرر عرض کرنے کی اجازت دیں کہ آپ کا بیان کردہ حلیہ ناکافی ہے۔ ناکافی ہی نہیں نادرست بھی ہے۔ کیونکہ یہ طوطا کسی عنوان سے کم گو نہیں کہلا سکتا۔ بے حد بسیار گو ہے اور جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں فحش گو بھی ہے۔ جیسا کہ میں بار بار عرض کر چکا ہوں، اگر آپ اپنے طوطے کے چند پسندیدہ الفاظ یا جملے بتا دیتے تو اس کی ملکیت کے تعین میں بے حد ممد ثابت ہوتے۔ مجھے اس سے ہرگز انکار نہیں کہ یہ رنگ کا پیلا ہے اور سر لٹکا کر رکھتا ہے۔ لیکن اکثر پیلے طوطوں کا سر تھامنے کا یہی انداز ہے۔ شناخت کے لیے فیصلہ کن چیز طوطے کا نمونہ کلام ہی ہے اور کچھ نہیں۔

باقی رہی آپ کی عدالت میں جانے کی دھمکی تو میری کیا مجال کہ آپ کو اس دربار میں جانے سے روکوں۔ صرف ایک بات کا خیال رکھیے گا اگر عدالت نے طوطے کو بھی شہادت کے لیے طلب کر لیا تو اس کی شہادت بند کمرے میں دلوایئے گا۔ ورنہ مجھے خوف ہے کہ اس کی فصاحت دشنام اس کے سکھانے والے کو فحاشی پھیلانے کے جرم میں پکڑوا سکتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ طوطے کے آموزگار آپ ہی ہیں اور یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہو کہ آج کل فحاشی پھیلانے کی سزا میں کوڑے وغیرہ بھی شامل ہیں۔ وما علینا الا البلاغ

آپ نے اپنے نامہ گرامی کی ابتدا ایک دعائیہ جملے سے کی ہے اور خدا تعالیٰ کو مجھے غارت کرنے کی زحمت دی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے یہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے جو عادل و قادر ہے اور محض کسی کی لگائی بجھائی پر غریبوں کو غارت نہیں کر دیتا۔ ورنہ زیادہ ممکن تو یہ تھا کہ یہ ڈیوٹی آپ کسی قابل اعتماد غنڈے کے ذمے لگا دیتے۔ اس صورت میں آپ خاصے مثبت نتائج کی توقع رکھ سکتے تھے۔

آخر میں مجھے یہ علم تو تھا کہ آپ کا اسم گرامی طوسی ہے اور میں اسے بالکل نہیں بھولا تھا۔ البتہ یہ کہ حضور نوابزادہ بھی ہیں میرے علم میں ایک ہیبت ناک اضافہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ناگہانی بلاؤں سے محفوظ رکھے۔ آپ کو بھی اور مجھے بھی۔

مخلص خادم حسین

طوسی صاحب نے جواب میں لکھا:

ماسٹر خادم حسین

تم میرے اندازے سے زیادہ پاجی نکلے ہو۔ ایک معمولی سکول ماسٹر ہوتے یہ گستاخی کہ میرے طوطے کو بدزبانی کا مجرم ٹھہرا رہے ہو۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو اس کی وجہ ظاہر ہے کہ میرا طوطا کئی روز سے تمہاری صحبت میں رہ رہا ہے ورنہ جب تک یہ میرے گھر میں تھا شیریں گفتاری کا نمونہ تھا۔ جیسے اس کی زبان کوثر و تسنیم میں دھلی ہو۔ آخر اس کی تمام تر تربیت یا خود میں نے کی ہے یا میری بیگم نے۔ دریں حالات یہ اور ضروری ہو گیا ہے کہ میرا طوطا موجودہ صحبت سے بعجلت تمام الگ کیا جائے۔ چنانچہ کل صبح تک تم نے طوطا واپس نہ کیا تو اگلی دفعہ تمہیں خط کی بجائے عدالت کے سمن ملیں گے۔

الف۔ اے طوسی

جناب طوسی صاحب! السلام علیکم!

بے شک ایک سکول ماسٹر کے مقابلے میں آپ ایک بہت بڑے (سابق) افسر ہیں۔ لہذا آپ کا فرمودہ سر آنکھوں پر لیکن ایک اختلاف کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس طوطے کی زبان اگر کسی پانی میں دھلی ہے تو کوثر و تسنیم نہیں ہو سکتے۔ زیادہ ممکن یہ ہے کہ اس نے آپ سے آنکھ بچا کر کسی گٹر میں چونچ تر کر لی ہو۔ رہا میری صحبت کا اثر تو قبلہ آپ اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے یقینا جانتے ہوں گے کہ بوڑھے طوطے (بلکہ انسان بھی) سیکھا نہیں کرتے۔ اگر یہ آپ کا طوطا ہے تو آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس نے اپنی تمام تر طالب علمی کا زمانہ آپ اور آپ کی بیگم محترمہ کے زیر سایہ گزارا ہے اور گھر سے مکمل طور پر فارغ التحصیل ہو کر نکلا ہے۔

رہی صحبت کی بات تو یقین جانیں کہ اگر میں چندے اس طوطے کی صحبت میں رہا تو میں محکمہ پولیس کے علاوہ کسی دوسری جگہ ملازمت کرنے کے قابل نہ رہوں گا۔ دوسرے لفظوں میں میرا موجودہ روزگار چھن جائے گا۔ ان حالات میں اگر کل تک آپ اس طوطے کی ملکیت کا کوئی حتمی ثبوت بہم نہیں پہنچاتے ہیں، میں اس اسے دارالامان کے حوالے کر دوں گا۔ والسلام

مخلص خادم حسین

جواب آیا:

ماسٹر خادم حسین!

مجھے ضرورت نہ تھی تمہارے آخری بیہودہ خط کا جواب دیتا۔ کیونکہ یہ معاملہ میں اپنے وکیل کے سپرد کر چکا ہوں۔ میں تمہیں صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں تم ایک نہایت بدتمیز، بے ادب اور گستاخ آدمی ہو۔ آدمی کہاں ماسٹر ہو چند ٹکے کے۔

الف۔ اے طوسی

قارئین! آپ شاید حیران ہوں گے لیکن اگلی صبح میں نے طوطا طوسی صاحب کو واپس کر دیا۔ کیا میں نے طوسی صاحب کے خوف سے ایسا کیا؟ یا عدالت کے ڈر سے؟ آپ ذرا ذیل کا رقعہ پڑھیں جو میں نے طوطے کے ہاتھ طوسی صاحب کو بھیجا:

جناب طوسی صاحب!

آپ کا طوطا ارسال خدمت ہے۔ وہ ثبوت جو آپ بہم نہ پہنچا سکے تو طوطے نے بہم پہنچا دیا ہے۔ اب مجھے کامل یقین ہے کہ یہ طوطا آپ ہی کی ملکیت ہے اور اگر کسی اور کا ہے تو اس کا نام بھی طوسی ہوگا۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے اس محترم نام کے مالک پورے شہر میں آپ ہی ہیں۔

ہوا یہ کہ ہم ناشتہ کر رہے تھے کہ حسب معمول طوطے نے ابتدائے کلام کی۔ اس سے پہلے وہ لفظ ''تم'' سے بات شروع کرتا تھا اور پھر ایک مرصع تھا نیدارانہ گالی سے آغاز سخن کرتا تھا اور ہم چاروناچار مزید کلام کی تاب نہ لاتے ہوئے ناشتہ اٹھا کر باہر صحن میں نکل جاتے تھے۔ لیکن آج خلاف معمول اس کے منہ یا چونچ سے پہلا لفظ جو نکلا وہ آپ کا اسم گرامی تھا۔ اچانک بولا:

طوسی! اور پھر جملہ مکمل کیا۔

''طوسی جائے ..... میں''

یہ خالی جگہ طوطے نے نہیں میں نے چھوڑی ہے۔ میری مجال نہیں کہ خالی جگہ کو اسی لفظ سے پر کر دوں۔ جسے طوطے نے بالتواتر اور بالاصرار پر کیا۔ یہ گرائمر کی رو سے ایک طرح کا دعائیہ جملہ تھا جسے آپ کے نقطہ نگاہ سے بد دعائیہ بھی کہا جا سکتا ہے جس سے طوطے کا مدعا یہ تھا کہ خدائے بزرگ و برتر آپ کو یہاں سے اٹھا کر وہاں لے جائے۔ ''یہاں سے وہاں'' تک سے اس کی مراد یہ نہ تھی کہ اس محلے سے اس محلے میں بلکہ اس دنیا سے اگلی دنیا میں مستقل طور پر منتقل کر دے۔ اور کم بخت نے صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اگلی دنیا کی دو ممکنہ قیام گاہوں میں سے آپ کے لیے اس مقام پر نزول اجلال کی سفارش کی جو نسبتاً زیادہ گرم ہے۔ بہت زیادہ گرم۔ آپ کے طوطے نے اس مقام کا ٹیکنیکل نام بھی لیا جو ترنم کا ہم قافیہ ہے۔ مگر اس کا دہرانا میری زبان کو زیب نہیں دیتا۔ آپ یقیناً اپنے طوطے کا منشا سمجھ گئے ہوں گے اور اس مقام کے صحیح نام اور اس کی آب و ہوا کا بھی آپ کو اندازہ ہوگا۔ یقین مانیں کہ میں نے طوطے کے منہ سے پہلی مرتبہ یہ دعا سنی تو اسے بہت جھڑکا کہ اپنے مالک اور محسن کے لیے کوئی دعا مانگنا ہی ہے تو کسی معتدل جگہ کی دعا مانگو۔ مگر وہ ضدی پرندہ اپنے موقف پر سختی سے قائم رہا اور اپنی دعا میں ترمیم کرنے سے یکسر انکار کرتا رہا۔

میں حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ یہ دعا طوطے نے میرے گھر میں نہیں سیکھی۔ مجھے آپ سے ہزار اختلاف سہی مگر مجھے آپ کے انتقال میں کوئی فوری دلچسپی نہیں۔ بہر حال مرنے کے بعد بہشت و دوزخ کا فیصلہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے لیکن میری دعا ہمیشہ یہی رہے گی کہ آپ جہاں بھی رہیں خوش رہیں۔ اب رہا یہ کہ یہ دعا یا بد دعا اسے کس نے سکھائی تو آپ کے بیان کے مطابق طوطے نے بچپن سے اب تک صرف دو استادوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ آپ کے سامنے اور آپ کی بیگم صاحبہ کے سامنے۔ میں بی جمالو بننا نہیں چاہتا مگر ظاہر ہے کہ یہ آپ کا گھریلو معاملہ ہے کوئی تیسرا شخص اس میں ملوث نہیں سو اسے بہ خوش اسلوبی گھر میں ہی طے کر لیں۔ بظاہر بیگم صاحبہ کا بھی اتنا قصور نہیں جتنا آپ کو پہلے لمحے میں نظر آئے گا۔

بہر حال میں خوش ہوں کہ مجھے جس شخص کی تلاش تھی وہ مل گیا ہے۔ یعنی طوطے کا مالک اور وہ بلاشبہ آپ ہی ہیں۔ یہ طوطا بوجوہ بدزبان ضرور ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا خانہ زاد ہے۔ سو اس کی بازیابی پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔

والسلام۔ مخلص خادم حسین

میں طوسی صاحب سے آج تک دو شکریے کے الفاظ کا منتظر ہوں۔ خدا جانے وہ مجھ سے بولنا نہیں چاہتے یا شاید اس دوران میں طوطے کی دعا قبول ہو چکی ہے۔ دوسری صورت میں اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت کرے۔ اگرچہ طوطے نے ہماری دعا سن لی تو سخت برہم ہوگا۔

(مرکزی خیال ماخوذ)

پنجاب پبلک لائبریری
شرقی و غربی علوم کا مخزن

عباس چغتائی

ایک زمانہ تھا کہ متحدہ ہندوستان میں دہلی کے بعد لاہور کو علم و ادب کا گہوارہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہاں قدم قدم پر علم پرور ہستیاں موجود تھیں، جو ذوق و شوق سے علمی ذخائر کی سرپرستی کر رہی تھیں۔ ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کے تسلط کے وقت بھی یہاں بیشتر ذاتی کتب خانے موجود تھے۔ ان میں سکھ دربار کا سرکاری کتب خانہ بے حد اہم تھا، جسے انگریزوں نے توشہ خانہ میں محفوظ کر لیا۔ اس کے بعد لاہور میں رہائش پذیر انگریزوں نے مقامی لوگوں کی مدد سے کئی لائبریریاں قائم کیں۔ انگریزی دور کی اولین پبلک لائبریری وہ تھی، جو لاہور کرانیکل پریس کے ساتھ منسلک تھی، اسے ۱۸۵۰ء میں قائم کیا گیا۔ دوسری اہم لائبریری انار کلی بک کلب یا انارکلی لائبریری تھی۔ یہ ۱۸۵۸ء میں سول سیکرٹریٹ کے قریب بنائی گئی۔ بعد میں اسی لائبریری کا نام تبدیل کر کے انارکلی لائبریری اینڈ ریڈنگ روم رکھ دیا گیا، تاہم یہ لاہور لائبریری کے نام سے معروف ہوئی اور اپر انڈیا کی بہترین لائبریری سمجھی جاتی تھی۔ اس لائبریری کو بعد میں چوبرجی بارہ دری وزیر خاں، جہاں بعد ازاں ۱۸۸۵ء میں پنجاب پبلک لائبریری بنی، کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ ۱۸۷۸ء تک یہ لائبریری اسی عمارت میں پوری آب و تاب کے ساتھ خدمات انجام دیتی رہی، لیکن ایک بار پھر اس لائبریری کو لارنس اور منٹگمری ہال میں ہجرت کرنا پڑی، جہاں اس کا نام بدل کر لاہور اینڈ میاں میر انسٹی ٹیوٹ رکھ دیا گیا۔ تیسری پبلک لائبریری کو انجمن پنجاب نے ۱۸۶۵ء میں قائم کیا۔ یہ اندرون شہر لاہور میں سکشا سبھا ہال میں قائم ہوئی۔ اس لائبریری کو انجمن پنجاب کے صدر ڈاکٹر لائیٹنر نے، جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل بھی تھے، قائم کیا۔

سرکاری لائبریریوں میں پنجاب سول سیکرٹریٹ لائبریری (۱۸۴۹ء)، ڈی پی آئی آفس لائبریری (۱۸۶۳ء)، لاہور بار لائبریری، ایڈووکیٹ جنرل لائبریری، پنجاب یونیورسٹی لائبریری اور گورنمنٹ بک ڈپو لائبریری و ریڈنگ روم (جسے سنٹرل ریفرنس لائبریری بھی کہا جاتا تھا) نمایاں تھیں۔ یاد رہے کہ متذکرہ سرکاری، غیر سرکاری یا نجی لائبریریاں صرف خواص کی ضروریات کو ہی پورا کرتی تھیں اور فقط لاہور تک محدود تھیں، یعنی تمام فرقوں کے لوگوں کے لیے کوئی ایسی صدر لائبریری موجود نہ تھی، جہاں سرکاری اشاعتوں کے علاوہ مشرقی و مغربی ممالک کے علم و ادب کی کتابیں ایک ہی چھت تلے جمع ہوں اور جس سے نہ صرف لاہور، بلکہ پنجاب بھر کے لوگ استفادہ کر سکیں۔ واضح رہے کہ اس وقت دہلی کے علاوہ صوبہ سرحد بھی حکومت پنجاب کے ماتحت تھے۔ لہٰذا ایک ایسے کتب خانے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے ۸ نومبر ۱۸۸۴ء کو گورنر پنجاب نے ایک قرارداد کے ذریعے لاہور میں ایک کتب خانہ قائم کرنے کا اعلان کیا۔ قرارداد میں کہا گیا کہ:

''جناب لیفٹیننٹ گورنر (سی یو ایچیسن) کا منشا ہے کہ لاہور میں ایک ایسا عام کتب خانہ قائم کیا جائے، جس

سے سب طبقوں کے لوگ استفادہ کر سکیں۔ اس کتب خانہ میں سرکاری اشاعتیں نیز مشرقی ممالک وغیرہ کے علم وادب کی کتابیں رکھی جائیں گی، اس کا مقصد صرف یہی نہیں کہ مختلف سرکاری محکموں کے کتب خانوں کے جو حصے ان محکموں کے روزمرہ استعمال کے لیے درکار نہیں، ان کو ایک جگہ اکٹھا کیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ ایک ایسے کتب خانے کی بنیاد ڈالی جائے، جو عام قسم کا ہو اور جس سے صوبے کو عموماً فائدہ پہنچے۔

۲۔ پس اس امر پر غور کرنے اور مشورہ دینے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے، جس میں مندرجہ ذیل ممبر شامل ہیں:

لیفٹیننٹ کرنل ای جی ویلس صاحب	پریذیڈنٹ
ڈی سی جے ابٹسن صاحب	ممبر
ای ڈبلیو پارکر صاحب	ممبر
ایس ویلر صاحب	ممبر
پنڈت رام نراین	ممبر
سیکرٹری حکومت پنجاب	ممبر

ایک اسسٹنٹ کمشنر اس کمیٹی کا سیکرٹری مقرر کیا جائے گا اور کمیٹی کو اپنے ممبروں کی تعداد بڑھانے کا اختیار ہے۔

۳۔ مندرجہ ذیل امور کمیٹی کی ہدایت کے لیے بنائے جاتے ہیں کہ ان کی تجویزوں کے لیے کارآمد ہوں۔

۴۔ سب کو بلا معاوضہ کتب خانہ سے استفادہ کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ صرف ان شرائط کی پابندی ہو، جو اس کے استعمال کرنے والے افراد کی حیثیت کے بارے میں کمیٹی تجویز اور حکومت منظور کرے۔ جو افراد کتابوں کو کتب خانہ سے باہر لے جانا چاہیں ان سے کچھ چندہ لیا جائے اور چندے کا روپیہ کتب خانے اور اس کے عملہ کو قائم رکھنے اور وقتاً فوقتاً نئی کتابیں خریدنے میں خرچ کیا جائے۔ عام افراد اور مختلف محکموں اور انجمنوں سے، خواہ وہ لاہور میں یا صوبہ کے کسی اور علاقے میں ہوں، درخواست کی جائے گی کہ وہ کتب خانے کی امداد کے لیے کتابیں فراہم کریں۔ جو کتابیں اول کمیٹی اور بعد ازاں لائبریرین اور لاہور کی مستقل کمیٹی پیش کرے گی ان میں سے عمدہ کتابیں چھانٹنے کا بندوبست کیا جائے گا۔

۵۔ ایک سنٹرل حوالہ جاتی کتب خانہ قائم کرنے کی نسبت پہلے جو باتیں زیر تجویز تھیں[۲]، ان پر یہی کمیٹی غور کرے اور اس موضوع پر ایسی تجاویز پیش کرے، جو معاملے کے تبدیل شدہ حالات کے موافق اس کے نزدیک مناسب تر ہوں۔

۶۔ جو کمیٹی اب مقرر ہوئی ہے، وہ لاہور میں کتب خانے کے لیے کوئی مناسب جگہ پسند کرے گی اور تجویز کرے گی کہ صوبائی فنڈ سے کس قدر امداد طلب کی جائے۔ جو لائبریرین، کلرک اور ادنیٰ ملازم ضروری تصور کیے جائیں ان کی تعیناتی کے لیے کیا انتظام کیا جائے۔ نیز یہ کمیٹی کتب خانے کے انتظام کے قواعد کا ایک مسودہ تیار کرے گی اور حکومت کے پاس ایک تجویز پیش کرے گی، جس میں ان تمام امور کی منظوری کے لیے سفارش کی جائے گی جن میں فیصلہ کی ضرورت ہو۔

۷۔ کمیٹی کا پہلا اجلاس مورخہ ۱۴ر نومبر (بروز بدھ) کو ۳ بجے سہ پہر سول سیکرٹریٹ میں منعقد ہوگا۔

۸۔ کمیٹی کو اختیار ہوگا کہ ایسے محکموں یا انجمنوں وغیرہ کے ساتھ براہ راست خط وکتابت کرے، جس سے اس اسکیم میں مدد ملنے کا احتمال ہو۔"

لہٰذا پبلک لائبریری کمیٹی کا پہلا اجلاس مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۸۸۴ء کو پنجاب سول سیکرٹریٹ میں منعقد ہوا[۳]۔ اجلاس میں تجویز کیا گیا کہ اس لائبریری کو "پنجاب پبلک لائبریری" کا نام دیا جائے جو مناسب معلوم ہوتا ہے اور حکومت پنجاب سے اس کی منظوری کی درخواست کی گئی۔ اجلاس میں لائبریری کے لیے ۶۰ روپے ماہوار پر ایک کلرک کی تعیناتی ۲۱ر نومبر ۱۸۸۴ء سے قابل عمل قرار دی گئی، البتہ لائبریری کے لیے ایک مستقل لائبریرین کے سوال پر فیصلہ کیا گیا کہ اس پر بعد میں غور کیا جائے گا۔ کمیٹی نے موجودہ مالی سال کے لیے فراہم کردہ ۵ ہزار روپے کی سپیشل سرکاری امداد اور سال ۸۶-۱۸۸۵ء کے لیے ۱۰ ہزار روپے کی سپیشل امداد دینے کے حکومتی فیصلے کو سراہتے ہوئے بہترین آغاز قرار دیا[۴]۔ حکومت نے لائبریری کے لیے ۶۰ روپے ماہوار کی الگ گرانٹ دینے کا بھی وعدہ کیا۔

پنجاب پبلک لائبریری کا قیام چونکہ ایک غیر سرکاری ادارے کی حیثیت سے عمل میں آیا تھا، لہٰذا اس کے فنڈز کو پبلک لائبریری کمیٹی کے سیکرٹری کی خواہش کے مطابق بحیثیت پرائیویٹ اکاؤنٹ بنک آف بنگال میں جمع کرانے کی اجازت دی گئی تاکہ کتب خانہ کے لیے کتابیں خریدنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔[۵]

مسٹر سی بی برنڈ نے، جو پنجاب پبلک لائبریری کمیٹی کے پہلے سیکرٹری تھے، اپنی چٹھی محررہ ۲۷ر اپریل ۱۸۸۵ء بنام سیکرٹری حکومت پنجاب میں پبلک لائبریری کمیٹی کی جانب سے حکومت پنجاب کا، انتہائی معقول مالی امداد فراہم کرنے پر شکریہ ادا کیا۔[۶]

سیکرٹری پنجاب پبلک لائبریری مسٹر سی بی برنڈ نے سیکرٹری حکومت پنجاب کو لائبریری کی پہلی پراسپیکٹس ۲۸ر جنوری ۱۸۸۵ء کو بھیجی۔ پراسپیکٹس میں مینجمنٹ کمیٹی کی تشکیل اور پبلک لائبریری کا تعارف دیا گیا تھا، جس میں حکومت نے چند ترامیم تجویز کیں۔ پراسپیکٹس کی نظر ثانی شدہ کاپی ۶ر مارچ ۱۸۸۵ء کو بھجوائی گئی یہ پراسپیکٹس ۱۴ر مئی ۱۸۸۵ء کو پنجاب گورنمنٹ گزٹ میں شائع ہوئی۔

گورنر پنجاب کی قرارداد مورخہ ۸ر نومبر ۱۸۸۴ء کے چھٹے پیراگراف میں دی گئی ہدایات کے مطابق پبلک لائبریری کمیٹی نے قواعد کا مسودہ بھی ترتیب دیا۔ کمیٹی کی دوسری میٹنگ منعقدہ ۲۷ر اپریل ۱۸۸۵ء میں فیصلہ کیا گیا کہ کمیٹی کے بنائے ہوئے قواعد (۱) قواعد لائبریری (۲) قواعد ریڈنگ روم (۳) کتاب کی مستعاری کے قواعد اور (۴) قواعد برائے لائبریری کمیٹی کو حکومت پنجاب کی منظوری کے لیے پیش کیا جائے۔ سیکرٹری حکومت پنجاب نے اپنی چٹھی مورخہ ۱۱ر مئی ۱۸۸۵ء میں پبلک لائبریری کے پراسپیکٹس اور قواعد کی سرکاری منظوری دی[۸]۔ منظوری کے بعد پراسپیکٹس اور قواعد، پنجاب گورنمنٹ گزٹ میں ۲۸ر مئی ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئے[۹] جو درج ذیل ہیں:۔

مینجمنٹ کمیٹی:

لیفٹیننٹ کرنل ای جی ویلس فنانشل کمشنر پنجاب — صدر

ممبران:

۱۔ سیکرٹری، حکومت پنجاب

۲۔ ڈی سی جے ابٹسن، ڈائریکٹر، پبلک انسٹرکشن، پنجاب

۳۔ ای ڈبلیو پارکر، ڈسٹرکٹ جج، لاہور

۴۔ایس ویلر، ایڈیٹر سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور

۵۔پنڈت رام نرائن، پلیڈر چیف کورٹ، پنجاب

۶۔جے۔لاک وڈ کپلنگ، پرنسپل، میوسکول آف آرٹ، لاہور

۷۔سی بی برنڈ، اسسٹنٹ کمشنر، لاہور (سیکرٹری کمیٹی)

قواعد لائبریری:

☆ یہ ادارہ حکومت پنجاب کی منشا اور مدد سے قائم کیا گیا ہے تا کہ صوبے کے تمام طبقوں کے استعمال کے لیے ایک عام کتب خانہ فراہم کیا جائے۔ ریڈنگ روم میں داخلہ مفت ہوگا اور حسب قواعد چندہ ادا کر کے کتب مستعار لی جائیں گی، جس کا فیصلہ بعد از درخواست بنام لائبریرین ہوگا۔

☆ حکومت نے ایک بڑی تعداد میں کتب اور مالی امداد کی فراہمی کا وعدہ کیا ہے، لیکن کمیٹی عوام سے پرخلوص درخواست کرتی ہے کہ وہ مشرقی اور مغربی علوم پر مشتمل کتابیں عنایت کریں۔

☆ بیس (۲۰) یا اس سے زائد کتابیں بطور عطیہ دینے والوں کو مراعات دی جائیں گی۔

☆ جب تک لائبریری کا باقاعدہ افتتاح نہیں ہو جاتا، معیاری کتب کا ایسا غیر سرکاری عطیہ جسے کمیٹی تسلیم کرے اور اس کی حیثیت کا تخمینہ پچاس روپے سے کم نہ جانچے تو عطیہ دینے والے کو لائف ممبر جیسی مراعات حاصل ہوں گی۔ اسی حیثیت کے برابر ایک اور عطیہ دینے والے کو ایک لائف ممبر نامزد کرنے کا اختیار ہوگا۔

☆ لائف ممبر سیکورٹی کی رقم، سالانہ چندہ اور فیس ادا کرنے سے مستثنیٰ ہوگا جو عام طور پر قواعد کے مطابق درکار ہے۔ خصوصاً ہندوستان اور مشرق کے حوالے سے ایک مکمل مجموعہ کتب کو محفوظ کرنے میں معاونت کی تمنا ہے۔ انجمنوں، اداروں اور سرکاری محکموں کو دستگیری کی درخواست ہے۔

☆ کتابوں کا عطیہ دینے والے اپنے عطیات اس شرط پر دے سکتے ہیں کہ ان کے سوا کوئی دوسرا ان کی کوئی کتاب مستعار نہیں لے سکتا۔

☆ خط و کتابت بنام سیکرٹری پنجاب پبلک لائبریری لاہور ہونی چاہیے۔

قواعد ریڈنگ روم:

☆ ریڈنگ روم عوام کے لیے بلا معاوضہ کھلا ہے۔

☆ لائبریرین کی اجازت کے بغیر کوئی بھی شخص کتابوں کو شیلفوں سے ہٹا نہیں سکتا۔

☆ کیٹلاگ اور حصول کتب کے لیے درخواست فارم میز پر دستیاب ہیں۔ لائبریرین کوئی بھی کتاب واپس لے سکے گا، خواہ اس کتاب کے لیے حصول کتب کا فارم اس کے حوالے کیا گیا ہو اور رخصت ہونے سے پہلے تمام کتابیں لائبریرین کو ضرور واپس کر دی جائیں۔

☆ کمیٹی کسی بھی شخص کو عمارت سے باہر نکال سکتی ہے، جو قواعد کی خلاف ورزی اور لائبریری کی املاک کو نقصان پہنچانے کا مرتکب پایا جائے۔

☆ تعطیل کے ایام: ملکہ برطانیہ کی سالگرہ، یکم تا سات اکتوبر اور یکم تا سات اپریل۔

☆ اوقات کار: سرما میں صبح ۸ تا دوپہر اور ۳ بجے سہ پہر تا ۱۰ بجے رات تک اور موسم گرما میں صبح ۶ تا ۱۰ بجے تک اور شام ۲ بجے تا ۱۰ بجے رات تک۔

کتب مستعار لینے کے قواعد:

کتابیں درج ذیل شرائط پر جاری کی جائیں گی:۔

۱۔ درخواست گزار کا مبلغ -/۱۰ روپے سیکرٹری کے پاس جمع کرانا لازمی ہوگا۔ کتابوں کو نقصان پہنچانے اور گم ہونے یا کسی قاعدے کی خلاف ورزی کی صورت میں یہ رقم قابل ضبط ہوگی۔

۲۔ مبلغ -/۵ روپے بطور سالانہ چندہ پیشگی جمع کرانا لازمی ہوگا جو کہ مبلغ -/۲۵ روپے عطیہ دینے کی صورت میں آئندہ طلب نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ ایک چندہ گزار کو ۲ جلدوں سے زائد کتب مستعار لینے کی اجازت نہیں ہوگی۔

۴۔ لاہور اور میاں میر کے رہائشی مستعار لی گئی کتابوں کو ۲۰ یوم کے اندر واپس کریں گے۔ اور دوسرے علاقوں کے رہائشیوں کو مزید ۱۰ یوم کی اجازت ہوگی۔ مستعار لی گئی تمام کتابیں ہر سال ۳۰ ستمبر اور ۳۱ مارچ تک لازماً واپس کر دینا ہوں گی۔

۵۔ کتابیں بھجوانے کے اخراجات بذریعہ وی پی پی (ویلیو پے ایبل پوسٹ) بھیج کر موصول کیے جائیں گے۔ قاعدہ نمبرا اور ۲ کے تحت مطلوب ادائی بھی شامل کی جا سکتی ہے۔

۶۔ کتابیں ایک شخص سے دوسرے تک منتقل نہیں ہو سکتیں۔

۷۔ ان قواعد کے تحت کمیٹی کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق نئی یا قیمتی کتابوں کو جاری کرنے سے انکار کر دے۔

۸۔ حصول کتب کے لیے درخواست فارم مہیا کیے جا سکتے ہیں اور ان کے استعمال کی درخواست ہے، لیکن یہ کوئی پابندی تصور نہیں ہوگی۔ قاعدہ نمبرا کے تحت جمع کرائی ہوئی رقم (اگر کوئی کلیم نہ ہو تو) اس شخص کو واپس کر دی جائے گی، جس کے ذمے لائبریری کی کوئی کتاب نہیں ہوگی۔

قواعد کمیٹی:

کمیٹی ۱۴ ارکان سے کم نہیں ہوگی جن میں صدر اور سیکرٹری بھی شامل ہیں۔ ڈپٹی کمشنر لاہور اور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن بلحاظ عہدہ کمیٹی کے رکن ہوں گے۔ بلدیہ لاہور، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے بشپ، کمیٹی لاہور اینڈ میاں میر انسٹی ٹیوٹ اپنا ایک ایک رکن نامزد کریں گے۔ باقی اراکین کو حکومت نامزد کرے گی اور صدر کا تقرر بھی وہی کرے گی۔

☆ کمیٹی اپنا سیکرٹری خود مقرر کرے گی۔

☆ دو اراکین اور ایک سیکرٹری پر مشتمل ایک اسٹینڈنگ سب کمیٹی انتظامات چلانے کے لیے مقرر کی جائے گی۔

☆ کمیٹی کا اجلاس ہر ماہ کے پہلے پیر کے روز منعقد ہوگا۔

☆ کورم بنانے کے لیے ۵ اراکین ضروری ہوں گے۔

☆ صدر یا سب کمیٹی ایک ہفتے کے نوٹس پر کمیٹی کا خاص اجلاس بلا سکتے ہیں۔

☆ کمیٹی کے موجودہ کام میں جسے وہ ہر ماہوار اجلاس میں پیش کرے گی، بشمول حساب کی جانچ پڑتال، کتابوں کی تجاویز، کتب فروشوں کے لیے احکامات اور قواعد کی خلاف ورزی کے معاملات وغیرہ شامل ہوں گے۔

☆ حسابات بنک آف بنگال میں رکھے جائیں گے یا حکومت کے حسب منشاء۔ تمام چیکوں پر سیکرٹری اور سب کمیٹی کے ایک رکن کے دستخط ہونا ضروری ہوں گے۔

پبلک لائبریری کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۵/اکتوبر ۱۸۸۵ء میں طے کیا گیا کہ لائبریری کے قواعد کو اردو، ہندی اور گرمکھی میں ترجمہ کر کے صوبے میں چھپنے والے مقامی زبانوں کے تمام اہم اخبارات میں تین تین بار چھاپا جائے[10]۔ ۳۱/دسمبر ۱۸۸۵ء کو پبلک لائبریری کے باقاعدہ افتتاح کے بعد لائبریری کمیٹی کا اجلاس ۱۸/جنوری ۱۸۸۶ء کو منعقد ہوا۔ اسی اجلاس میں نافذ العمل قواعد میں ضروری ترامیم منظور کی گئیں اور فیصلہ کیا گیا کہ ترمیم شدہ قواعد کو شائع کر دیا جائے[11]۔ ترمیم شدہ قواعد پنجاب گورنمنٹ گزٹ میں ۱۸/فروری ۱۸۸۶ء کو شائع ہوئے۔ کمیٹی سے متعلق قواعد میں درج ذیل ترامیم واضافے کیے گئے۔

قواعد کمیٹی کے عنوان کو اضافے کے ساتھ ''قواعد کمیٹی اور دستور'' کر دیا گیا۔ نافذ العمل قواعد میں ۹ نئے قاعدے شامل کیے گئے جو یہ تھے:۔

☆ کمیٹی، اسٹینڈنگ سب کمیٹیوں کا تقرر کرے گی اور لائبریری کے مختلف شعبوں کا انتظام چلائے گی۔

☆ سیکرٹری تمام سب کمیٹیوں کا رکن ہوگا۔

☆ لائف ممبر اور کمیٹی کا عمومی اجلاس سال میں ایک بار ماہ دسمبر میں منعقد ہوگا اور اجلاس میں دو سالانہ ممبران کا انتخاب ہوگا جو لائف ممبران کی نمائندگی کریں گے، الیکشن میں غیر حاضر لائف ممبران اپنے ووٹ کا استعمال بذریعہ مختار (Proxy) کر سکتے ہیں۔

☆ فنڈز پنجاب پبلک لائبریری کے نام پر بینک آف بنگال میں رکھے جائیں گے یا کمیٹی کی وقتاً فوقتاً ہدایات کے بموجب۔

☆ تمام چیکوں پر سیکرٹری اور کمیٹی کا مقرر کردہ ایک ممبر دستخط کرے گا۔

☆ طے شدہ اخراجات کے مطابق خرچ، جس کی منظوری پہلے سے حاصل ہو، اور اتفاقی اخراجات، جن کی حد پچاس روپے ماہانہ تک ہو، ان اشخاص کے مشترکہ اختیارات کے تحت کیے جا سکتے ہیں، جو چیکوں پر دستخط کرنے کے مجاز ہیں۔

☆ مبلغ ۱۰۰/روپے یا زائد رقم کا عطیہ یا کمیٹی کی قبول کردہ کتابیں جن کی قدر و قیمت ۱۰۰/روپے سے کم نہ ہو تو عطیہ دینے والا لائف ممبر کی مراعات کا مستحق ہوگا۔

☆ لائف ممبران سیکورٹی کی رقم، سالانہ چندہ اور قواعد کے تحت دیگر ضروری فیسوں سے مستثنیٰ ہوں گے۔

قواعد ریڈنگ روم میں لائبریری کے اوقات کار بھی تبدیل کر دیے گئے۔ نئے اوقات کار کے مطابق لائبریری موسم سرما میں صبح ۱۰ بجے تا دوپہر اور شام ۴ بجے تا ۷ بجے تک کھلی رہے گی۔ جبکہ موسم گرما میں لائبریری صبح ۶ تا ۱۰ بجے تک اور شام ۴ تا رات ۱۰ بجے تک کھلا کرے گی۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس وقت فروغ علم کے جذبے کے تحت لائبریری اتوار کو بھی کھلتی تھی۔ اتوار کے روز لائبریری کے اوقات کار دوپہر ۲ بجے سے شام ۵ بجے تک تھے[12]۔

پنجاب پبلک لائبریری کی اولین کمیٹی بشمول صدر ۶ ممبران پر مشتمل تھی[13]۔ نومبر ۱۸۸۲ء کی قرارداد میں کمیٹی کو اپنے ممبروں کی تعداد بڑھانے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس بنا پر کمیٹی کے ممبران کی تعداد میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہا۔ ڈپٹی کمشنر لاہور اور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کو بلحاظ عہدہ کمیٹی کا رکن بنایا گیا۔ جولائی ۱۸۸۷ء تک مختلف اوقات میں جان لاک وڈ کپلنگ[14]، پنڈت نریندر ناتھ، سی ایم پٹر، ڈاکٹر ڈبلیو پی ڈکسن، جے ای جلفن، رائے بہادر کنہیا لال، رائے بہادر برج لال گوش، پنڈت امرناتھ، بابو پرتل چندر چیٹرجی، شیخ نانک بخش، ڈاکٹر ٹی ای جی براؤن، پروفیسر ٹی سی لیویز اور ڈاکٹر سی آر سٹینگل کمیٹی کے نئے رکن بنائے گئے۔[15]

سیکرٹری پنجاب پبلک لائبریری کمیٹی نے ۱۷/جون ۱۸۸۵ء کی چٹھی بنام سیکرٹری حکومت پنجاب نے حکومت کی توجہ کمیٹی کی ایک قرارداد کی طرف دلاتے ہوئے درخواست کی کہ سوسائٹیز ایکٹ xxi، ۱۸۶۰ء کے تحت پنجاب پبلک لائبریری کو قانونی تحفظ دینے، حسابات احسن طریقے سے چلانے اور نظم ونسق کے حوالے سے درپیش مسائل کو دور کرنے کے لیے اسے بطور ادبی سوسائٹی رجسٹر کرانے کی اجازت دی جائے۔ اس خط کے جواب میں سیکرٹری حکومت پنجاب نے لکھا کہ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو لائبریری کے ادبی سوسائٹی کے طور پر رجسٹر کیے جانے پر کوئی اعتراض نہیں، بشرطیکہ ۱۸۶۰ء کے ایکٹ کے تحت ایک میمورنڈم آف ایسوسی ایشن، حکومت کی منظوری سے تیار کیا جائے، جس میں اس بات کی صراحت کی جائے کہ لائبریری کی بیشتر جائداد حکومت پنجاب کی ملکیت ہے تاکہ حکومت کے حقوق ومفادات کو میمورنڈم آف ایسوسی ایشن میں مکمل تحفظ حاصل ہو سکے۔[16]

لائبریری کمیٹی نے ۵/اکتوبر ۱۸۸۵ء کو گورنر پنجاب کی ہدایت کے پیش نظر ایک ذیلی کمیٹی تشکیل دی، جس کے اراکین میں پنڈت رام نراین (جج چیف کورٹ) اور مسٹر پارکر (ڈسٹرکٹ جج) شامل تھے[17]۔ اس ذیلی کمیٹی نے میمورنڈم تیار کر کے ۱۸/جنوری ۱۸۸۶ء کو لائبریری کمیٹی سے منظوری حاصل کی اور ۳/مئی ۱۸۸۶ء کو حکومت سے لائبریری کو بطور ادبی سوسائٹی رجسٹر کرنے کی درخواست کی گئی۔[18]

لاہور میوزیم کی عمارت کے ساتھ واقع بارہ دری وزیر خان کو شاہ جہاں کے عہد میں تعمیر کیا گیا تھا۔ سکھ عہد حکومت (۱۸۴۹ء۔۱۷۹۹ء) میں چوبرجی بارہ دری وزیر خاں کا علاقہ انارکلی چھاؤنی کہلاتا تھا۔ یہ چھاؤنی سکھ فوج کے ایک یورپی جرنیل وینٹورا کے زیر انتظام تھی اس کا ذاتی گھر جس میں وہ رہائش پذیر رہا، سول سیکرٹریٹ کی وہ عمارت ہے، جہاں اب چیف سیکرٹری حکومت پنجاب کا دفتر قائم ہے۔ پنجاب پر انگریزوں کے قبضے (۱۸۴۹ء) کے بعد اس عمارت کو مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ سب سے پہلے اسے فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا، پھر یہاں سیٹلمنٹ آفس قائم ہوا۔ لاہور کا پہلا نیلی گراف آفس بھی اسی عمارت میں بنا، جو بعد ازاں یہاں سے سیکرٹریٹ کے احاطے میں منتقل ہو گیا۔ ۱۸۵۶ء میں لاہور کے سنٹرل میوزیم کا آغاز بھی اسی عمارت میں ہوا۔ سنٹرل میوزیم لاہور ۱۸۶۷ء میں یہاں سے ایگزیبشن بلڈنگ، جو اب ٹولنٹن مارکیٹ کے نام سے مشہور ہے، میں منتقل ہوا اور پھر ۱۸۹۳ء سے اپنی نئی عمارت میں کام کر رہا ہے۔ میوزیم کے چلے جانے سے جب چوبرجی بارہ دری کی عمارت خالی ہوئی تو یہاں انارکلی لائبریری وریڈنگ روم کو منتقل کر دیا گیا[19] جو ۱۸۵۸ء سے سول سیکرٹریٹ میں موجود تھی۔ ۱۸۷۸ء میں انارکلی لائبریری لارنس ومنٹگمری ہالوں میں منتقل ہو گئی، اس کا نیا نام لاہور اینڈ میاں میر انسٹی ٹیوٹ رکھا گیا۔ یہی لاہور اینڈ میاں میر انسٹی ٹیوٹ ۱۹۰۶ء میں لاہور جم خانہ کلب بنا۔

۱۸۷۸ء میں انارکلی لائبریری اینڈ ریڈنگ روم کے جانے سے جب چوبرجی بارہ دری وزیر خاں کی عمارت خالی ہوئی تو

حکومت پنجاب نے یہاں ایک سنٹرل ریفرنس لائبریری بنانے کا منصوبہ ترتیب دیا۔ اسے سول سیکرٹریٹ لائبریری اور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن آفس کی لائبریری کو اکٹھا کر کے بنانا تھا، مگر کسی وجہ سے یہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ اس طرح چوبرجی کی یہ عمارت ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۹ء تک خالی پڑی رہی۔۲۰

جان لاک وڈ کپلنگ جو لائبریری کمیٹی کے رکن تھے۔ انہوں نے ۱۶ر دسمبر ۱۸۸۴ء کو تجویز پیش کی کہ پبلک لائبریری چوبرجی بارہ دری وزیر خاں کی عمارت میں قائم کی جائے۔ چنانچہ کمشنر لاہور ڈویژن نے ۱۸ر دسمبر ۱۸۸۴ء کو پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کو حکم دیا کہ وہ چوبرجی بارہ دری وزیر خاں کی عمارت کو پنجاب پبلک لائبریری کمیٹی کے حوالے کرے اور ساتھ ہی صدر پبلک لائبریری کمیٹی کو کہا کہ وہ عمارت کا قبضہ حاصل کر لیں ۲۱۔ پبلک لائبریری کمیٹی نے عمارت کا قبضہ حاصل کرنے کے بعد اس کی ضروری مرمت و آرائش کا کام شروع کر دیا۔ لائبریری کے لیے بک شیلف بنانے کے لیے ڈیزائن کی منظوری ۲۷ر اپریل ۱۸۸۵ء کو دی گئی۔ یہ بک شیلف ریلوے ورکشاپ لاہور سے تیار کرائے گئے ۲۲۔ میزیں اور شیلف حاصل کرنے پر کل چھ سو روپے خرچ ہوئے۔ پنجاب پبلک لائبریری کے کچھ مزید بک شیلف اور الماریاں میسرز روبسن اینڈ کمپنی سے بنوائی گئیں، جن پر ایک ہزار روپے کی لاگت آئی۔۲۳

لائبریری کمیٹی نے ۴ر نومبر ۱۸۸۵ء میں کمیٹی کے صدر کو اختیار دیا کہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے علم الحساب کے ماہر پروفیسر لیوئز کو مبلغ سو روپے اعزازیہ پر لائبریری کا نظم و نسق سنبھالنے اور کیٹلاگ سازی کی نگرانی کرنے کی درخواست کریں۔ اس لیے کہ پبلک لائبریری کو لائبریری کے نظم و نسق اور نگرانی کے لیے ایک ایسے قابل افسر کی ضرورت تھی، جو اپنا کچھ وقت لائبریری کو دے سکے اور فوراً لائبریری کیٹلاگ کی چھپائی کے کام کو ذمہ داری سے پورا کرے، کیونکہ اس وقت لائبریری کا کوئی بھی ملازم ایسی علمی قابلیت اور صلاحیت نہیں رکھتا تھا کہ وہ کیٹلاگ کی تیاری اور کتابوں کو مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دینے کے قابل ہو ۲۴۔ اس لیے ایک قابل اور اہل شخص کی نگرانی ضروری تھی۔ کمیٹی نے لائبریری کے مالی معاملات کی نگرانی بھی مسٹر لیوئز کو سونپ دی، کیونکہ مسٹر پارکر جو مالی معاملات کے نگران تھے، رخصت پر جا چکے تھے۔ لہٰذا حکومت پنجاب سے مسٹر لیوئز کی بطور ممبر منظوری حاصل ہونے پر انہیں مسٹر پارکر کی جگہ ایگزیکٹو کمیٹی کا عارضی ممبر مقرر کر دیا گیا ۲۵۔

لائبریری کے لیے موزوں شخص کی خدمات حاصل کرنے کے بعد اب لائبریری کمیٹی کے لیے کتابوں کا حصول ایک اہم کام تھا۔ لائبریری کمیٹی نے علم دوست حضرات، سرکاری افسران، مختلف محکموں اور ادبی و سماجی انجمنوں سے درخواست کی کہ وہ لائبریری کی امداد کے طور پر کتابیں بھیجیں۔ اس درخواست کے جواب میں مقامی افراد، سرکاری افسران، ریاستوں کے رؤسا، حکومت پنجاب اور حکومت ہند کے مختلف محکمہ جات نے دل کھول کر کتابوں کا عطیہ دیا۔ مقامی اور یورپی افراد نے نقد رقوم بھی بطور عطیہ لائبریری کو دیں۔ عطیہ کی مد میں حاصل کی گئی کتب کے علاوہ لائبریری نے اپنے خرچ سے بھی مشرقی اور مغربی علوم کا ایک وسیع ذخیرہ کتب مقامی طور پر خریدنے کے ساتھ ساتھ یورپی علوم کی کتابیں براہ راست انگلستان سے بھی خریدیں۔۲۶

پبلک لائبریری نے لاہور اینڈ میاں میر انسٹی ٹیوٹ، جو لارنس اور منٹگمری ہالوں کی عمارت میں قائم تھا، سے بھی کثیر تعداد میں کتابیں خریدیں۔ پبلک لائبریری کی کمیٹی نے ۲۹ر مئی ۱۸۸۵ء کو سب کمیٹی کو اختیار دیا کہ وہ لاہور اینڈ میاں میر انسٹی ٹیوٹ سے معیاری کتب خریدے۔ کمیٹی نے مسٹر اے ایم کیئر (Ker) کو پبلک لائبریری کا نمائندہ منتخب کیا تا کہ وہ انسٹی ٹیوٹ میں کمیٹی کی نمائندگی کر سکیں۔ انہیں لائبریری کے لیے ایک ہزار کی کتب خریدنے کا اختیار دیا گیا۔۲۷

سیکرٹری حکومت پنجاب نے وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے عطیات کی صورت میں ۱۸۸۵ء کے اختتام تک پانچ سو سے زائد کتب بھجوائیں۔ حکومت ہند نے بھی پبلک لائبریری کو مختلف اوقات میں کتابیں بھجوائیں۔ حکومت ہند کی طرف سے موصول ہونے والا ۴۰۱ کتابوں پر مشتمل تحفہ حکومت پنجاب نے ۲۷ر نومبر ۱۸۸۵ء کو پبلک لائبریری کے حوالے کیا ۲۸۔ لائبریری کی اپیل پر افتتاح سے قبل بڑی تعداد میں عطیات موصول ہوئے۔ جن میں مقامی و یورپی افراد اور مختلف سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی طرف سے دیئے گئے عطیات شامل ہیں۔ ان میں سے چند اہم عطیات درج ذیل ہیں:۔

پنڈت جوالہ پرشاد	:	۱۲۵ کتابیں
رائے بہادر کنہیالال	:	۷۷ کتابیں
ای جی ویس	:	۳۱ کتابیں
مسٹر اینڈ مسز گولڈزبری	:	۹۴ کتابیں
ڈاکٹر جے اونیل	:	۹۹ کتابیں
منشی ہرسکھ رائے	:	۱۲۰ کتابیں
مسٹر گولڈسٹریم	:	۲۶ کتابیں
مسٹر جے سی ایٹن	:	۲۷۰ کتابیں مع ۱۰ نقشے ۲۹

بنگال سول سروس کے ایک مرحوم افسر مسٹر ٹی ڈبلیو ایچ ٹولبرٹ ۳۰ کے انتقال کے بعد ان کی ذاتی لائبریری، جو اس وقت انبالہ میں تھی، ان کی وصیت کے مطابق پنجاب حکومت کے حوالے کی گئی۔ اس لائبریری میں کل ۱۰۱۹ نادر و نایاب کتب تھیں۔ حکومت پنجاب نے اس لائبریری سے ۱۶۲ کتابوں کا عطیہ پنجاب پبلک لائبریری کو دیا۔ پبلک لائبریری کے کلرک رام لال نے ۲۴ر جنوری ۱۸۸۵ء کو یہ کتابیں سیکرٹریٹ سے وصول کیں ۳۱۔ سیکرٹری کمیٹی مسٹر سی بی برنڈ نے عطیہ فراہم کرنے کے سلسلے میں ۲۷ر اپریل ۱۸۸۵ء کو کمیٹی کی جانب سے گورنر پنجاب کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے گورنر کو اطلاع دی کہ ان کتابوں کا الگ کیٹلاگ تیار کر دیا گیا ہے اور سرکاری ہدایت کے مطابق انہیں نشان زد کر کے الگ طور پر نمایاں جگہ پر بھی رکھ دیا گیا ہے ۳۲۔ تاہم ۲ر اکتوبر ۱۸۸۵ء کو ٹولبرٹ لائبریری کے حوالے سے کمیٹی نے حکومت پنجاب سے درخواست کی کہ لائبریری کمیٹی کو اجازت دی جائے کہ ٹولبرٹ لائبریری کی کتب کو الگ رکھنے کی بجائے جنرل کیٹلاگ میں شامل کر دیا جائے، کیونکہ عطیات کو اس شرط پر قبول کرنے سے کہ انہیں جنرل کیٹلاگ سے الگ رکھا جائے، سے عملی طور پر مشکلات کا سامنا تھا ۳۳۔ مختصر یہ کہ لائبریری کمیٹی اپنی کوششوں میں کامیاب رہی۔

لائبریری کے باقاعدہ افتتاح سے قبل مختلف ذرائع سے پچیس ہزار کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔ کمیٹی نے لائبریری کے لیے کیٹلاگ کی تیاری اور کتب کو مجلد کرنے کا کام شروع کر دیا۔ انگلش سیکشن کی کتابوں کا ایک کیٹلاگ عنوانات کے تحت اور دوسرا حروف تہجی کے مطابق تیار کر کے چھاپا گیا۔ ۵ر اکتوبر ۱۸۸۵ء کو مسٹر پوپ اور مسٹر ویلر کو عناواتی کیٹلاگ تیار کرنے کے لیے مبلغ ۱۰۰ روپے ماہوار پر تعینات کیا گیا تھا ۳۴۔ عنوانات کے تحت چھپنے والا انگریزی کتابوں کا کیٹلاگ ایک روپے فی جلد کے حساب سے خریدا جا سکتا تھا ۳۵۔ مختلف دیسی زبانوں کے کیٹلاگ منشی گلاب سنگھ کی معرفت چھپوائے گئے۔۳۶

لائبریری کمیٹی نے ۵ر اکتوبر ۱۸۸۵ء کو فیصلہ کیا کہ ایگزیکٹو کمیٹی صدر کمیٹی کے ساتھ مل کر لائبریری کے جلد از جلد افتتاح

کے متعلق تجاویز تیار کرے اور لائبریری کو عوام کے لیے کھولنے کی افتتاحی تقریب یکم دسمبر ۱۸۸۵ء تک طے پا جائے، تاہم ایسا نہ ہو سکا چنانچہ ۷ر دسمبر ۱۸۸۵ء کو کمیٹی کے اجلاس میں لائبریری کے افتتاح کا موضوع ایک مرتبہ پھر زیر بحث آیا۔ اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب چارلس ایچی سن کو درخواست کی جائے کہ وہ ۳۱ر دسمبر ۱۸۸۵ء کو عوام کے لیے لائبریری کھولنے کا اعلان کریں۔ افتتاحی تقریب کے انتظامات کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی بھی تشکیل دی گئی، جس کے اراکین میں مسٹر ولیر، مسٹر لیوپز، مسٹر کپلنگ، رائے بہادر کنہیالال، پنڈت امرناتھ (سیکرٹری) شامل تھے۳۷۔ کمیٹی کے ذمے عمارت کی ضروری تزئین و آرائش، افتتاحی پروگرام کی ترتیب، گورنر کے خطاب اور مہمانوں کے لیے دعوت ناموں کی تیاری جیسے امور شامل تھے۔

جب لائبریری کے قیام کے ابتدائی مراحل طے پا گئے، یعنی لائبریری عوامی خدمت انجام دینے کے قابل بن گئی، تو گورنر پنجاب سر چارلس ایچی سن ۳۱ر دسمبر ۱۸۸۵ء کو مغلیہ دور کی تاریخی عمارت چوبرجی بارہ دری وزیر خاں تشریف لائے اور پنجاب پبلک لائبریری کا باقاعدہ افتتاح کر کے اسے عوام الناس کے لیے کھول دیا۔ لائبریری کے افتتاح کے موقع پر اس امر کا اقرار کیا گیا کہ لائبریری کے لیے سرکاری اداروں، یورپی اور مقامی افراد کی جانب سے بہت بڑا ذخیرہ کتب بذریعہ عطیہ جمع ہوا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ لائبریری کے لیے حکومت پنجاب کی جانب سے تین سو روپے ماہوار کی گرانٹ اور پچاس روپے ماہوار کی گرانٹ میونسپل کارپوریشن، لاہور کی طرف سے جاری کی گئی ہے۔ اس موقع پر یہ امید ظاہر کی گئی کہ مناسب اقدامات کی بدولت پنجاب پبلک لائبریری صوبے میں کتابوں کی ایک عمدہ ''ذخیرہ گاہ'' بن جائے گی۔ جو نہ صرف ان قارئین کی ضروریات کو پورا کرے گی، جن کو لاہور اینڈ میاں میر انسٹی ٹیوٹ پورا کرنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا مشرقی اور مغربی علوم کی کتابوں پر کثیر رقم خرچ کرنے کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔

گورنر پنجاب سر چارلس ایچی سن نے اپنے خطاب میں لائبریری کے مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ میری تمنا ہے کہ اس لائبریری سے علوم وفنون کی شعاعیں نکل کر صوبہ کی ذہنی اور علمی ترقی کا باعث بنیں اور علم کے متلاشی جب اس میں قدم رکھیں تو تاریخ وادب اور سائنس کے وہ تمام مخزن جن کو وہ خود حاصل نہیں کر سکتے یہاں آسانی سے حاصل کر پائیں۔

گورنر پنجاب نے اپنے خطاب میں اس امید کا اظہار بھی کیا کہ رفتہ رفتہ اس ادارے کا حلقہ اثر وسیع ہوتا چلا جائے گا۔

گورنر پنجاب نے لائبریری کو عطیات دینے والوں کی خدمات کا اعتراف کر کے انہیں سرٹیفکیٹ بھی جاری کیے۔

لائبریری کے افتتاح کے موقع پر گورنر پنجاب کے خطاب کو دیسی زبانوں میں منتقل کر کے تقسیم کیا گیا۔ مقامی زبانوں میں چھاپے گئے پمفلٹوں کی کاپیاں اورینٹل کالج کے طلبا کے مطالعے کے لیے دی گئیں تاکہ وہ لائبریری سے بھرپور استفادہ کر سکیں۳۸۔

گورنر پنجاب چارلس ایچی سن نے لائبریری کے ریڈنگ روم کے لیے دو عدد بڑے سائز کے لیمپ بطور عطیہ دیے۳۹۔

لائبریری کے افتتاح کے بعد اس کی آرائش وسجاوٹ اور لائیٹنگ پر دو ہزار آٹھ سو روپے مزید خرچ کیے گئے۔۴۰

مارچ ۱۸۸۷ء تک لائبریری میں ذخیرہ کتب کی تعداد ۳۴۰۰۰ تک پہنچ گئی۔ جن میں انگریزی زبان کی بیس ہزار اور دیگر مقامی ومشرقی زبانوں میں کتب کی تعداد چودہ ہزار تھی۴۱۔

لائبریری کمیٹی نے کتابوں میں مزید اضافہ کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ کمیٹی نے ۲۵۲۸ روپے کی خطیر رقم سے ایک ہزار مزید نئی کتابیں خریدیں۔ اہل علم حضرات کی طرف سے کتب کے عطیات برابر ملتے رہے۔ لائبریری کو آٹھ ہزار مزید کتابیں بطور عطیہ موصول ہوئیں، جن میں آٹھ ہزار انگریزی اور ایک ہزار کتابیں مقامی زبانوں میں تھیں۔۴۲

حکومت پنجاب نے ۱۸۸۶ء میں سیکرٹریٹ لائبریری کے ذخیرہ کتب کا ایک بڑا حصہ پنجاب پبلک لائبریری کو دینے کا فیصلہ کیا۴۳۔ پبلک لائبریری کمیٹی نے ۵ر جولائی ۱۸۸۶ء کو حکومت پنجاب کی پیشکش کو قبول کرتے ہوئے درخواست کی کہ لائبریری کی عمارت کے کچھ کمروں کی اس وقت مرمت۴۴ وغیرہ کرائی جا رہی ہے، اس لیے اس پیش کش کو ایک ماہ یا اس وقت تک موخر کر دیا جائے، جب تک مرمت کا کام مکمل نہیں ہو جاتا۔ اس درخواست کے جواب میں حکومت پنجاب نے کہا کہ سیکرٹریٹ لائبریری کی کتابوں کو جلد از جلد لے جانے کے انتظامات کیے جائیں، کیونکہ یہاں سرکاری ریکارڈ رکھنے کے لیے مزید اضافی جگہ درکار ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ پبلک لائبریری کو دی جانے والی کتابیں یہاں سے ہٹا نہیں لی جاتیں۴۵۔ پنجاب پبلک لائبریری کمیٹی نے کمروں کی مرمت وغیرہ کا کام مکمل ہوتے ہی فوراً سیکرٹریٹ لائبریری کی کتابیں منگوا کر محفوظ کر لیں۔

۱۸۸۶ء میں سردار عطر سنگھ آف بھدوڑ نے اپنی نایاب اور نادر کتب کا ذخیرہ بعد از وفات چند شرائط پر پنجاب پبلک لائبریری کو دینے کی خواہش ظاہر کی۔ سردار عطر سنگھ کا خط، جس میں اس خواہش کا اظہار کیا گیا تھا، ڈپٹی کمشنر لدھیانہ نے کمشنر جالندھر ڈویژن کی وساطت سے ۱۶ر اگست ۱۸۸۶ء کو حکومت پنجاب کو بھجوایا۴۶۔ پنجاب پبلک لائبریری کمیٹی نے نومبر ۱۸۸۶ء میں سردار عطر سنگھ کی پیش کش کو قبول کرتے ہوئے حکومت پنجاب کو درخواست کی کہ وہ لائبریری کمیٹی کی جانب سے سردار عطر سنگھ کو نیک خواہشات اور شکریے کا پیغام بھجوا دیں۔۴۷

پبلک لائبریری کے لیے ایک گراں قدر عطیہ فقیر سید جمال الدین کا تھا۔ انہوں نے اپنا ذخیرہ کتب جس میں عربی کتب کے علاوہ نادر و نایاب نسخے بھی شامل تھے، لائبریری کو بطور عطیہ دیئے تھے۔ عطیات کی اہمیت کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمان شخصیات میں فقیر سید جمال الدین کے بعد عطیہ دینے والی دوسری اہم شخصیت سید محمد لطیف تھے۔ نواب نوازش علی خاں، مولوی فضل حسین اور منشی غلام نبی کی خدمات نمایاں تھیں، جو انہوں نے پنجاب پبلک لائبریری کی ترویج وترقی کے سلسلے میں کیں، مگر یہ بات قابل غور ہے کہ پبلک لائبریری کی تحریک میں حصہ لینے والے انگریزوں، ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ وجہ بظاہر مسلمانوں کا اعلیٰ تعلیم سے گریز کرنا اور اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے کنارہ کشی ہے۔ پنجاب میں اسکولوں کی سطح پر تو مسلمان بچوں کا تناسب ہندوؤں کے مقابلے میں قدرے بہتر تھا، مگر اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ ۱۸۸۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھنے والے طلبا میں صرف تین مسلمان تھے۴۸۔ محسوس ہوتا ہے کہ پنجاب کے مسلمان انگریزی علوم وفنون اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے گریز کرتے تھے اور دوسری طرف حکمران طبقہ بھی مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو زیادہ اہم سمجھتا تھا۔

پنجاب پبلک لائبریری کی مستقل آمدنی میں حکومت پنجاب کی جانب سے تین سو روپے اور بلدیہ لاہور کی طرف سے ۵۰ روپے ماہوار شامل تھے۔ لائبریری نے حکومت کی اجازت سے مزید مالی امداد کے لیے پنجاب کے تمام میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ یہ لائبریری پنجاب کے تمام حصوں میں بسنے والے لوگوں کے استعمال کے لیے قائم کی گئی ہے اور بلا معاوضہ استفادہ کرنے والے قارئین کی اکثریت طالب علموں کی ہے، جو صوبے بھر کے کونے کونے سے حصول علم کے لیے پنجاب یونیورسٹی آتے ہیں۔ اس التجا پر لدھیانہ، رہتک اور گوڑگاؤں کے ڈسٹرکٹ بورڈوں نے ۲۵۰ روپے اور بلدیہ ہوشیار پور نے ۲۵ روپے سالانہ امداد دینے کا وعدہ کیا۔۴۹

پنجاب پبلک لائبریری کے ذخیرہ کتب کی انشورنس بھی کرائی گئی تھی تاکہ ناگہانی صورت حال میں لائبریری کے نقصانات کی تلافی ہو سکے۔ ۱۹ر جولائی ۱۸۸۶ء کو کمیٹی کے اجلاس میں تمام کتابوں کی انشورنس کرانے کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اس اجلاس کی صدارت مسٹر ہالرائیڈ، ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب نے کی۔ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ کوئین انشورنس کمپنی سے لائبریری کتب کی انشورنس مالیتی بیس ہزار روپے تک کرائی جائے۔۵۰

پنجاب پبلک لائبریری کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۷ر فروری ۱۸۸۷ء میں سردار عطر سنگھ کی طرف سے بھیجی گئی تجاویز زیر غور آئیں۔ سردار عطر سنگھ آف بھدوڑ نے تجویز کیا تھا کہ لائبریری کو ''ایچی سن پنجاب لائبریری'' کے نام سے پکارا جائے۔ سرکاری افسران، امراء اور روساء پنجاب سے مالی امداد اور حمایت حاصل کی جائے۔ لائبریری کو انڈیا اور یورپ کی لائبریریوں کے ساتھ خط و کتابت کر کے سنسکرت، عربی اور فارسی کے کیٹلاگ، کتابیں اور مخطوطات حاصل کیے جائیں اور کوشش کی جائے کہ ان لائبریریوں میں موجود اہم اور مفید کتب کی نقول مل جائیں۔ نمبرداروں، ذیلداروں، تحصیلداروں، مقامی اور ضلعی بورڈوں کے ممبران اور میونسپل کمیٹیوں کو کہا جائے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں دستیاب لائبریریوں کی پرانی اور مفید کتب کے متعلق معلومات فراہم کریں۔ نایاب مخطوطات کو اکٹھا کرنے کی ذمہ داری لائبریری کو دی جائے اور اس کے ساتھ اس مقصد کے لیے سرکاری امداد فراہم کی جائے۔ پنجاب میں موجود میونسپل کارپوریشنوں کے تحت قائم کی جانے والی تمام لائبریریوں کو پنجاب پبلک لائبریری کی شاخیں قرار دیا جائے۵۱۔ لائبریری کی بہتری کے لیے کسی کتاب کے ایک سے زائد نسخوں کو تبدیل کیا جائے یا بیچ دیا جائے۔ لاہور میونسپل کارپوریشن کو کہا جائے کہ وہ لائبریری کے لیے فکسڈ گرانٹ مہیا کرے، کیونکہ یہ لائبریری اس کی حدود میں واقع ہے۔ اراکین کو لائبریری میں موجود نایاب اور پرانی کتابوں کی نقول کی فراہمی، نقل کے اخراجات ادا کرنے پر حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ لائبریری کی سالگرہ کا اجلاس انتہائی جوش و جذبے کے ساتھ منایا جائے اور تمام ممبران کو دعوت دی جائے۵۲۔

کمیٹی نے سردار عطر سنگھ کی صرف قابل عمل تجاویز پر عمل درآمد کا فیصلہ کیا اور سردار عطر سنگھ کو کمیٹی کی جانب سے شکریہ کی چٹھی لکھی۵۳۔ چنانچہ ۱۶ر فروری ۱۸۸۷ء میں پبلک لائبریری کی عمارت پر چراغاں کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے میونسپل کمیٹی لاہور سے دو ہزار چراغ اور تین من تیل حاصل کیا گیا۵۴۔ رات کو پنجاب پبلک لائبریری کی تاریخی عمارت کی سجاوٹ اور روشنیاں دیکھنے کے لیے پورا شہر امڈ آیا۔

پنجاب پبلک لائبریری کی پہلی سالگرہ کی تقریب ۲۸ر مارچ ۱۸۸۷ء کو منعقد ہوئی۔ اس موقع پر گورنر پنجاب سر چارلس ایچی سن کو مدعو کیا گیا۔ انہوں نے اس موقع پر اپنے خطاب میں کہا کہ جب میں نے ۱۵ ماہ قبل اس لائبریری کا افتتاح کیا تھا، تو میں نے وہ مقاصد یہاں بیان کیے تھے، جو اس ادارے کو فروغ دینے والوں کے مدنظر تھے۔ میں نے اس امید کا اظہار بھی کیا تھا کہ رفتہ رفتہ اس ادارے کا حلقہ اثر وسیع ہوتا جائے گا۔ مجھے یہ سن کر بے حد خوشی ہوئی ہے کہ لائبریری نے اپنے قیام کے تھوڑے عرصے میں بے حد مفید کام کیے ہیں۔ قارئین کی ایک بہت بڑی تعداد نے یہاں سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی تعداد ۲۲۵۸۴ ہے، جو کسی طور پر کم نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لائبریری نے قارئین کی حقیقی ضروریات کو پورا کیا ہے۔ میں خود بھی یہاں آ کر بھرپور استفادہ کر چکا ہوں۔ آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ کمیٹی نے اپنا کام نہایت عمدہ طریقے سے انجام دیا ہے اور وہ اپنی انتھک محنت کی بدولت ہم سب کی جانب سے شکریہ کی مستحق ہے۔ خاص طور پر مسٹر لیوز، شاید کمیٹی اپنے مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو پاتی اگر انہیں پنجاب میں رہنے والی ان شخصیات کی مدد اور اعانت حاصل نہ ہوتی، جنہوں نے صحیح معنوں میں ادبی اور علمی مضامین میں بھرپور دلچسپی ظاہر کی ہے۔ اس قسم کی تقریب (سالگرہ لائبریری) ایک ایسا موقع ہوتا ہے، جہاں عام طور پر مبارک بادیں اور تعریفی کلمات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ یہ قدرتی امر ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے، لیکن اگر ہم حقیقی معنوں میں خود کو کامیابی پر مبارک باد کا مستحق سمجھتے ہیں، تو اس بات کو تسلیم کرنا ہوگا کہ حاصل ہونے والی کامیابی ان مقاصد کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے، جنہیں ابھی پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ اس سلسلے میں لائبریری کمیٹی تعلیم یافتہ طبقات کی طرف سے بھرپور تعاون کی توقع رکھنے میں حق بجانب ہے۔۵۵

ہم نے اپنی لائبریری میں انگلستان کی معیاری کتب کا ایک وسیع ذخیرہ جمع کیا ہے۔ لیکن اگر پنجاب پبلک لائبریری نے صحیح معنوں میں اپنے نام کا حق ادا کرنا ہے، تو آپ سب کو اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھنا ہوگا، جب تک کہ ہمارے شیلف حقیقی معنوں میں ایسے مشرقی علوم کی کتب سے پر نہیں ہو جاتے، جو اس وسیع براعظم میں رہنے والی اقوام کی تاریخ، زبان، رسم و رواج اور حالات پر روشنی ڈالتی ہوں۔ یہی ذمہ داری ہے، جسے نبھانا ہماری علمی و ادبی شخصیات کا فریضہ ہے۔۵۶

پنجاب پبلک لائبریری کے پہلے باقاعدہ لائبریرین لالہ کرپا رام تھے۔ ان کی تقرری ۱۸۸۶ء میں عمل میں آئی۔ وہ تقریباً ۲۸ سال تک لائبریرین کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انہی کی مساعی سے ۱۸۹۹ء میں کتب خانے کی مفصل کیٹلاگ جو عنواناتی کے ساتھ ساتھ حروف تہجی کے اعتبار سے بھی تھی، پہلی بار شائع ہوئی۔ دیوان بہادر کنج بہاری اور ایم جی سنگھ نے بطور سیکرٹری کمیٹی، لائبریری کے لیے ذخیرہ کتب اور مالی وسائل کے حصول کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ ۱۹۳۹ء میں لائبریری کے لیے نئی عمارت ۵۷ کی تعمیر اور حصول ایم جی سنگھ کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا۔

لائبریری کے دوسرے لائبریرین لالہ لبھو رام ۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۱ء تک، مسٹر ودیا ساگر ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء تک اور لالہ رام لبھایا ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۷ء تک خدمات سرانجام دیتے رہے۔

قیام پاکستان کے بعد پنجاب پبلک لائبریری کے پہلے مسلم لائبریرین خواجہ نور الٰہی تھے۔ انہوں نے لائبریرین کی حیثیت سے ۱۹۶۶ء تک فرائض انجام دیے۔ شیخ ریاض الحق ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۹ء، مسٹر محمد ریاض ۱۹۷۹ء تا ۱۹۸۲ء، مسٹر محمد اسلم ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۸ء، سید مقصود علی کاظمی ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۴ء، حافظ خدا بخش ۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۵ء، سید مقصود علی کاظمی ۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۸ء (دوسری بار) اور حافظ خدا بخش ۱۹۹۸ء تا ۲۰۰۰ء (دوسری بار) چیف لائبریرین کے فرائض پورے کرتے رہے۵۸۔ ظل حسنین ۲۰۰۰ء تا ۳۰ر اکتوبر ۲۰۰۳ء چیف لائبریرین رہے ہیں۔ آج کل نصرت علی اثیر چیف لائبریرین ہیں وہ ۳۱ر اکتوبر ۲۰۰۳ء سے یہ فرائض انجام دے رہے ہیں۔

پنجاب پبلک لائبریری ایک طویل عرصے تک مغلیہ دور کی مشہور و معروف تاریخی عمارت چوبرجی بارہ دری وزیر خاں میں کام کرتی رہی۔ لائبریری میں مطالعاتی مواد بڑھنے کے پیش نظر زیر استعمال عمارت ناکافی تھی۔ اس لیے ریکارڈ سیکشن کی عمارت ۱۹۳۳ء میں بنائی گئی جو خستہ حالی کی بنا پر اب ''خطرناک عمارت'' قرار دی جا چکی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں چوبرجی بارہ دری وزیر خاں کے قریب جو نئی عمارت بنائی گئی، یہ لائبریری کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعمیر ہوئی۔ آج کل اسی عمارت کو پنجاب پبلک لائبریری کی حقیقی عمارت ہونے کا شرف حاصل ہے، جبکہ چوبرجی کی عمارت کو اب صرف اخبارات کے مطالعے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ پبلک لائبریری کی اس عمارت کا سنگ بنیاد میاں عبدالحی وزیر تعلیم پنجاب نے ۱۹ر مارچ ۱۹۳۹ء کو رکھا۔ لائبریری کی چوتھی عمارت بیت القرآن کی عمارت ہے، جسے ۱۹۶۸ء میں تعمیر کیا گیا۔ بیت القرآن کی توسیع اور تزئین کے لیے

لائبریری فاؤنڈیشن نے ۱۱۵ لاکھ روپے کا عطیہ دیا ہے۔ عمارت میں توسیع و تزئین کا کام مکمل ہو چکا ہے اور پی ڈبلیو ڈی نے تعمیراتی اور مرمتی کام کے بعد یہ عمارت لائبریری کے سپرد کر دی ہے۔ شعبہ بیت القرآن کو قارئین کے لیے ۳/ اکتوبر ۲۰۰۳ء سے کھول دیا گیا ہے۔

پنجاب پبلک لائبریری کے چار شعبہ جات ہیں، جن میں (۱) بیت القرآن (۲) شعبہ انگریزی (۳) شعبہ السنہ الشرقیہ اور (۴) شعبہ ریکارڈ شامل ہیں۔

شعبہ بیت القرآن میں قرآن پاک کے نادر و نایاب نسخوں اور علم القرآن سے متعلق ہر قسم کے مطالعاتی مواد کے ذخیرہ کو ایک چھت تلے اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ حوالہ جاتی شعبہ ہے اور کوئی کتاب مستعار نہیں لی جا سکتی۔ شعبہ انگریزی میں چیف لائبریرین کا آفس، اکاؤنٹ آفس، شعبہ حصول کتب، فنی شعبہ، انگریزی دارالمطالعہ، شعبہ سمعی و بصری معاونات، شعبہ مخطوطات، شعبہ کتب ہندی، گورمکھی و سنسکرت، شعبہ ذخیرہ جات خاص اور شعبہ جلد سازی شامل ہیں۔ شعبہ سمعی و بصری معاونات میں جدید مائیکرو فلمنگ ریڈر پرنٹر، مائیکرو فش ریڈر، اوور ہیڈ پروجیکٹر، سلائیڈ پروجیکٹر، وی سی آر، ٹی وی اور تمام متعلقہ ضروری آلات موجود ہیں۔ شعبہ السنہ الشرقیہ میں اردو، فارسی، عربی اور پنجابی زبانوں کی کتب کے علاوہ دیگر علاقائی زبانوں کی کتابیں بھی ہیں۔ ریکارڈ سیکشن کا کافی مواد شعبہ السنہ الشرقیہ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ شعبہ ریکارڈ کی عمارت قابل استعمال نہیں رہی۔ اس شعبے میں قدیم اخبارات، سرکاری رپورٹیں، سرکاری گزیٹرز، گورنمنٹ گزٹ اور رسائل و جرائد کی جلدیں محفوظ ہیں۔ قارئین کے لیے فوٹو کاپی کی سہولیات میسر ہیں، جو دستاویزات کی قدامت کے حساب سے طے شدہ قیمت ادا کر کے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

پنجاب پبلک لائبریری میں اس وقت تین لاکھ سے زائد کتب موجود ہیں۔ شعبہ السنہ الشرقیہ میں کتب کی تعداد تقریباً ایک لاکھ، شعبہ انگریزی میں تقریباً ایک لاکھ پچاس ہزار، شعبہ ریکارڈ میں تقریباً چالیس ہزار اور شعبہ اطفال میں بارہ ہزار ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی علوم کی کتب (جس میں ہندی، گورمکھی اور سنسکرت زبانوں کی کتب بھی شامل ہیں) کی تعداد گیارہ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ نجی ذخائر کے ذریعے جو کتب لائبریری کو بطور عطیہ موصول ہوئی ہیں، ان کی تعداد اٹھارہ ہزار کے قریب ہے۔ اس سلسلے میں رفعت سلطانہ ذخیرۂ کتب میں نو ہزار پانچ سو، مولانا محمد علی قصوری، ذخیرہ کتب میں ۲ ہزار چار سو، سید عبدالقادر ذخیرہ کتب میں ایک ہزار پانچ سو اور مولانا ممتاز علی ذخیرہ کتب میں دو ہزار نادر و نایاب کتابیں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں گیارہ سو کے قریب قلمی نسخے لائبریری کا قیمتی ترین اثاثہ ہیں۔ جن کی فہرستیں کئی جلدوں میں طبع ہو چکی ہیں۔ اس وقت لائبریری میں ایک سو پینسٹھ کے قریب انگریزی اور اردو زبانوں کے ملکی و غیر ملکی رسائل و اخبارات قارئین کے مطالعے کے لیے حاصل کیے جا رہے ہیں۔ ان اخبارات و رسائل کو جلد بندی کر کے محفوظ کر لیا جاتا ہے، تاکہ آئندہ انہیں حوالے کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

کتابوں کی خریداری، بک پرچیز کمیٹی کی سفارش پر ہوتی ہے جو مجلس منتظمہ کے اراکین پر مشتمل ہوتی ہے۔ چیف لائبریرین ایک معینہ حد تک کتابیں خریدنے کے مجاز ہیں۔ علم دوست حضرات اب بھی کتابوں کا عطیہ فراہم کر کے پبلک لائبریری کی قدیم روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ سال ۲۰۰۲ء میں ۱۸۵۷ کتب کا اضافہ ہوا۔ ان میں اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں کی کتابیں شامل ہیں۔ ان کتابوں میں [illegible] کتب بطور عطیہ لائبریری کو وصول ہوئیں، جبکہ صرف ۲۶۱ کتب لائبریری فنڈ سے خریدی گئیں۔[59]

پنجاب پبلک لائبریری کا نظم و نسق چلانے کے لیے نیا آئین حکومت پنجاب نے ۱۹۷۳ء میں منظور کیا تھا۔ پنجاب پبلک لائبریری کی موجودہ مجلس منتظمہ ۲۲ ارکان پر مشتمل ہے۔ سیکرٹری تعلیم حکومت پنجاب بلحاظ عہدہ مجلس کے صدر ہیں۔ باقی اراکین میں سرکاری افسران اور دوامی اراکین کے منتخب کردہ ۶ نمائندے، معروف دانشور اور سکالر شامل ہیں۔ پبلک لائبریری کے نظم و نسق کو چلانے کے لیے تین ذیلی کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں، جو مجلس منتظمہ کے اراکین پر مشتمل ہیں۔ ان میں ایگزیکٹو کمیٹی، فنانس کمیٹی اور بک پرچیز کمیٹی شامل ہیں۔ لائبریری آئین میں ہر کمیٹی کا دائرہ اختیار واضح کر دیا گیا ہے۔ لائبریری کا عملہ ۶۵ افراد پر مشتمل ہے۔ دارالمطالعہ میں تقریباً ۳۸۵ قارئین روزانہ لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ کتب مستعار لینے کے لیے ممبر شپ لینا ضروری ہے، جس کی چار اقسام ہیں۔ ان میں جنرل ممبر شپ، لائف ممبر شپ، اسٹوڈنٹ ممبر شپ اور چلڈرن ممبر شپ شامل ہیں۔[60] دارالمطالعہ میں بیٹھ کر کتب سے استفادے کے لیے ممبر شپ ضروری نہیں۔ قارئین کی ایک بڑی تعداد اس سہولت سے مستفید ہوتی ہے۔

لائبریری کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں ایک جدید کمپیوٹر لیب موجود ہو۔ جس میں قارئین کو انٹرنیٹ کی سہولت میسر ہو اسی طرح کیٹلاگ کو کمپیوٹر پر لانے کی بھی اشد ضرورت ہے اگر لائبریری کو اپنے قیام کے حقیقی مقاصد کے مطابق پورے صوبے کی نمائندہ لائبریری بنانا ہے تو مخیر حضرات کے علاوہ عوامی فلاحی اداروں، ضلعی حکومتوں اور حکومت پنجاب کو اس کی ضرورتوں پر خاص توجہ مرکوز کرنا ہوگی۔

موجودہ چیف لائبریرین نصرت علی اثیر لائبریری کا نظم و نسق چلا رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا وہ پروفیسر لیوبز کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ لائبریری کو حقیقی معنوں میں مخزن کتب بنانے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں۔

حواشی و تعلیقات

۱۔ محکمہ داخلہ، حکومت پنجاب، پروسیڈنگ نمبر ۲۹۔ اے، نومبر ۱۸۸۴ء، ص ۴۷۵

۲۔ سیکرٹری حکومت پنجاب نے دسمبر ۱۸۷۸ء میں تجویز کیا تھا کہ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن، پنجاب کی لائبریری اور سیکرٹریٹ لائبریری کو ملا کر ایک سرکاری حوالہ جاتی لائبریری پو برجی بارہ دری وزیر خاں کی عمارت میں قائم کی جائے۔ یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ گورنمنٹ بک ڈپو میں کام کرنے والے مترجم بھی اسی عمارت میں کام کریں گے اور صدر مترجم اس لائبریری کے نگران ہوں گے۔ گورنر پنجاب نے اس تجویز کو منظور بھی کر لیا تھا، مگر بوجوہ یہ لائبریری پو برجی بارہ دری وزیر خاں میں قائم نہ ہو سکی۔ یاد رہے کہ گورنمنٹ بک ڈپو اس وقت ٹولنٹن مارکیٹ کے سامنے فوجی کوٹھڑیوں جیسی ایک پرانی عمارت میں واقع تھا۔ اسی عمارت میں ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب اور انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کے دفاتر بھی تھے۔ اس پرانی عمارت کی جگہ ڈی پی آئی پنجاب کی نئی عمارت بنائی گئی، جو اب تک موجود ہے۔ اس سے قبل بک ڈپو کی عمارت اس مقام پر تھی جہاں اب نیشنل کالج آف آرٹس کی عمارت قائم ہے۔ اس عمارت کو ۱۸۶۴ء میں مسمار کر دیا گیا تھا۔

۳۔ محکمہ داخلہ، حکومت پنجاب، بی فائل نمبر ۲۰۵، مارچ ۱۸۸۵ء

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، لاہور، ۱۴ مئی ۱۸۸۵ء، ص ۵۳۹ تا ۵۴۰

۷۔ ایضاً، ص ۵۰۰

۸۔ محکمہ داخلہ، حکومت پنجاب، بی فائل نمبر ۹۴۔۹۲، جولائی ۱۸۸۵ء

۹۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، لاہور، ۲۸ مئی ۱۸۸۵ء، ص ۱۰۹۴

۱۰۔ ایضاً، ۲۲/اکتوبر ۱۸۸۵ء، ص ۱۰۹۴

۱۱۔ ایضاً، ۴/فروری ۱۸۸۶ء، ص ۱۶۷

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ محکمہ داخلہ، حکومت پنجاب، اے پروسیڈنگ نمبر ۲۹، نومبر ۱۸۸۴ء، ص ۴۷۵

۱۴۔ پنجاب پبلک لائبریری کو موضوع بنانے والے تقریباً تمام مضمون نگاروں نے جان لاک وڈ کپلنگ کو لائبریری کی اولین کمیٹی کا رکن بیان کیا ہے، حالانکہ جان لاک وڈ کپلنگ لائبریری کی پہلی کمیٹی، جو ۸/نومبر ۱۸۸۴ء کو تشکیل دی گئی تھی، میں شامل نہیں تھے۔ اولین کمیٹی میں کرنل ولیس، جے ایمسن، ایس ویلر، پنڈت رام نرائن، سیکرٹری حکومت پنجاب اور ای۔ ڈبلیو پارکر شامل تھے۔ یاد رہے کہ سیکرٹری حکومت پنجاب ساری انتظامیہ کا سربراہ ہوتا تھا، ۱۸۹۰ء میں اسی عہدے کو چیف سیکرٹری کا نام دیا گیا۔

۱۵۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، لاہور، ۲۸/جولائی ۱۸۸۷ء، ص ۸۷۱

۱۶۔ محکمہ داخلہ، حکومت پنجاب، بی۔ فائل نمبر ۲۸۔ ۱۲۷، اگست ۱۸۸۵ء

۱۷۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، لاہور، ۲۲/اکتوبر ۱۸۸۵ء، ص ۱۰۹۴

۱۸۔ محکمہ داخلہ، حکومت پنجاب، بی۔ فائل نمبر ۸۔ ۱۲۷، اگست ۱۸۸۵ء

۱۹۔ (i) محکمہ داخلہ (جنرل)، پنجاب گورنمنٹ، اے پروسیڈنگ نمبر ۳، دسمبر ۱۸۷۸ء

(ii) محکمہ داخلہ (جنرل)، پنجاب گورنمنٹ، اے پروسیڈنگ نمبر ۱۶، جنوری ۱۸۷۹ء

۲۰۔ (i) محکمہ داخلہ، حکومت پنجاب، اے۔ پروسیڈنگ نمبر ۸، دسمبر ۱۸۷۸ء

(ii) محکمہ داخلہ، حکومت پنجاب، اے۔ پروسیڈنگ نمبر ۱۶، جنوری ۱۸۷۹ء

۲۱۔ محکمہ داخلہ (جنرل)، حکومت پنجاب، بی فائل نمبر ۲۲۔ ۵۱۹، مئی ۱۸۸۵ء

۲۲۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، لاہور، ۱۴/مئی ۱۸۸۵ء، ص ۵۳۹

۲۳۔ محکمہ داخلہ (جنرل)، حکومت پنجاب، بی فائل نمبر ۲۲۔ ۵۱۹، مئی ۱۸۸۵ء

۲۴۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، لاہور، ۲۶/نومبر ۱۸۸۵ء، ص ۱۲۶۸

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، لاہور، ۲۶/نومبر ۱۸۸۵ء، ص ۱۲۶۸

۲۷۔ محکمہ داخلہ (جنرل)، پنجاب گورنمنٹ، بی۔ فائل نمبر ۸۔ ۱۲۷، اگست ۱۸۸۵ء

۲۸۔ ایضاً، بی فائل نمبر ۳۔ ۲۱۲، دسمبر ۱۸۸۵ء

۲۹۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، لاہور، ۱۷/دسمبر ۱۸۸۵ء، ص ۱۳۵۹

۳۰۔ (i) محکمہ داخلہ (جنرل)، پنجاب گورنمنٹ، بی فائل نمبر ۶۔ ۴۳۵، اکتوبر ۱۸۸۵ء

(ii) تھامسن ولیم جو پرٹولبرٹ کا بنگال سول سروس سے تعلق تھا۔ وہ انبالہ میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۸۳ء میں انگلینڈ میں ہوا۔ انہوں نے اپنی وصیت میں اپنا ذاتی کتب خانہ پنجاب گورنمنٹ کو دینے کی خواہش کی تھی۔ ۱۸۸۵ء میں حکومت پنجاب نے ان کے کتب خانے کا کچھ حصہ پبلک لائبریری کو منتقل کر دیا۔

۳۱۔ محکمہ داخلہ (جنرل)، حکومت پنجاب، بی فائل نمبر ۳۔ ۱۶۲، دسمبر ۱۸۸۵ء

۳۲۔ محکمہ داخلہ (جنرل)، حکومت پنجاب، بی فائل نمبر ۱۴۹، مئی ۱۸۸۵ء

۳۳۔ ایضاً، بی فائل نمبر ۳۔ ۲۱۲، نومبر ۱۸۸۵ء

۳۴۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، لاہور، ۲۲/اکتوبر ۱۸۸۵ء، ص ۱۰۹۴

۳۵۔ ایضاً، ۱۸/نومبر ۱۸۸۶ء، ص ۱۲۸۷

۳۶۔ ایضاً، ۲۸/جولائی ۱۸۸۷ء، ص ۸۷۱

۳۷۔ ایضاً، ۷/دسمبر ۱۸۸۵ء، ص ۱۳۵۸

۳۸۔ ایضاً، ۲۸/جولائی ۱۸۸۷ء، ص ۸۷۱

۳۹۔ ایضاً، ۱۷/فروری ۱۸۸۷ء، ص ۱۶۰

۴۰۔ ایضاً، ۷/اپریل ۱۸۸۷ء، ص ۴۲۲

۴۱۔ ایضاً

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ محکمہ داخلہ (جنرل)، حکومت پنجاب، بی۔ پروسیڈنگ نمبر ۲۔ ۱۶۱، جون ۱۸۸۶ء

۴۴۔ چوبرجی بارہ دری وزیر خاں کی بالائی منزل کے چار کمروں کی مرمت وغیرہ پر کل ۲۳۰۰ روپے خرچ ہوئے۔

۴۵۔ محکمہ داخلہ (جنرل)، حکومت پنجاب، بی۔ پروسیڈنگ نمبر ۲۔ ۱۶۱، جون ۱۸۸۶ء

۴۶۔ محکمہ داخلہ (جنرل)، حکومت پنجاب، بی۔ پروسیڈنگ نمبر ۷۔ ۱۱۵، ستمبر ۱۸۸۶ء

۴۷۔ (i) محکمہ داخلہ (جنرل)، حکومت پنجاب، بی۔ پروسیڈنگ نمبر ۷۔ ۱۱۵، ستمبر ۱۸۸۶ء

(ii) عرفان چغتائی اپنے مضمون بعنوان پنجاب پبلک لائبریری، جو رسالہ الزبیر، بہاول پور (کتب خانہ نمبر) سہ ماہی، (۱۱)، ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا (صفحہ ۶۲۰) میں لکھتے ہیں کہ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی کوششوں سے سردار عطر سنگھ کا ذاتی کتب خانہ لائبریری میں لایا گیا۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ سردار عطر سنگھ آف بھدوڑ نے از خود ڈپٹی کمشنر لدھیانہ کو چٹھی لکھی تھی کہ ان کی وفات کے بعد چند شرائط کے تحت ان کا ذاتی کتب خانہ پنجاب پبلک لائبریری کو دے دیا جائے۔ ڈپٹی کمشنر لدھیانہ نے یہ چٹھی کمشنر جالندھر ڈویژن کو بھیجی۔ جنہوں نے اس کو سیکرٹری حکومت پنجاب کو بھجوایا اور آخر کار یہ چٹھی حکومت پنجاب نے سیکرٹری پبلک لائبریری کو بھجوا دی، جسے لائبریری کمیٹی نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

۴۸۔ انڈین ایجوکیشن کمیشن (رپورٹ آف دی پنجاب پراونشل کمیٹی)، کلکتہ، سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ پریس، ۱۸۸۴ء، ص ۵۳

۴۹۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، لاہور، ۷/اپریل ۱۸۸۷ء، ص ۴۲۳

۵۰۔ ایضاً، ۲۲/جولائی ۱۸۸۶ء، ص ۸۴۳

۵۱۔ لائبریری کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۱۴/مارچ ۱۸۷۷ء میں ایگزیکٹو کمیٹی کو ہدایت کی گئی کہ وہ پنجاب کے اہم شہروں میں برانچ لائبریریوں کے لیے قواعد و ضوابط تیار کرے۔

۵۲۔ پنجاب گورنمنٹ گزٹ، لاہور، ۱۷فروری ۱۸۸۷ء، ص ۱۶۰

۵۳۔ ایضاً

۵۴۔ ایضاً

۵۵۔ ایضاً، ۷/اپریل ۱۸۸۷ء، ص ۴۲۳

۵۶۔ ایضاً، ص ۴۲۴

۵۷۔ پنجاب پبلک لائبریری (مضمون) از عرفان چغتائی، الزبیر، سہ ماہی، بہاول پور، شمارہ نمبر ۱۱، ۱۹۶۷ء، کتب خانہ نمبر، ص ۶۲۳

۵۸۔ لائبریرین/چیف لائبریرین کا تختہ اسمائے فہرست، آویزاں چیف لائبریرین آفس، پنجاب پبلک لائبریری لاہور

۵۹۔ سالانہ رپورٹ برائے سال ۲۰۰۲ء، پنجاب پبلک لائبریری لاہور (غیر مطبوعہ)، ص ۵

۶۰۔ ایضاً، ص ۶

قائداعظم لائبریری کی علمی وادبی سرگرمیاں

محمد ہارون عثمانی

۲۱ جولائی ۲۰۰۳ء

Seminar: Toni Morrison

Perspective on some of her works
(Jazz & The Bluest Eye)

Presided by: Prof. Dr. Nasim Riaz Butt, Ex Chairman English Dept. University of the Punjab, Lahore

Speakers:
1. Prof. Dr. Waseem Anwar
Chairperson, English Dept. Govt. College University Lahore.
2. Ms. Saira Fatima Doger
Lecturer, English Dept. Govt. College University Lahore.

Moderator: Ms. Ayesha Sajjad Khawaja
Lecturer, English Dept. Govt. College University, Lahore.

۱۳۔اگست ۲۰۰۳ء

تحریک پاکستان۔ چند یادیں

صدارت: ڈاکٹر صفدر محمود **یادیں:** ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید یزدانی

میزبان: محمد تاج

۲۸۔اگست ۲۰۰۳ء

سیمینار: ادب کے فروغ میں اردو رسائل کا کردار

صدارت: جناب عنایت اللہ، صدر مجلس ادارت، مجلہ مخزن لاہور **مہمان خصوصی:** ڈاکٹر وزیر آغا، مدیر ماہنامہ اوراق لاہور

مقررین: ۱۔ڈاکٹر سلیم اختر، وزنگ پروفیسر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

۲۔جناب اظہر جاوید، مدیر ماہنامہ تخلیق، لاہور

۳۔ڈاکٹر یونس جاوید، مدیر سہ ماہی صحیفہ لاہور

۴۔ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، مدیر ماہنامہ شام وسحر لاہور

۵۔ڈاکٹر عفیر وحامد، شعبہ ابلاغیات، جامعہ پنجاب لاہور

۶۔جناب شاہد شیدائی، مدیر کاغذی پیرہن، لاہور

میزبان: محمد ہارون عثمانی

۲۹۔۳۰/اگست ۲۰۰۳ء

Workshop on Conducting Survey Research

Conducted by: Prof. Dr. Mumtaz Anwar
Dept. of Lib. & Information Science, Kuwait University, Kuwait

Collaboration: LIMA

۷ستمبر ۲۰۰۳ء

عالمی یوم خواندگی

مہمان خصوصی: میاں عامر محمود، ڈسٹرکٹ ناظم لاہور

مقررین: ۱۔عنایت اللہ، چیئرمین پاکیڈ، لاہور ۲۔محمد تاج، چیف لائبریرین، قائداعظم لائبریری لاہور
۳۔کرنل اکرام اللہ

تعاون: ۱۔پاکیڈ لاہور ۲۔سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ لاہور

میزبان: محمد ہارون عثمانی

۱۴/اکتوبر ۲۰۰۳ء

تعزیتی ریفرنس برائے جناب خالد مسعود مرحوم

صدارت: جاوید احمد غامدی

تاثرات: مجیب الرحمٰن شامی، احسن اقبال، عطاالرحمٰن، احسان اللہ وقاص، صاحبزادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی، ماجد خاور، مولانا نور الٰہی ادیب، پروفیسر عبدالخالق فاروقی، ڈاکٹر ام کلثوم، محمد تاج

میزبان: محمد ہارون عثمانی **تعاون:** دارالتذکیر، لاہور

۱۶/اکتوبر ۲۰۰۳ء

Seminar: Librarianship in Europe

Presided by: Mr. M.D.Choudhry, Sec. B.O.G. Quaid-e-Azam Library Lahore.
Chief Guest: Mr. Josef Bornhorst, Director Goethe Institute, Karachi.
Speakers: Mr. Muhammad Ajmal Khan, Mr. Khalid Mahmood and Ms. Kanwal Ameen
Moderator: Muhammad Haroon Usmani

۱۰/دسمبر ۲۰۰۳ء

حقوق انسانی کا عالمی دن

صدارت: جناب عنایت اللہ، صدر پاکیڈ

مقررین: جناب ہارون چوہدری، جناب ڈیوڈ دیوان مسیح، جناب محمد تاج اور جناب نصیر اے چوہدری

میزبان: محمد ہارون عثمانی

قائداعظم لائبریری میں آنے والی نئی اردو کتب

ضیاءالدین فاروقی

۱۔ غالب کی بعض تصانیف / کالی داس گپتا رضا، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۲

۲۔ تاریخ انجمن۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے بعد / شہزاد منظر، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۲

۳۔ آبدوز (غزلیں) / افتخار نسیم، لاہور: ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، ۲۰۰۳ء

۴۔ شبری (افسانے) / افتخار نسیم، لاہور، ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، ۲۰۰۳ء

۵۔ عمر خیام کے دیس میں / بلقیس ریاض، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۳

۶۔ سخن ہائے آشنا (مجموعہ مضامین) / عبدالعزیز خالد، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۳

۷۔ افسانوی ادب / ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۳

۸۔ عجائبات فرنگ (سفرنامہ) / علی سفیان آفاقی، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۳

۹۔ نظریہ پاکستان / سید واجد رضوی، لاہور: مقبول اکیڈمی، ۲۰۰۳

۱۰۔ الفرقان اول جز / شیخ عمر فاروق، لاہور: جامع تدبر القرآن، ۲۰۰۲ء، ص ۴۹۴

۱۱۔ عالمی طاغوتی کھیل میں مکر و فریب کا راج / طارق مجید، لاہور: گلوبل گیم ایکسپوزر سنٹر، ۲۰۰۲، ص ۱۵۲

۱۲۔ سفر سادات و سادات ضلع گجرات / پروفیسر حامد حسن سید، گجرات، المیر ٹرسٹ لائبریری، ۲۰۰۲، ص ۳۱۲

۱۳۔ تاریخ جلال پور جٹاں / عارف علی میر، گجرات: المیر ٹرسٹ لائبریری، ۲۰۰۲، ص ۶۹۰

۱۴۔ وارث میر کا عہد / مرتب فرح سہیل گوئندی، لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۰۲، ص ۲۰۶

۱۵۔ پہنچے تیرے حضور: سفرنامہ حجاز / شوکت علی شاہ، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۲ء، ص ۲۷۲

۱۶۔ حب رحمۃ اللعالمینؐ / محمد ضیاءاللہ خان نیازی، لاہور: ضیاءالقرآن پبلی کیشنز، ۲۰۰۲، ص ۳۸۰

۱۷۔ سید قدرت نقوی بطور غالب شناس / لاہور: اورنگ زیب نیازی، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۳، ص ۱۴۳

۱۸۔ جذب و جنون / ناصر کاسگنجوری، کراچی: ایوان غزل، ۲۰۰۳، ص ۱۹۲

۱۹۔ علامہ اقبال اور مسیحی مشاہیر (جلد اول) / منصور گل اور ریاض طاہر، لاہور: فل گاسپل اسمبلیز آف پاکستان، ۲۰۰۲، ص ۲۷۹

۲۰۔ ناتمام کائنات / نیاز احمد صوفی، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۳، ص ۱۵۶

۲۱۔ شرک بحوالہ قرآن / شہزاد احمد، لاہور: عالمگیر پبلیکیشنز، ۲۰۰۳، ص ۱۲۸

۲۲۔ اردو افسانے کی روایات / ڈاکٹر سہیل بخاری، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۲، ص ۱۱۲

۲۳۔ مزید ادبی جائزے / ڈاکٹر انور سدید، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۳، ص ۳۲۰

۲۴۔ خطبات اقبالیات / ڈاکٹر انوار احمد، ملتان: بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ۲۰۰۳، ص ۲۰۷

۲۵۔ مرتضیٰ احمد خاں میکش کی ادبی خدمات / ڈاکٹر محمد صالح طاہر، لاہور: الحق پبلشرز، ۲۰۰۱، ص ۴۱۵

۲۶۔ کھٹی میٹھی باتیں (طنز و مزاح) / ڈاکٹر محمد صالح طاہر، لاہور: شریف سنز، ۲۰۰۱، ص ۱۷۰

۲۷۔ مضامین طاہر / ڈاکٹر محمد صالح طاہر، لاہور: ولایت سنز، ۲۰۰۱، ص ۱۴۰

۲۸۔ کچھ وقت کتابوں کے ساتھ / ڈاکٹر انور سدید، لاہور: پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۱، ص ۳۶۶

۲۹۔ غیر رسمی تعلیم / محمد رشید، پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱، ص ۳۳۰

۳۰۔ فاصلاتی تعلیم میں غیر نشریاتی ابلاغ / محمد رشید، پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱، ص ۳۱۵

۳۱۔ تعلیمی تحقیق / محمد رشید، پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱، ص ۳۸۴

۳۲۔ تعلیم بالغاں / محمد رشید، پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱، ص ۶۹۳

۳۳۔ تعلیمی رہنمائی و مشاورت / محمد رشید، پاکستان نیشنل فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱، ص ۴۱۸

۳۴۔ تدریسی حکمت عملیاں / محمد رشید، پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱، ص ۲۷۴

۳۵۔ کمپیوٹر آسان زبان میں / محمد رشید، پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱، ص ۱۴۸

۳۶۔ تعلیمی نفسیات / محمد رشید، پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۰۱، ص ۲۴۷

۳۷۔ نامور ادیبوں کی نایاب کہانیاں اور ڈرامے / شفیع عقیل، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۰۱ء، ص ۴۱۰

۳۸۔ ایرانی کہانیاں / مسعود، کراچی: علمی گرافکس، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۷

۳۹۔ ای میل اور دوسری نظمیں / ذی شان ساحل، کراچی: علمی گرافکس، ۲۰۰۲ء، ص ۴۰۲

۴۰۔ آئینہ حیرت اور دوسری تحریریں / سید رفیق حسین، کراچی: سٹی پریس، ۲۰۰۱، ص ۴۰۳

۴۱۔ شب نامہ اور دوسری نظمیں / ذی شان ساحل، کراچی: سٹی پریس، ۲۰۰۲، ص ۱۲۰

۴۲۔ اس نظم میں / میر اجی، کراچی: علمی گرافکس، ۲۰۰۲ء، ص ۱۵۷

۴۳۔ معاصر اردو ادب (نثری مطالعات) / ڈاکٹر تحسین فراقی، لاہور: کلیہ علوم اسلامیہ شرقیہ، ۲۰۰۲، ص ۲۴۸

۴۴۔ ذکر فراہی / ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۲، ص ۹۶۸

۴۵۔ دینی مدارس۔ نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے / مرتبہ حقانی میاں قادری، کراچی: فضلی سنز، ۲۰۰۲، ص ۲۷۲

۴۶۔ الامین / محمد رفیق ڈوگر، لاہور: شرکت پرنٹنگ پریس ۲۰۰۲ء ص ۶۰۰

۴۷۔ اردو شاعری کے ٹاپ ۱۰ کلاسک شاعر / معاذ حسن، لاہور: حیدر پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء

۴۸۔ دیوان غالب نسخہ خواجہ اصل حقائق / ڈاکٹر تحسین فراقی، لاہور: سورج پبلشنگ بیورو، ۲۰۰۲ء ص ۳۳۶

۴۹۔ مجالس اقبال / جعفر بلوچ، لاہور: دارالتذکیر، ۲۰۰۲ء ص ۲۱۵

۵۰۔ اشاریہ تفہیم القرآن / ڈاکٹر خالد علوی، لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ص ۱۲۸

۵۱۔ اردو ڈرامہ / پروفیسر سید وقار عظیم، لاہور: الوقار پبلشرز، ۲۰۰۳ء ص ۳۹۷

۵۲۔ تنہا تنہا گزری ہے / مظفر وارثی، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۲ء ص ۲۱۴

۵۳۔ زنجیر بہاراں، احسان دانش، لاہور: خزینہ علم و ادب ۲۰۰۳ء ص ۱۷۶

۵۴۔ یورپ مسلمانوں کی نظر میں / برنارڈ لیوس، مترجمہ مسعود اشعر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء ص ۳۳۸

۵۵۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ / ڈاکٹر سلیم اختر، لاہور: سنگ میل، ۲۰۰۲ء ص ۷۱۷

۵۶۔ چتر لیکھا / بھگوتی چرن ورما مترجمہ سوم آنند، لاہور: پیپلز پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۲ء ص ۲۰۷

۵۷۔ فیملی فرنٹ / ڈاکٹر محمد یونس بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء ص ۲۲۸

۵۸۔ عراپچی سو گیا ہے / نصیر احمد ناصر، لاہور: تسطیر پبلشرز، ۲۰۰۲ء ص ۱۵۲

۵۹۔ چترال داستان / مستنصر حسین تارڑ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء ص ۲۵۶

۶۰۔ اک جہاں سب سے الگ (سفرنامہ) / ڈاکٹر سلیم اختر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء ص ۲۷۲

۶۱۔ جہان دگر / احسان دانش، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۱ء ص ۸۷۱

۶۲۔ عذاب دید / محسن نقوی، لاہور: ماورا پبلشرز، ۲۰۰۳ء ص ۲۰۸

۶۳۔ اقبالیات چندنئی جہات / ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۱ء ص ۱۲۸

۶۴۔ یادوں کے دیے / محمد حمزہ فاروقی، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۱ء، ص ۱۴۸

۶۵۔ فکر اقبال کے دو بنیادی تصورات۔ خودی اور آخرت / مظفر حسین، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۱ء ص ۲۰۸

۶۶۔ چھاؤں / امجد اسلام امجد، لاہور: دعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء ص ۳۰۰

۶۷۔ آخری تریں / ڈاکٹر فردوس انور قاضی، لاہور: ابلاغ پبلشرز، ۲۰۰۱ء ص ۳۲۴

۶۸۔ طلوع اشک / محسن نقوی، لاہور: ماورا پبلشرز، ۲۰۰۱ء، ص ۲۰۸

mi qal-4

چھٹے شمارے کے قلمی معاونین

۱۔ پروفیسر محسن احسان،
3-85/G فیز II حیات آباد پشاور

۲۔ محیط اسماعیل،
معرفت اردو مرکز، گنپت روڈ لاہور

۳۔ افضل حق قرشی،
شعبہ لائبریری و انفارمیشن سائنس، پنجاب یونیورسٹی لاہور

۴۔ ادیب سہیل،
E-9، ارم ولاز، بزد وی سی (ایسٹ) آفس بلاک 14
گلشن اقبال کراچی

۵۔ مشکور حسین یاد،
8 ظفر کالونی ندیم شہید روڈ، سمن آباد لاہور

۶۔ محمد حنیف شاہد،
170 جہاں زیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

۷۔ ڈاکٹر روبینہ ترین،
چیئرپرسن شعبہ اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

۸۔ ڈاکٹر اختر شمار،
صدر شعبہ اردو، ایف سی کالج، فیروز پور روڈ لاہور

۹۔ ڈاکٹر سلیم اختر،
الجودت C-569 گلی نمبر 17 جہاں زیب بلاک،
علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

۱۰۔ ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی،
یزدانی سٹریٹ ملت روڈ، سمن آباد لاہور

۱۱۔ محمد سعید،
استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

۱۲۔ محمد نعیم،
چیف لائبریرین، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

۱۳۔ محمد ایوب، (متعلم پی ایچ ڈی اردو)،
کمرہ نمبر 96 خالد بن ولید ہال، پنجاب یونیورسٹی لاہور

۱۴۔ صابر آفاقی،
پوسٹ بکس نمبر ۹ مظفر آباد، آزاد کشمیر

۱۵۔ ڈاکٹر انور محمود خالد،
24-W-ع مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

۱۶۔ عرفان احمد خان،
E/101-S-31 بنک کالونی سمن آباد لاہور

۱۷۔ ڈاکٹر وحید قریشی،
E-215۔ ای ایم ای سوسائٹی، ڈاکخانہ ٹھوکر نیاز بیگ،
ملتان روڈ لاہور

۱۸۔ عباس چغتائی،
ڈپٹی ڈائریکٹر (ایڈمن اینڈ ریسرچ) آرکائیوز،
ایس اینڈ جی اے ڈی، حکومت پنجاب سول سیکرٹریٹ لاہور

۱۹۔ محمد ہارون عثمانی،
لائبریرین، قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور

۲۰۔ ضیاء الدین فاروقی،
لائبریرین، قائداعظم لائبریری باغ جناح لاہور